مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں

مرتّب

حسن چشتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں

(مضامین، سفرنامے اور کالموں کا انتخاب)

(جلد اوّل)

○

مرتّب

حسن چشتی

مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں

(مضامین، سفرنامے اور کالموں کا انتخاب)

(جلد اوّل)

مرتّب

حسن چشتی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

MUJTABA HUSSAIN

KI

BEHTREEN TEHREEREIN (VOL. 1)

AUTHOR

MUJTABA HUSSAIN

EDITED BY

HASAN CHISHTI

YEAR OF Ist EDITION 2001

ISBN 81-87667-21-4

PRICE RS. 250/-

نام کتاب .... مجتبیٰ حسین کی بہترین تحریریں

مُصنّف .... مجتبیٰ حسین

مرتّب .... حسن چشتی

سنِ اشاعتِ اوّل ۲۰۰۱ء

قیمت .... ۲۵۰ روپے

کمپوزنگ .... خالدہ تبسّم

مطبع .... کاک آفسیٹ پرنٹرس، دہلی۔

Published by

Educational Publishing House

3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Ph.: 3216162, 3214465 Fax: 91-011-3211540
E-mail:eph@onebox.com

انتساب

مجتبیٰ حسین

کے بڑے بھائیوں

محبوب حسین جگر مرحوم

اور

ابراہیم جلیس مرحوم

کے نام

فہرستِ مضامین

☆☆☆

کچھ اس انتخاب کے بارے میں

اُردو زبان کی عمر ہی کتنی ہے! بہ قولِ کسے ''گے آمدی وگے پیر شدی۔'' بول چال میں تو یہ کوئی سات سو برس پہلے سے تتلا کر، ہکلا کر آوازیں نکالتی رہی تھی، پھر اس میں قانون فطرت کے برخلاف ادبی اظہار کی ابتداء شاعری سے ہوئی اور باقاعدہ نثر نگاری کی نوبت کہیں اُنیسویں صدی کے آغاز سے آئی۔ اُس میں بھی طنز ومزاح کی کوئی پُٹ نہیں تھی۔ اس کے کچھ منظوم نمونے ہمیں ہجویات میں یا شہر آشوب میں ملتے تھے۔ نثر میں طنز ومزاح کے کچھ متفرق نمونے مرزا غالب کے خطوط ہی میں تلاش کیے جا سکتے ہیں، مگر وہ صرف نمونے ہیں، اُنہیں مزاح نگاری کی باقاعدہ صنف میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اس کو اصنافِ نثر میں شامل کرنے کا سہرا رتن ناتھ سرشار جیسے نثر نگاروں کے سر بندھتا ہے یا پھر ''اودھ پنچ'' اور اس قبیل کے اخباروں کا جو ایک سیلاب سا آ گیا تھا اس نے طنز ومزاح کو باقاعدہ صنف بنا دیا۔ اودھ پنچ کے اثرات خاموشی سے بہت دُور تک پہنچے اور پچھلی صدی کی پہلی چوتھائی میں ہی مزاح نگاروں کی پوری ایک صف تیار ہو گئی۔ اس کے بعد تو رشید احمد صدیقی، پطرس بخاری، شفیق الرحمٰن، شوکت تھانوی، ملا رموزی، حاجی لق لق، کنہیا لال کپور، ابراہیم جلیس، احمد جمال پاشا، فکر تونسوی سے لے کر پاکستان میں کرنل محمد خان، ابن انشا، عطاء الحق قاسمی، اور ہندوستان میں یوسف ناظم، بھارت چند کھنہ، خواجہ عبدالغفور، رشید قریشی، نریندر لوتھر، اور نہ جانے کتنے ہی نام سامنے آتے ہیں جنہوں نے اُردو میں اس صنف کی کم سنی کے باوجود اسے وقار واعتبار بخشا اور اس کے ادبی خزانے کو سرمائے سے مالا مال کر دیا۔ ان سب لکھنے والوں کا اپنا منفرد اسلوب اور اپنی دلچسپی

کے موضوعات رہے ہیں مگر مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجیے کہ مشتاق احمد یوسفی نے طنز و مزاح کو اسلوب کی شستگی اور شائستگی، آرائش و زیبائش کے ساتھ اس حد تک بامِ عروج پر پہنچا دیا ہے کہ اب ہم اُردو مزاح کو دُنیا کی کسی بھی بڑی زبان کے سامنے کسی شرمندگی یا معذرت کے بغیر رکھ سکتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں مزاح نگاری کا دوسرا بڑا نام مجتبیٰ حسین کا ہے جنہوں نے اخبار ''سیاست'' کی کالم نگاری سے مزاح نگاری کا آغاز کیا تھا اور آج کی تاریخ تک ان کا لکھا ہوا مزاحیہ کالم نہ صرف اخبار ''سیاست'' کے لاکھوں قاری ہر ہفتے ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں بلکہ وہ کالم ہندوستان و پاکستان کے بہت سے دوسرے ادبی اخباروں اور رسالوں میں نقل بھی ہوتا ہے اور انٹرنیٹ پر بھی دیکھا جاتا ہے۔ وہ صرف کالم نگار ہی نہیں ہیں بہترین انشا پرداز اور اعلیٰ درجے کے خاکہ نگار بھی ہیں۔ اب تک ان کے ایک درجن سے زائد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں ''تکلف برطرف''، ''قطع کلام''، ''قصہ مختصر''، ''بہر حال''، ''الغرض''، ''بالآخر''، ''آخرکار''، مزاحیہ مضامین اور انشائیوں کے مجموعے ہیں تو ''جاپان چلو، جاپان چلو'' اور ''سفرِ لخت لخت'' ان کے لکھے ہوئے دل چسپ سفرنامے ہیں، ''میرا کالم'' میں اُن کی کالم نگاری کا انتخاب ہے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بہت ہی دلچسپ، معنی خیز اور پردہ کشا قسم کے خاکے بھی لکھے ہیں جو اپنی نوعیت اور ادبی قدر و قیمت میں دوسرے بہت سے خاکوں سے مختلف اور ممتاز ہیں۔ اُن کے لکھے ہوئے شخصی خاکوں کے مجموعوں میں ''آدمی نامہ''، ''سو ہے وہ بھی آدمی''، ''چہرہ در چہرہ'' اور ''ہوئے ہم دوست جس کے'' شامل ہیں۔ اتنا کچھ کتابی صورت میں آجانے کے بعد ابھی بہت سا سرمایہ ان کی گرہ میں باقی ہے جو بہ قول شاعر ''وہ الگ باندھ کے رکھا ہے جو مال اچھا ہے''۔ لیکن یہ مال بھی اُن کی گرہ سے نکالا جائے گا۔ اس وقت تو ہمیں یہ خیال آیا کہ مجتبیٰ حسین کے چاہنے والے انہیں پڑھنا چاہتے ہیں اور بار بار پڑھنا چاہتے ہیں مگر پندرہ سولہ کتابوں کا ایک ساتھ جمع کرنا ہر ایک کے لیے آسان نہیں اس لیے ان سب کتابوں سے ایک انتخاب تیار کر دیا جائے۔

میں نے مجتبیٰ حسین کی تحریروں کو دو جلدوں میں مرتب کیا ہے۔ پہلی جلد اُن کے مزاحیہ مضامین، سفرناموں اور کالموں پر مشتمل ہے اور دوسری جلد میں اُن کے لکھے ہوئے شخصی خاکے شامل ہوں گے۔ کچھ عرصہ پہلے اُن کے کالموں کا انتخاب ''میرا کالم'' کے نام سے

حیدرآباد سے شائع ہو چکا ہے اس لیے زیرِ نظر انتخاب میں اُن کے صرف چند کالم ہی نمونے کے طور پر شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ حیدرآباد کے روزنامہ ''سیاست'' کے کالم نگار شاہد صدیقی مرحوم کے انتقال کے فوراً بعد مجتبیٰ حسین نے ۱۲/اگست ۱۹۶۲ء کو دن میں ٹھیک ساڑھے دس بجے مزاحیہ کالم نگاری شروع کی تھی اور پندرہ برس تک اس اخبار کا روزانہ کالم لکھتے رہے۔ بعد میں یہ سلسلہ موقوف ہو گیا۔ تاہم پندرہ اگست ۱۹۹۳ء سے انھوں نے ''سیاست'' کے لیے دوبارہ ہفتہ وار کالم لکھنا شروع کیا جس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس طرح چند مہینے بیت جائیں گے تو مجتبیٰ حسین کی کالم نگاری اور مزاح نگاری کی عمر چالیس برس ہو جائے گی۔

مجتبیٰ کی ہر تحریر منتخب ہوتی ہے اس لیے جو مضامین ان دو جلدوں میں آنہیں سکے ہیں انہیں کم رتبہ یا غیر معیاری نہ سمجھا جائے۔ مقصود یہ تھا کہ اُن کی کچھ نمایندہ تحریریں یک جا ہو جائیں جن سے اُن کے مدّاح لطف اندوز ہو سکیں۔ مجتبیٰ حسین کے مزاحیہ اسلوب کی چند نمایاں خصوصیات ہیں: پہلی بات تو یہ کہ اُن کی کسی تحریر میں نہ پھکڑ پن آتا ہے نہ کوئی ایسا انداز ہوتا ہے جس سے کسی کی دلآزاری ہو۔ طنز و مزاح لکھتے ہوئے اس سے دامن بچا کر عہدہ براہونا تلوار کی دھار پر چلنے سے زیادہ نازک کام ہے۔ دوسری خوبی اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ زمین سے جڑے رہتے ہیں۔ ہمیں خیالی دنیا کی سیر نہیں کراتے۔ زندگی کے مسائل اور حقائق سے اپنے پڑھنے والے کو روشناس بھی کراتے ہیں اور اُن کے قریب تر بھی لاتے ہیں۔ تیسری خوبی یہ کہ ان کے اسلوب نگارش میں شاذ و نادر ہی آورد کا یا بہ تکلف لکھنے کا احساس ہوتا ہے حالانکہ ایک اخبار کے کالم نگار کے لیے ہمہ وقت تازہ دم رہنا ضروری نہیں۔ کبھی کبھی محض خانہ پری کے لیے بھی لکھنا پڑتا ہے۔ یہ تازگی اور شادابی اُن کے پڑھنے والوں کو ہمیشہ اُن کی تحریروں میں نظر آتی ہے۔ چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو دہراتے نہیں۔ ہر بار نیا موضوع لے کر اور تازہ دم ہو کر سامنے آتے ہیں ورنہ اتنی کثرت سے لکھنے والے تکرار کا شکار ہونے سے بچ نہیں سکتے۔ پانچویں خوبی یہ کہ اُن کی تحریریں اور خاکے اُردو انشائیے کا بھی بہترین نمونہ ہیں۔ مجتبیٰ لکھتے وقت ''آدمی'' بنے رہتے ہیں، بقراط بن کر نہیں لکھتے ورنہ بہت سے نثر نگاروں کو دیکھا گیا ہے کہ وہ قلم ہاتھ میں پکڑتے ہی بقراط بن جاتے

ہیں۔اس سے لکھنے والے اور پڑھنے والے کے درمیان براہِ راست رشتہ قائم نہیں ہو پاتا۔ ایک مزاح نگار اسی وقت قبولیت عامہ حاصل کرسکتا ہے جب وہ اپنے قاری کے ساتھ ہمزاد بن کر رہ جائے۔چھٹی خصوصیت وہ ہے جس کا احساس وہی کرسکتا ہے جسے اللہ توفیق دے یا وہ فکرواحساس کی ان وادیوں سے خود گذر چکا ہو جن سے لکھنے والا سینے کے بل چل کر گذر جاتا ہے۔یہ نکتہ بھی ہر ایک کی سمجھ میں نہیں آسکتا کہ مجتبیٰ کے مزاح میں غم کی ایک تہہ نشیں لہر بھی رہتی ہے۔وہ ایک ایسا کرب ہے جس پر وہ مزاح کے پردے ڈال کرا سے نااہلوں کی نظر لگنے سے بچالیتے ہیں۔

پنڈت آنند نرائن ملا نے کہا تھا:

اک ہنسی تو وہ جو ہے اشکوں سے وقتی سا فرار　　اک ہنسی ہے انتہائے غم پہ آجانے کا نام

مجتبیٰ حسین کی ہنسی بھی اسی قبیل کی ہے۔وہ انسان کے دکھ درد کو محسوس کرتے ہیں اور انسانیت کا خوار وزبوں ہونا انہیں ذہنی کرب میں مبتلا کرتا ہے تو مزاح کے پردے میں اپنا منہ چھپالیتے ہیں۔مگر تاڑنے والے تاڑ لیتے ہیں، بہ قول شاد عارفی:

زرد چہروں کو تبسم نے کیا ہے رُسوا　　ورنہ ظاہر بھی نہ ہوتا کہ پریشاں ہے کوئی

عمر کا وہ حصہ جسے ''مُرادوں کے دن'' کہا گیا ہے، اور جب انسان کا ذہن ہر کیفیت اور تأثر کو اتنی گہرائی سے قبول کرتا ہے کہ اس سے آخر وقت تک دامن کش نہیں ہوسکتا، اس زمانے میں انہوں نے سقوط حیدرآباد کے المناک مناظر بھی دیکھے اور اُن کے خاندان کے کئی افراد اس داروگیر کی زد میں بھی آئے۔تقسیمِ ملک کے بھیانک اثرات نے اگر اُن کے بھائی ابراہیم جلیس مرحوم سے ''دو ملک ایک کہانی'' اور ''چالیس کروڑ بھکاری'' جیسی کتابیں لکھوائیں جو ''انگلیاں فگار اپنی، خامہ خوں چکاں اپنا'' والی کیفیت ہی میں لکھی جاسکتی تھیں، تو اُن کے برادر بزرگ جناب محبوب حسین جگر مرحوم نے صحافت کے پلیٹ فارم کو اختیار کیا تاکہ وہ نئے حالات میں نیا سیاسی اور سماجی شعور جگا سکیں، مجتبیٰ نے اس دکھ درد کے زہر کو مزاح سے شکر آلود کردیا۔مقصد تینوں بھائیوں کا ایک ہی تھا۔بس فرق وہی تھا جو ایلو پیتھی، طبِّ یونانی اور ہومیو پیتھی میں ہے کہ مقصد ایک ہے تدبیریں مختلف ہیں۔مجتبیٰ حسین کے قلم کی یہ تراوش محض وقتی تفریح اور ہوحق کا سامان نہیں ہے۔یہ اُردو انشائیہ، اُردو خاکہ نگاری، صحافتی ادب اور

کالم نگاری کے علاوہ فصیح و سلیس شگفتہ و دل نشیں، بے تکلف اور اثر آفریں نثر کے ایسے نمونے ہیں جن کی شادابی کو کبھی کمھلاہٹ کا اثر نہیں پہنچے گا اور جو ہمیشہ اپنے پڑھنے والوں کے لیے تفریح کا ہی نہیں، عبرت اور آگاہی کا ذریعہ بھی بنے رہیں گے۔

مجتبیٰ حسین کی تحریروں کا انتخاب کرتے وقت مجھے نصف صدی پہلے کے وہ دن یاد آگئے جب میں عثمانیہ یونیورسٹی کے انجینیرنگ کالج کے انتظامیہ سے وابستہ تھا اور مجتبیٰ حسین آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علم تھے۔ اُن دنوں مجتبیٰ حسین انجینیرنگ کالج کے آڈیٹوریم میں پیش کیے جانے والے ڈراموں اور تہذیبی پروگراموں میں ایک اداکار اور گلوکار کی حیثیت سے شرکت کیا کرتے تھے۔ اس وقت میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک دن یہ اداکار اور گلوکار اُردو کا ایک ممتاز مزاح نگار بن کر اُبھرے گا اور میں حیدرآباد سے ہزاروں میل دور بیٹھ کر نصف صدی بعد اُن کی تحریروں کا انتخاب مرتب کروں گا۔ بھلے ہی مجتبیٰ حسین نے باضابطہ مزاح نگاری دیر سے شروع کی لیکن اس وقت بھی عثمانیہ یونیورسٹی کے آرٹس کالج اور حیدرآباد کے ''اورینٹ ہوٹل'' کی محفلوں اور بیٹھکوں میں اُن کی بذلہ سنجی، فقرے بازی اور لطیفہ گوئی کی دھوم تھی۔

مجھے خوشی ہے کہ ہندوستان کے سب سے معتبر اُردو اشاعتی ادارے ''ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس'' دہلی کے سربراہ جناب محمد مجتبیٰ خاں نے اس انتخاب کو نہایت اہتمام سے شائع کرنے کا بیڑہ اُٹھایا۔ مجتبیٰ حسین کی بیشتر ابتدائی تصانیف میں طباعت و اشاعت کا وہ اہتمام نظر نہیں آتا جس کی وہ مستحق تھیں۔ مشفق خواجہ نے بارہ تیرہ برس پہلے اپنے ایک کالم میں لکھا تھا: ''اُن کی جو کتابیں ہندوستان میں چھپی ہیں اُن میں سے بیشتر کی طباعت و کتابت کچھ ایسی ہے کہ صورت سے وہ جعلی ایڈیشن دکھائی دیتی ہیں۔'' غالباً مجتبیٰ حسین کے ہمنام ہونے کے باعث مجتبیٰ خاں نے اس انتخاب کو اس قدر اہتمام اور اتنی عجلت میں شائع کیا ہے کہ لگتا ہے انہوں نے سوچا کہ وہ اس کتاب کے پبلشر ہی نہیں بلکہ مصنف بھی ہیں۔ جلد اوّل کی اشاعت کے بعد وہ جلد ہی جلد دوم بھی شائع کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ میں اپنی

طرف سے اور مجتبیٰ حسین کے بے شمار چاہنے والوں کی طرف سے اُن کا تہہِ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اُردو کے ممتاز محقق، نقاد اور دانشور پروفیسر نثار احمد فاروقی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے اس انتخاب کے سلسلے میں میری رہنمائی فرمائی اور دست تعاون بڑھایا۔ مجتبیٰ حسین کے دفتر کے پرانے رفیق عظیم الدین صدیقی بھی شکریے کے مستحق ہیں جنہوں نے اس مجموعے کی پروف ریڈنگ کے علاوہ دیگر امور میں میرا ہاتھ بٹایا۔

مجھے امید ہے کہ مجتبیٰ حسین کے چاہنے والوں کا نہایت وسیع حلقہ اُن کی تحریروں کے انتخاب پر مشتمل ان دونوں مجموعوں کا گرم جوشی سے استقبال کرے گا۔

حسن چشتی

شکاگو ۔ ۱۳/ اگست ۲۰۰۱ء

7033- N Kedzie # 112
CHICAGO IL 60645
U.S.A.

ریل منتری مُسافِر بن گئے

اور ایک دن ریل منتری نے اچانک اپنے سکرٹری کو بُلا کر کہا: ''دیکھو جی! ہم کل بھیس بدل کر ایک عام مسافر کی طرح ٹرین کے تھرڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں سفر کرنا چاہتے ہیں۔ تمہیں بھی بھیس بدل کر ہمارے ساتھ چلنا ہوگا'' ____ سکرٹری نے پلکیں جھپکا کر منتری کو دیکھا۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آخر اس کے بھیس بدلنے کی کیا ضرورت ہے۔ بھیس بدلنا تو صرف منتریوں کا کام ہوتا ہے۔

پھر بھی اس نے ڈرتے ڈرتے کہا ''حضور آپ بُرا نہ مانیں تو ایک بات عرض کروں کہ آپ تو ریل منتری ہیں۔ ریل میں سفر کریں آپ کے دشمن۔ ریل منتری تو وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ ہوائی جہاز سے سفر کرتا ہے۔ آپ تو ابھی منتری کی گدی پر براجمان ہیں۔ پھر عام چناؤ کا بھی دُور دُور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ ایسے میں آپ پر ایسی کون سی بپتا آن پڑی ہے کہ آپ ریل میں سفر کریں۔''

منتری بولے ''تم زیادہ بکواس نہ کرو۔ آخر ہمیں اپنے محکمہ کے بارے میں جانکاری تو حاصل کرنی ہی چاہئے'' ____ سکرٹری نے کپکپاتے ہوئے کہا ''حضور آپ کا حکم سر آنکھوں پر، لیکن میرا خیال ہے کہ منتری اپنے محکمہ کے بارے میں جانکاری حاصل کرنا چاہے تو تب بھی وہ جانکاری حاصل نہیں کرسکتا۔ ابھی چند روز پہلے ہمارے وزیر خوراک قحط زدہ علاقوں کے دورہ پر گئے ہوئے تھے، وہ بھی جانکاری حاصل کرنا چاہتے تھے۔ واپسی پر

انہوں نے بتایا کہ ''قحط زدہ علاقوں میں مجھے کہیں بھی قحط نظر نہیں آئے۔ کیُوں کہ مجھے تو تینوں وقتوں کا کھانا پابندی سے ملتا رہا بلکہ دوسرے پردیشوں کے مقابلے میں یہاں کا کھانا زیادہ لذیذ محسوس ہوا۔ کیسا قحط اور کہاں کا قحط؟۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قحط کی افواہ صرف اپوزیشن والوں نے اُڑائی ہے۔''

ریل منتری نے اپنے سکرٹری کی بات ان سُنی کرتے ہوئے کہا ''دیکھو جی! تم ہمارے سکرٹری ہو، ہم تمہارے سکرٹری نہیں ہیں۔ ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر تمہیں عمل کرنا ہوگا۔''

سکرٹری لاجواب ہوگیا۔ اس نے جان لیا کہ اب مزید کچھ کہنا اپنی ملازمت کو خطرہ میں ڈالنا ہے۔ لہٰذا وہ چپ چاپ منتری کے کمرے سے جانے لگا۔

منتری جی نے اسے آخری بار یاددلاتے ہوئے کہا: ''آج رات تم ٹھیک آٹھ بجے اسٹیشن پر آجانا۔''

سکرٹری نے پوچھا ''حضور یہ بتایئے کہ ہم بلاٹکٹ سفر کریں گے یا ٹکٹ خرید کر؟''

منتری بولے ''اس کا فیصلہ اسی وقت کریں گے۔''

منتری جی دن بھر بھیس بدلتے رہے۔ شام شام تک وہ بھیس بدلتے بدلتے اپنی اصلی حالت پر آگئے۔ آئینہ میں صورت دیکھی تو انہیں یوں معلوم ہوا جیسے وہ سچ مچ اپنے آپ کو دیکھ رہے ہیں۔ مدتوں بعد اپنے آپ کو اصلی حالت میں دیکھ کر انہیں تھوڑی دیر کے لئے خوشی بھی ہوئی۔ شام میں جب وہ ایک چھوٹا سا اٹیچی کیس لے کر اسٹیشن پہنچے اور اپنا اٹیچی کیس سکرٹری کو دینے کی کوشش کی تو سکرٹری نے انہیں گھورتے ہوئے کہا: ''کیسے بدتمیز آدمی ہیں آپ بھی۔ کیا آپ مجھے قلی سمجھتے ہیں۔ نہ جانے کیسے کیسے لوگ آجاتے ہیں؟''

''دیکھو جی! یہ بدتمیزی نہ کرو، میں تمہارا منتری ہوں۔''

سکرٹری نے منتری کو غور سے دیکھا۔ پھر ایک ہلکا سا نعرہ تحسین لگاتے ہوئے بولا: ''حضور، یہ آپ ہیں۔ بھگوان قسم زندگی میں پہلی بار آج آپ ہم میں سے ہی ایک فرد نظر آرہے ہیں۔ اگر آپ اس کے بعد پھر کوئی بھیس نہ بدلیں تو کتنا اچھا ہوگا۔''

منتری بولے۔ ''چلو اب باتیں نہ بناؤ۔ ہمیں سب سے پہلے ٹکٹ خریدنا چاہئے۔''

سکرٹری بولا" لائیے، مجھے ٹکٹ کے پیسے دیجئے۔"

وہ بولے" نہیں۔ ٹکٹ میں خود خریدوں گا۔"

سکرٹری نے کہا" حضور یہ الیکشن کا ٹکٹ نہیں ہے، ریل کا ٹکٹ ہے۔ یہ اتنی آسانی سے نہیں ملے گا۔ اس کے لئے تو باضابطہ فری اسٹائل کشتی لڑنی پڑتی ہے۔"

وہ بولے" تم فری اسٹائل کشتی کی فکر نہ کرو۔ پارٹی کے ہنگامی اجلاسوں میں شرکت کرتے کرتے میں بھی کشتی لڑنے کے فن سے تھوڑا بہت واقف ہوتا جا رہا ہوں۔"

یہ کہہ کر منتری جی مسافروں کی کیو کو چیرتے ہوئے ٹکٹ گھر کی کھڑکی کی جانب بڑھنے لگے۔

لوگوں نے شور مچایا" مہاشے جی! کیو میں آجائیے۔ ہم یہاں گھنٹہ بھر سے کھڑے ہیں۔ آپ کہاں آگے بڑھ رہے ہیں۔"

وہ بولے" جب سارا دیش آگے بڑھ رہا ہے تو مجھے بھی آگے بڑھنے کا حق ہے اور زندگی تو ہر دم آگے بڑھنے کا نام ہے۔" وہ آگے بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ چار پانچ مسافروں نے انہیں پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کہا" مہاشے جی! زندگی میں ضرور آگے بڑھئے لیکن یہ تو کیو ہے۔ یہاں آدمی ایک گھنٹہ میں ایک انچ کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ کیا آپ اتنا بھی نہیں جانتے۔"

ان کا سکرٹری بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ منتری جی کا سکرٹری بننے سے پہلے وہ ٹرینوں میں سفر کرنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے کیو میں آگے جا کر کسی سے بات کی، پھر منتری جی کو الگ لے جا کر اس نے کہا" میں نے کیو میں آگے ٹھہرنے کا بندوبست کرلیا ہے۔ اگر آپ فی کس ایک روپیہ دیں تو اگلے دو آدمی اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے تیار ہیں۔"

منتری جی بہت خوش ہوئے اور بولے " واہ! یہ تو بڑا اچھا انتظام ہے۔ ہمیں یہ معلوم ہی نہ تھا کہ ریلوے ایڈمنسٹریشن نے عوام کی سہولت کے لئے یہ بندوبست بھی کر رکھا ہے۔" منتری جی نے دو روپے دیئے اور تھوڑی دیر بعد منتری اپنے سکرٹری کے ساتھ کیو میں آگے پہنچ گئے۔ لیکن وہاں ٹکٹ فروخت کرنے کے لئے کوئی بھی نہیں تھا۔

منتری جی نے پوچھا " مگر ٹکٹ فروخت کرنے والا کلرک کہاں ہے؟"

کسی نے کہا ''جو کلرک اب تک یہاں ٹکٹ فروخت کر رہا تھا اس کی ڈیوٹی ختم ہو چکی ہے۔ اب وہ ٹکٹ فروخت نہیں کرے گا، اس کی جگہ نیا کلرک آئے گا اور جس کلرک کو یہاں آنا ہے اس نے ابھی فون پر اطلاع دی ہے کہ وہ اپنے محلہ کے بس اسٹینڈ کی کیو میں کھڑا بس کا انتظار کر رہا ہے۔ بس کی کیو میں جیسے ہی اسے ٹکٹ ملے گا وہ اسٹیشن پہنچے گا اور ہمیں اس کیو سے نجات دلائے گا۔''

منتری جی بولے ''گویا ہمیں اس وقت تک ریل کا ٹکٹ نہیں مل سکتا جب تک کہ ریلوے کلرک کو بس کا ٹکٹ نہ مل جائے۔''

سکرٹری نے کہا ''حضور! ہمارے ملک کے سارے کام کیو میں طے پاتے ہیں اور آدمی دن بھر ایک کیو میں سے نکل کر دوسری کیو میں جاتا رہتا ہے۔ اسی لئے تو ہمارے ملک میں سوشلزم کے آنے میں دیر ہو رہی ہے۔''

اسی اثناء میں ریلوے کا کلرک آ گیا۔ منتری جی نے فوراً اپنا ہاتھ کھڑکی میں ڈال دیا۔ کلرک نے پوچھا ''آپ کو کہاں کا ٹکٹ چاہئے؟''

منتری نے پوچھا ''یہ گاڑی کہاں تک جائے گی؟''

کلرک بولا ''اگر راستہ میں کوئی حادثہ نہ پیش آئے تو یہ بمبئی تک جائے گی۔''

منتری بولے ''تب تو مجھے بمبئی کے دو ٹکٹ دے دیجئے۔''

منتری جی اور اُن کا سکرٹری ٹکٹ لے کر تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے پلیٹ فارم پر آ گئے۔ گاڑی تیار کھڑی تھی۔ منتری جی ایک ڈبہ کے سامنے پہنچ کر کھڑے ہو گئے اور دروازہ کے راستے سے اس میں داخل ہونے کی کوشش کرنے لگے۔

سکرٹری نے پکار کر کہا ''سرکار! آپ غلط راستہ سے ڈبہ میں داخل ہو رہے ہیں ــــ''

منتری نے کہا ''مگر ڈبے میں جانے کا راستہ تو یہی ہے۔''

سکرٹری نے کہا ''حضور تھرڈ کلاس کے ڈبے میں دروازہ صرف اس لئے لگایا جاتا ہے کہ اس کے راستے سے ڈبہ کے اندر ہوا آتی جاتی رہے۔ دروازے کو لوگ صرف ایمرجنسی میں استعمال کرتے ہیں۔ ورنہ ڈبہ کے اندر داخل ہونے کا صحیح راستہ تو وہ کھڑکیاں ہیں جو اس

ڈبے میں جگہ جگہ لگائی گئی ہیں۔ سچ پوچھئے تو کھڑکیاں بھی ڈبے کے اندر داخل ہونے کا صحیح راستہ نہیں ہیں۔ آدمی کو اصولاً ڈبہ میں نقب لگا کر داخل ہونا چاہئے۔ مگر میں نقب زنی کے فن سے واقف نہیں ہوں۔"

منتری جی فوراً کھڑکی کے سامنے پہنچے۔

سکرٹری نے کہا "حضور آپ مجھے اٹھا کر اندر پھینک دیجئے۔"

منتری بولے "مگر ڈبے میں تو کوئی جگہ نہیں ہے۔"

سکرٹری بولا آپ فکر نہ کریں۔ ریل کے ڈبے میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔

ع سمٹے تو دلِ عاشق پھیلے تو زمانہ ہے

دریا کو کوزے میں یہیں بند کیا جاتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ اس ایک ڈبہ میں ہمارے ایک گاؤں کی پوری آبادی سما سکتی ہے۔ مسافر کو ڈبہ میں صرف پاؤں رکھنے کی جگہ مل جائے تو سمجھئے کہ اس کا پورا خاندان معہ سامان اندر آ سکتا ہے۔ آپ گھبرائیے نہیں بلکہ پوری بے دردی کے ساتھ مجھے اندر ڈھکیل دیجئے ورنہ گاڑی چھوٹ جائے گی۔"

منتری جی نے فوراً اپنے سکرٹری کو اُٹھایا اور اسے ایک گٹھڑی کی طرح کھڑکی میں رکھ دیا۔ اس کے ساتھ ہی ڈبے کے اندر شور وغل برپا ہو گیا۔ "باہر نکالو اسے ڈبہ میں جگہ کہاں ہے؟ ہمارے سروں پر بیٹھے گا کیا؟"

آن کی آن میں پورا ڈبہ سکرٹری کے خلاف سینہ سپر ہو گیا۔ سارے مسافر اُسے باہر ڈھکیلنے لگے اور منتری جی اسے اندر ڈھکیلنے لگے۔ منتری کو یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ اُن کا سکرٹری ہے، اس وقت تو اُن کے اندر صرف انتقام کی آگ بھڑک اُٹھی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح سارے مسافروں کو شکست دیں اور اپنے سکرٹری کو اندر ڈھکیل کر دم لیں۔ اسی کوشش میں انہوں نے اپنے کندھے سے زوردار دھکا اپنے سکرٹری کو دیا اور سکرٹری ڈبہ کے اندر پہنچ کر ایک مسافر کے سر پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ مسافر چلّایا ____ "ابے ہٹ، اِدھر کدھر بیٹھتا ہے، یہاں ہم بیٹھیلا ہے۔" اس پر سکرٹری ایک اور مسافر کی پیٹھ پر سوار ہو گیا۔ اس نے پیٹھ اچھالی تو وہ ایک بڑھیا کی گود میں جا کر گر گیا۔ سکرٹری اس وقت تک تقریباً نیم بیہوش ہو گیا تھا۔ بڑھیا نے اسے ڈانٹنے کی کوشش کی تو سکرٹری بڑی منّت سے بولا:

''مائی اس سارے ڈبے میں مجھے ماں کی گود ہی سب سے زیادہ محفوظ جگہ نظر آ رہی ہے۔ مجھے یہاں بیٹھنے دے۔''

بڑھیا بولی۔ ''چل ہٹ، تو اگر میری گود میں بیٹھے گا تو میرا بیٹا اور اس کے دس بچے کہاں بیٹھیں گے۔'' سکرٹری کو برابر والے مسافر کی گود خالی نظر آئی تو اس نے پوچھا:

''بھیا جی، کیا آپ کی گود میں پہلے ہی سے کوئی بیٹھا ہوا ہے؟''

مسافر بولا: ''دیکھتے نہیں۔ میری گود میں دو رومال رکھے ہوئے ہیں، یہ دونوں مسافر ابھی چائے پینے کے لئے گئے ہیں۔''

سکرٹری سنبھلتے سنبھلتے کھڑکی تک آ گیا۔ منتری جی کھڑکی کے راستے اندر آنے کے لئے منتظر کھڑے تھے۔

سکرٹری بولا ''حضور آپ کھڑکی میں اُوپر چڑھ کر پہلے دونوں پاؤں کا ایک ایک انگوٹھا اندر داخل کیجئے پھر میں رفتہ رفتہ آپ کو اندر کھینچ لوں گا۔''

منتری نے کہا ''مگر اندر جگہ کہاں ہے؟''

سکرٹری بولا: ''حضور یہ سب کاریگری ہے۔ قدیم زمانے میں جب ہمارے کاریگر ململ کا پورا تھان ایک انگوٹھی میں سے گزار دیا کرتے تھے تو کیا اب ہم ایک کھڑکی میں سے ایک منتری کو نہیں گزار سکتے۔ آپ چنتا نہ کریں ریل کی کھڑکی بہت کشادہ ہوتی ہے۔ میرا دعویٰ ہے کہ ضرورت پڑنے پر میں ساری ریل گاڑی کو انجن سمیت اس ڈبہ کی کھڑکی میں سے گزار سکتا ہوں۔ یہ سب تصوف کا مسئلہ ہے۔ قطرہ سمندر میں جا ملتا ہے اور کبھی سمندر خود ایک قطرہ میں جا کر مل جاتا ہے۔''

اتنے میں ریل نے سیٹی بجائی۔ منتری جی فوراً کھڑکی پر چڑھ گئے اور اپنے دونوں پاؤں کھڑکی میں سے اندر داخل کر دیئے۔ سکرٹری نے فوراً منتری کے پاؤں پکڑ لئے اور پورا زور لگا کر انہیں اندر کھینچنے لگا۔ اسی اثناء میں مسافروں کی بھیڑ ایک ریلے کی شکل میں اس کے سامنے سے گزر گئی۔ وہ گرتے گرتے بچا۔ اسے منتری جی نظر نہیں آ رہے تھے مگر ان کے پاؤں ضرور نظر آ رہے تھے۔ وہ منتری جی کے پاؤں کو خوب پہچانتا تھا۔ اس لئے کہ مختلف غلطیوں کے بعد اسے ان پاؤں کو چھونے کی ضرورت پیش آتی تھی۔ اسے ان پاؤں سے محبت بھی تھی

اور نفرت بھی۔ جیسے ہی اسے منتری جی کے پاؤں پھر نظر آئے اس نے جھپٹ کر انہیں پکڑ لیا اور جھٹکہ دے کر زور زور سے کھینچنے لگا۔ پھر پکار کر پوچھا'' یہ بتایئے آپ کہاں تک اندر آ گئے ہیں؟''

دُور سے آواز آئی'' بس ٹخنوں تک اندر آ گیا ہوں۔''

سکرٹری نے کہا:'' بس بس اب فکر نہ کیجئے۔ آپ آدھے اندر آ جائیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت آپ کو اندر آنے سے روک نہیں سکتی۔''

اسی اثناء میں گاڑی چلنے لگی اور سکرٹری نے اب کی بار پورا زور لگا کر منتری کو اندر کھینچ لیا۔ منتری نے اندر پہنچتے ہی کہا'' میں اندر آ گیا ہوں۔ اب میرے پاؤں چھوڑ دو۔''

سکرٹری بولا پاؤں کیسے چھوڑ دوں سرکار! میری دونوں بغلوں میں اس وقت دو مسافر آ گئے ہیں۔ میری گردن پر ایک اور مسافر کا پاؤں رکھا ہوا ہے جو اُوپر برتھ پر رکھے ہوئے صندوق اور صندوق پر رکھے ہوئے اٹیچی کیس اور اٹیچی کیس پر رکھے ہوئے ہولڈال پر چڑھنا چاہتا ہے۔ آپ اسی طرح لیٹے رہیں۔ جب تک میں اس شکنجہ سے آزاد نہ ہو جاؤں اس وقت تک میں آپ کے چرنوں میں ہی رہنا چاہتا ہوں۔''

منتری کی آواز آئی'' مگر بے وقوف، اس وقت میرے سینہ پر دو مسافر بیٹھ گئے ہیں۔''

سکرٹری بولا'' تھوڑی دیر صبر کیجئے، گاڑی چلنے لگے گی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

پھر گاڑی چلنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد منتری جی نیچے سے نکل آئے اور ایک گٹھڑی پر بیٹھ گئے۔ سکرٹری نے انہیں دیکھا اور انہوں نے سکرٹری کو دیکھا۔ منتری جی کے شرٹ کی ایک آستین کندھے سے پھٹ کر بالکل غائب ہو گئی تھی البتہ سیدھے ہاتھ میں ایک آستین ضرور موجود تھی۔

منتری بولے:'' ایک آستین کا شرٹ اچھا نہیں معلوم ہو رہا ہے، کیوں نہ میں دوسری آستین بھی پھاڑ دوں۔''

سکرٹری بولا'' ایسی غلطی نہ کیجئے۔ بعد میں ڈبہ سے اُترتے وقت آپ کو ایک اور آستین کی ضرورت پیش آئے گی۔ اُترتے وقت آپ کے شرٹ میں پھٹنے کے لئے کچھ تو باقی

رہنا چاہئے۔"

منتری جی کی سمجھ میں یہ بات آگئی۔ یوں بھی ڈبہ میں سوار ہونے کے بعد ان کی سمجھ کافی بہتر ہوگئی تھی۔

زندگی میں پہلی بار منتری جی تھرڈ کلاس کے ڈبے میں ایک عام مسافر کی طرح سفر کر رہے تھے۔ وہ اس سفر سے لطف اُٹھانا چاہتے تھے۔ انہوں نے سارے ڈبے میں حیرت سے نظر ڈالی، پورا ڈبہ ایک جان ہزار قالب بن گیا تھا۔ لوگ ایک دوسرے سے چپک کر یوں کھڑے تھے جیسے سارے مسافر مل کر ایک ہی جسم میں تبدیل ہوگئے ہوں۔ ڈبہ کے آخری سرے پر جس آدمی کا دل دھڑک رہا تھا اس کی آواز دوسرے سرے پر کھڑے ہوئے آدمی کے سینہ میں صاف سنائی دے رہی تھی۔ آخری کونہ میں کوئی مسافر کروٹ بدلتا تھا تو اس کی کروٹ سمندر کی ایک لہر کی طرح سارے ڈبے میں پھیل جاتی تھی اور سارے ڈبے میں ہلچل سی پیدا ہو جاتی تھی۔ مشرقی دروازے سے ہوا کا کوئی جھونکا جب زور سے داخل ہوتا تھا تو ڈبہ میں ہوا کے لئے جگہ فراہم کرنے کی غرض سے مغربی دروازے میں کھڑا ہوا مسافر ڈبے سے باہر لہرانے لگتا تھا۔ اسی اثناء میں ایک مسافر کے پاؤں پر صندوق گر گیا تو اس چوٹ کا کرب سارے مسافروں کے جسم میں دوڑنے لگا۔ منتری جی نے تھوڑی دیر کے لئے سوچا کہ اگر ساری قوم اسی طرح متحد ہو جائے تو ملک کیا سے کیا ہو جائے گا۔ منتری جی نے دیکھا کہ ایک مسافر برتھ پر اپنی کہنیاں ٹکائے کھڑا ہے اور اس کے اطراف دوسرے مسافر بیل کی طرح لپٹ گئے ہیں۔ اس کا سر برتھ پر رکھے ہوئے ہولڈال کے نیچے دب گیا ہے اور اس کی ٹھڈی کے نیچے ایک اور مسافر کا سر آ گیا ہے۔ لہٰذا وہ اپنی گردن ایک طرف کو موڑ کر کھڑا ہے۔ اُوپر برتھ پر ایک مسافر نے سگریٹ جلا لیا ہے اور وہ بار بار سگریٹ کی راکھ اس مسافر کے کان میں جھاڑ رہا ہے۔ منتری جی نے زندگی میں پہلی مرتبہ کان کو بطور ایش ٹرے (Ash Tray) استعمال ہوتے دیکھا۔ جس مسافر کے کان میں راکھ جھاڑی جا رہی تھی وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا، کیوں کہ اس کا حلق ایک مسافر کی کہنی میں پھنس گیا تھا۔ تاہم جب اُوپر بیٹھے ہوئے مسافر نے کافی راکھ جھاڑنے کے بعد اس کے کان میں سگریٹ بجھانے کی کوشش کی تو وہ درد کے مارے چیخ اُٹھا مگر وہ پھر بھی اپنی جگہ سے نہ ہل سکا۔

سامنے دو مسافر ایک دوسرے میں پیوست ہو کر کھڑے تھے۔ دونوں کو سگریٹ نوشی کی طلب ہوئی تو دونوں نے ایک ساتھ اپنے ہاتھ اپنی اپنی پتلونوں کی جیبوں میں داخل کیے۔ وہاں سے سگریٹ کی ڈبیاں نکل آئیں تو دونوں حیران رہ گئے۔

ایک نے کہا ''میں تو چار مینار سگریٹ پیتا ہوں۔ یہ برکلے کی ڈبیا میری جیب میں کیسے آگئی؟'' دوسرے نے کہا ''میں تو برکلے پیتا ہوں یہ چار مینار کی ڈبیا کہاں سے آگئی۔'' دونوں نے حیران ہو کر اپنے ہاتھ پھر جیبوں میں داخل کیے مگر جب اُن کی نظر اپنے ہاتھوں پر پڑی تو پتہ چلا کہ دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے کی جیبوں میں جا رہے ہیں۔

دونوں مسکرا کر بولے ''ٹھیک ہے، میری پتلون تم استعمال کرو اور تمہاری پتلون میں استعمال کرتا ہوں۔''

اسی اثناء میں ایک مسافر دوسرے مسافروں کے سروں پر سے چلتا ہوا ڈبے کے بیت الخلاء کے پاس پہنچا۔ اس نے بیت الخلاء کے دروازے پر زوردار گھونسے رسید کرنا شروع کردیئے۔ اتنے میں تین چار مسافروں کی آوازیں آئیں ''کون ہے؟''

مسافر بولا ''باہر نکلو میں اندر آنا چاہتا ہوں۔''

اندر سے بیک وقت کئی مسافر بول اُٹھے ''کسی اور بیت الخلاء کی طرف جاؤ، یہ بیت الخلاء تو ریزروڈ (Reserved) ہے۔''

مسافر بولا ''بیت الخلاء کیسے ریزرو ہو سکتا ہے؟''

اندر سے آواز آئی ''ہم لوگ پیچش کے مریض ہیں اور ہم نے بطور خاص یہ بیت الخلاء ریزرو کروایا ہے۔'' مسافر لاجواب ہو گیا اور پھر لوگوں کے سروں پر سے چلتا ہوا ڈبے کے پنکھے سے لٹک گیا۔

کسی نے کہا ''بھئی پنکھا چلاؤ۔ بڑی گرمی ہو رہی ہے۔''

دوسرے مسافر نے پنکھے کا سوئچ آن کر دیا۔ اس کے جواب میں پنکھے کی پتیوں میں تو کوئی حرکت پیدا نہیں ہوئی، البتہ پنکھے کے اطراف جالی کا جو خول ہوتا ہے وہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں ہلنے لگا اور اس کے ساتھ ہی وہ مسافر بھی، جو پنکھے سے لٹک کر کھڑا ہو گیا تھا، جھولنے لگا۔

لٹکنے والے مسافر نے چیخ کر کہا ''بدتمیزو پنکھا بند کرو، اس کی پتیاں تو نہیں گھوم رہی ہیں، ہوا آنے کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ صرف خول ہل رہا ہے اور خول کے ساتھ ساتھ میں بھی ہل رہا ہوں۔''

نیچے بیٹھے ہوئے مسافروں نے کہا ''پنکھا بند نہ کرو۔ پنکھے کے خول کے ساتھ اس آدمی کے ہلنے سے بھی تھوڑی بہت ہوا پیدا ہو رہی ہے۔'' اور وہ شخص مجبور ہو گیا اور پنکھے کے خول کے ساتھ خود بھی ہلنے لگا۔ اتنے میں سامنے بیٹھے ہوئے مسافر نے بڑی مشکل سے پہلو بدلتے ہوئے کہا: ''باپ رے، پتہ نہیں ہماری ریلوں کا انتظام کب ٹھیک ہوگا؟''

دوسرے نے کہا ''کیا ٹھیک ہوگا جی، ہمارے ریل منتری تو صرف بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں۔ پرسوں ہی اُن کا بیان اخبارات میں چھپا تھا۔ منتری جی کہتے ہیں کہ ''دیش میں ٹرینوں کے ذریعہ ہی سوشلزم آئے گا۔'' تیسرے نے کہا ''بھگوان سوشلزم کی رکھشا کرے۔ ہمارے دیش میں سوشلزم بیل گاڑی میں بیٹھ کر ہی آئے تو اچھا ہے۔ ریل گاڑی میں آئے گا تو منزل تک پہنچتے پہنچتے اس کا کچومر نکل جائے گا۔''

چوتھے مسافر نے کہا ''آپ منتری جی کے بیان کا مطلب نہیں سمجھے۔ سوشلزم ریل گاڑی میں ہی آئے گا مگر فرسٹ کلاس کے ڈبے میں بیٹھ کر آئے گا، سمجھے ___ ہمارے سوشلزم کو تھرڈ کلاس کے ڈبے سے کیا مطلب؟''

منتری جی ان باتوں کو سُن کر اچانک غصہ میں آ گئے۔ انہوں نے جھٹ سے کہا ''آپ لوگوں نے غلط سمجھا۔ میرے کہنے کا مطلب یہ نہیں تھا ___ بلکہ ___''

وہ آگے کچھ کہنا چاہتے تھے کہ اُن کے سکرٹری نے فوراً اُن کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور کان میں کہا: ''حضور یہ آپ کیا کرتے ہیں؟ آپ تو اس وقت بھیس بدلے ہوئے ہیں۔''

منتری جی کو اچانک اس بات کا خیال آ گیا اور وہ سنبھل کر بیٹھ گئے۔

اتنے میں گاڑی ایک پل پر سے گزرنے لگی۔ پھر اچانک ایک دھماکہ کی آواز آئی۔ مسافروں کی چیخ و پکار سے سارا ماحول گونج گیا اور ٹرین دریا میں گرنے لگی۔ منتری جی گھبرا کر فوراً اپنے سکرٹری سے لپٹ گئے۔

مگر سکرٹری نے انہیں پرے ڈھکیلتے ہوئے کہا ''اب میرے قریب نہ آؤ، مرنے کا

وقت آ گیا ہے، نہ تم میرے منتری نہ میں تمہارا سکرٹری۔ اپنی جان آپ بچاؤ، میں تو چلا۔'' یہ کہہ کر سکرٹری کھڑکی سے دریا میں کود گیا۔

منتری جی نے بھی ایک زوردار چیخ ماری اور اس چیخ کی آواز سے اُن کی آنکھ اچانک کھل گئی۔ آنکھیں کھول کر دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ تو اپنی خواب گاہ میں ایک آرام دہ بستر پر لیٹے ہوئے ہیں اور دور سے کسی مرغ کے بانگ دینے کی آواز آ رہی ہے۔

منتری جی کو پھر بڑی دیر تک نیند نہ آئی۔ اس ڈراؤنے خواب کو دیکھ کر اُن کی طبیعت بوجھل ہو گئی تھی۔

دوسرے دن وہ اپنے دفتر گئے تو اُن کا موڈ کافی خراب تھا، __ اُن کا سکرٹری جیسے ہی اُن کے کمرہ میں داخل ہوا انہوں نے گرج کر کہا ''تم اسی وقت میرے سامنے سے چلے جاؤ۔ مجھے تم جیسے نمک حرام سکرٹری کی ضرورت نہیں ہے۔ تم آج سے ڈسمس کئے جاتے ہو۔ نکل جاؤ یہاں سے۔''

سکرٹری بولا ''مگر میرا قصور؟''

منتری بولے ''میں کچھ نہیں سننا چاہتا، نکل جاؤ میرے سامنے سے۔''

اور سکرٹری چپ چاپ منتری جی کے کمرہ سے باہر نکل آیا۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ سچ مچ کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ رہا ہے۔

(قصہ مختصر۔ ۱۹۷۲ء)

ہماری بے مکانی دیکھتے جاؤ

پرسوں میں نے کرایہ کے مکانوں میں رہنے کی سنچری اور اپنی زندگی کی نصف سنچری ایک ساتھ مکمل کر لی تو سوچا کہ کیوں نہ اس مبارک و مسعود موقع کو سیلبریٹ کیا جائے۔ یہ اعزاز کسے ملتا ہے کہ سواں مکان شروع اور زندگی کا پچاسواں سال ختم ہو۔ یہ حُسنِ اتفاق نہیں، عشقِ اتفاق ہے۔ میں خوشی خوشی گھر پہنچا تو بیوی کو افسردہ و رنجیدہ پایا۔ میں نے کہا: "بہت اُداس دکھائی دیتی ہو۔ کیا نیا مکان تمہیں پسند نہیں آیا۔"

بولی "تمہاری رفاقت میں آج تک میں نے اَن گنت مکان بدلے۔ کبھی کسی مکان کے بارے میں شکایت کی؟"

میں نے کہا "سچ تو یہ ہے کہ مجھے تم سے ہی یہ شکایت ہے کہ اتنے مکان بدلنے کے باوجود تم نے میرا ساتھ اور ہاتھ نہیں چھوڑا۔"

بولی "اگر میں مکانوں کے بدلنے میں ہنسی خوشی تمہارا ساتھ نہ دیتی تو تم مکان بدلنے کی بجائے بیویاں بدلتے اور اس کوشش میں ایک نہ ایک دن کہیں گھر داماد لگ جاتے۔"

میں نے کہا "بات کیا ہے؟۔ تم نہ صرف اُداس نظر آتی ہو بلکہ لڑائی کے موڈ میں بھی ہو۔"

بولی "ایک بُری خبر ہے، خدا کرے کہ جھوٹی ہو، ابھی ابھی تمہارے بھتیجے نے آکر یہ اطلاع دی ہے کہ پچیس۲۵ سال پہلے تم جس ہاؤسنگ سوسائٹی کے ممبر بنے تھے اس نے بالآخر

مکان بنالئے ہیں اور یہ کہ تمہیں اب اپنا مکان ملنے ہی والا ہے۔''

اس اطلاع کو سُن کر میں بے ہوش ہوتے ہوتے بچا۔ پیروں تلے سے مکان سمیت زمین نکلنے لگی۔ میں نے سوچا، ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ یہ سب جھوٹ ہے۔ میں اور اپنا ذاتی مکان! زندگی کے پچاس برس بیت چکے ہیں، اب میں اپنا مکان لے کر کیا کروں گا۔

میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بیوی نے کہا ''کس سوچ میں پڑ گئے، بتاؤ اب کیا ہوگا؟''

میں نے بیوی پر قابو پانے کی خاطر اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا ''ہونا کیا ہے اگر ذاتی مکان ملتا ہے تو اس میں چلے جاتے ہیں۔ لوگ تو ذاتی مکان کے لئے ترستے ہیں۔ یہ اُداس ہونے کی نہیں خوشی کی بات ہے۔''

بولی ''مگر میرے لئے یہ خوشی کی بات نہیں ہے۔ کرایہ کے مکان میں ازدواجی زندگی کا جو لطف ہے وہ ذاتی مکان میں کہاں۔ میں نے تم سے شادی ہی اس لئے کی تھی کہ تمہارا اپنا کوئی ذاتی مکان نہیں ہے، کیوں کہ میں جانتی ہوں کہ جس دن تمہیں اپنا مکان مِل جائے گا۔ تم اپنی ساری توجہ مجھے بنانے سنوارنے کے بجائے مکان کو بنانے سجانے میں صرف کردو گے ___ میں اپنے اور تمہارے بیچ کسی مکان کو حائل ہوتے نہیں دیکھنا چاہتی۔ پھر ہماری خوشگوار ازدواجی زندگی کا راز یہی ہے کہ تمہارا زیادہ وقت مکانوں کے مالکوں سے لڑنے یا اُنہیں خوش کرنے میں گذرتا ہے۔ مجھ سے لڑنے کی تمہیں مہلت ہی نہیں ملتی۔ جس دن مالک مکان ہم دونوں کے بیچ سے نکل جائے گا، ہم ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہو جائیں گے۔ یہ ایک ایسی جنگی حکمتِ عملی ہے جس کے باعث ہمارے گھر میں دائمی اور پائیدار امن قائم ہے۔ میں گھریلو اور عالمی امن کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔ چاہے مجھے ذاتی مکان سے ہاتھ ہی کیوں نہ دھونا پڑے۔''

زندگی میں پہلی بار میں اپنی بیوی کی فہم و فراست کا قائل ہوگیا۔ میں نے کہا ''میں تمہارے جذبات کی قدر کرتا ہوں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی اب کرایہ کے مکانوں میں رہنے کا عادی ہو چکا ہوں۔ جس آدمی نے فی برس دو مکانوں کے حساب سے اپنی جائے رہائش تبدیل کی ہو، اُس کی خانہ بدوشی کو کم از کم تمہیں تو تسلیم کر لینا چاہئے۔ اپنی تو ساری زندگی اس طرح گذری کہ ایک پاؤں ایک مکان میں ہے اور دوسرا پاؤں دوسرے مکان

میں۔ سچ تو یہ ہے کہ میں مکانوں کو بدلتے بدلتے مکاں سے لامکاں تک پھیل گیا ہوں۔ میں مکان میں ہوں بھی اور نہیں بھی۔ میں مکان کے اندر ہوں اور مکان میرے اندر ہے۔ کرایہ کے مکانوں کی برکتوں سے جتنا میں واقف ہوں، شاید کوئی اور ہو، بلکہ آج میں جو کچھ ہوں وہ کرایہ کے مکانوں میں رہنے کی وجہ سے ہوں۔ تمہیں یاد ہوگا کہ شادی کے بعد ہم نے ایک مکان کرایہ پر لیا تھا۔ مالک مکان نے تین چار مہینوں تک ہمیں ہنی مون منانے کی اجازت دے دی۔ پانچویں مہینہ سے اُس نے کرایہ کی ادائیگی کا مطالبہ شروع کردیا۔ میں اس سے منہ چھپاتا رہا۔ ایک دن آمنا سامنا ہوا تو اس نے پوچھا ''آخر تم کرایہ کیوں ادا نہیں کرتے؟''

میں نے کہا ''اس لیے کہ بے روزگار ہوں۔ کہیں نوکری لگے تو کرایہ بھی ادا کروں۔'' تمہیں شاید نہیں معلوم کہ مالک مکان کئی دنوں تک میری ملازمت کی خاطر جوتیاں چٹخاتا پھرا۔ جگہ جگہ میری درخواستیں دیں۔ بالآخر اُس نے مجھے نوکری سے لگادیا۔ تنخواہ سے سارا کرایہ وصول کیا اور اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ اس کے بعد میں نے ایک بڑا مکان کرایہ پر لے لیا۔ میں نے سوچا کہ جب کرایہ ادا کرنا ہی نہیں ہے تو کیوں نہ بڑا مکان کرایہ پر لیا جائے۔ یوں بھی کہنے کو میری نوکری لگ چکی تھی مگر جب میں اپنی قلیل تنخواہ میں سے مکان کا کرایہ پابندی سے ادا کرنے کے قابل نہیں رہنے لگا تو دوسرے مالک مکان نے اپنے اثر ورسوخ کو استعمال کرکے دفتر میں میری پرموشن کروادی۔ یہ سب مکانوں کے مالکوں کی دین ہے۔ یہ اُن ہی کا احسان ہے کہ آج میں خوش حال زندگی گذار رہا ہوں۔''

بیوی نے بات کو کاٹ کر کہا ''تمہیں یاد ہوگا ایک مالک مکان کو یہ شکایت تھی کہ لکڑی کے چولہے پر پکوان کرنے کی وجہ سے اس کا رسوئی گھر خراب ہو رہا تھا۔ آخر کو اُسی نے تنگ آکر اور ہم پر ترس کھا کر گیس کے چولہے کا کنکشن دلوادیا تھا۔ اگر ہمارا ذاتی مکان ہوتا تو ہمارے پاس گیس کا کنکشن کہاں سے آتا؟''

میں نے کہا ''بیگم تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ صبر کرو۔ مجھے یقین ہے کہ ہمیں اپنا ذاتی مکان ملنے کی اطلاع جھوٹی ہے۔ ہاؤسنگ سوسائٹی پر پورا بھروسہ رکھو۔ کیوں کہ یہاں نہ صرف دیر ہوتی ہے بلکہ اندھیر بھی ہوتی ہے۔''

وہ میرے لئے چائے بنانے کی خاطر چلی گئی تو میں پھر سے سوچ میں ڈوب گیا۔

اب اگر واقعی ہمیں ذاتی مکان مل گیا تو کیا ہوگا۔ مجھے رہ رہ کر وہ سارے مکان یاد آنے لگے جن میں اپنا سر چھپانے کے علاوہ بہت کچھ چھپایا تھا جیسے اپنی غُربت، عزت، شرافت وغیرہ وغیرہ اور وہ سارے مکان مالک بھی یاد آنے لگے جن پر اپنا سب کچھ ظاہر کر دیا تھا۔ جیسے اپنی غربت، بے روزگاری، مفلوک الحالی اور آوارہ گردی وغیرہ وغیرہ۔ جس بات کا علم مکان کو نہیں ہوتا تھا، اُسے مالک مکان جان لیتا تھا اور اسی بنیاد پر ہم نے یہ مفروضہ بنا رکھا تھا کہ کرایہ کا مکان چاہے کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو وہ اپنے مالک سے بڑا ہوتا ہے۔ ہم تو صرف مکان کی مکانیت کا کرایہ ادا کرتے تھے۔ اس کے ظرف کا کرایہ کہاں ادا کرتے تھے۔ کن کن باتوں کو یاد کریں۔ برسات کے موسم میں جب ایک مکان کی چھت غالبؔ کے مکان کی چھت سے بھی زیادہ ٹپکنے لگی تو میں ایک اور مکان کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ ایک محلہ میں پنواڑی سے پوچھا ’’کیوں بھئی! کیا تمہارے علاقے میں کوئی مکان خالی ہے؟‘‘

پنواڑی نے کہا ’’حضور ایک مکان خالی تو تھا مگر آپ نے یہاں آنے میں ذرا دیر کر دی۔‘‘

میں نے پوچھا ’’تو کیا وہ مکان کرایہ پر اُٹھ گیا؟‘‘

وہ بولا ’’جی نہیں! شدید بارش کے زور سے ابھی ابھی گرا ہے۔ آپ کچھ دیر پہلے آجاتے تو مکان آپ ہی کا تھا۔‘‘

اور یوں کھلے ہوئے غنچوں کے مُرجھانے کا ایک اور موقعہ ہاتھ سے نکل گیا۔ گھر واپس ہوا تو بیوی نے پوچھا ’’کوئی مکان ملا‘‘؟ میں نے کہا ’’مکان تو نہیں ملا، البتہ ایک دوست کے ہاں دو پُرانے رین کوٹ مل گئے۔ وہ اُن کا کرایہ بھی نہیں لے گا۔ ایک تم پہنو، دوسرا میں پہنتا ہوں، پھر دیکھو ساون کا مزہ کیسے آتا ہے؟‘‘

ہمارا ایک مکان پڑوسیوں کے مکانوں اور اُن کے مکینوں میں کچھ اتنا دخیل تھا اور وہاں فرد کی انفرادیت کچھ اتنی غیر محفوظ تھی کہ نماز پڑھنے کے بعد سلام پھیرنے سے پہلے یہ اعلان کرنا پڑتا تھا کہ ’’صاحبو! ہم سلام پھیر رہے ہیں، اپنی بیبیوں سے پردہ کروالو۔‘‘ بعض اوقات تو ہمیں دایاں سلام پھیرنے کے بعد بایاں سلام پھیرنے میں دس منٹ لگ جاتے تھے، کیوں کہ اس وقت پڑوسن کی بیٹی کی چوٹی گوندھی جارہی ہوتی تھی۔

ہمارا ایک مکان چوتھی منزل پر تھا۔ پہلی منزل میں مالک مکان سردار مہابیر سنگھ رہتے تھے اور دوسری منزل میں پرمود کمار چٹرجی اور تیسری منزل میں مسٹر تھامس رہتے تھے۔ چوتھی منزل ہماری تھی۔ مکان کیا تھا اچھا خاصا ملک تھا۔ اس مکان میں ہم خوش بھی بہت تھے۔ بس ایک شکایت یہ تھی کہ مہینہ میں چار پانچ تہوار مشترکہ طور پر منانے پڑتے تھے بلکہ تہواروں کے سوا اس گھر میں کچھ بھی نہیں منایا۔ تہوار تو ہمیں اچھے لگتے تھے لیکن ہماری جیب ان تہواروں کا بوجھ اُٹھا نہیں سکتی تھی۔ قومی یکجہتی کو فروغ دینے کے لئے جتنی خوش حالی درکار ہوتی ہے، وہ ہمارے پاس نہیں تھی۔ اسی لیے وہاں سے بادلِ ناخواستہ نکل آئے۔

مکان یاد آنے لگے تو مکان کے مالک بھی یاد آتے چلے گئے۔ ایک مالک مکان اتفاق سے ہر مہینہ کی پہلی تاریخ کو ہمارے گھر کے سامنے سے گذرتے تھے۔ نہ صرف اتفاق سے گذرتے تھے بلکہ اتفاق سے کال بیل بھی بجا دیتے تھے۔ میں اتفاق سے گھر پر ہوتا تو کہتے ''بھئی اتفاق سے ادھر سے گذر رہا تھا، سوچا آپ سے مل لوں۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آج پہلی تاریخ ہے۔'' ایک مہینہ میں اکتیس تاریخ کو اتفاق سے اُن کے گھر پہنچا۔ مجھے دیکھ کر بہت ٹپٹا گئے بولے'' آج آپ کے اتفاق سے اِدھر چلے آنے سے کچھ نا اتفاقی کی بو آ رہی ہے۔''

میں نے کہا'' اتفاق سے مجھے اس مہینہ تنخواہ نہیں مل رہی ہے۔ اتفاق سے اِدھر سے گذر رہا تھا، سوچا کہ آپ کو آگاہ کردوں کہ آپ کل اتفاق سے میرے گھر نہ آئیں''۔ اور یہ بھی ایک اتفاق ہے کہ چند دنوں بعد مجھے اس گھر کو خالی کرنا پڑا۔

ایک اور مالک مکان بھی بہت یاد آئے۔ خدا انہیں کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے۔ پہلی تاریخ کو مکان کا کرایہ تو وصول نہیں کرتے تھے البتہ آدھی رات کو اپنا بے بحر شعر سنا کر داد ضرور وصول کرلیا کرتے تھے۔ میں نے مہینوں انہیں مکان کا کرایہ ادا نہیں کیا۔ البتہ شعر کی داد کے معاملے میں وہ اُدھار کے قائل نہیں تھے۔ کھڑے کھڑے داد وصول کرلیتے تھے بلکہ مستقبل میں سرزد ہونے والے شعروں کی پیشگی داد تک پگڑی سمیت وصول کرلیتے تھے۔ مکان چوں کہ اُن کا چھوٹا تھا اسی لیے چھوٹی بحر میں شعر کہتے تھے۔ شاعری بھی اپنے مکان کی طرح کرتے تھے، جس میں کمرے کم اور بیت الخلاء زیادہ ہوتے تھے۔ بات بات پر شاعری میں اپنا کلیجہ، پھیپھڑا وغیرہ نکال کر رکھ دیتے تھے۔ میں تو زندگی بھر اُن کے مکان کو خالی نہ کرتا

مگر قدرت کو اُردو شاعری کا فائدہ اور میرا نقصان مقصود تھا۔ ایک دن وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ یہ اُن کے مرنے کے دن نہیں تھے۔ جوں جوں مکان کا کرایہ بڑھتا جارہا تھا، اُن کی شاعری میں مجھے نئے نئے گوشے بشمول گوشۂ عافیت کے نظر آنے لگے تھے اور میں اُن کی شاعری میں امکان اور مکان دونوں کو ڈھونڈنے لگا تھا۔

جب مکانوں اور مکان مالکوں کی یاد نے زور مارا تو میں نے سوچا کہ یادوں کی اس دہلیز کو پھلانگ کر میں اپنے ذاتی مکان کی دہلیز پر کیوں کر قدم رکھوں گا۔ اسی اثناء میں میری بیوی چائے لے کر آگئی۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ بولی ''مجھے آج اپنا سڑسٹھواں مکان بہت یاد آرہا ہے۔ ہادی وہیں پیدا ہوا تھا اور اُنہترواں[۶۹] مکان بھی، کیوں کہ نجیبہ وہیں پیدا ہوئی تھی۔''

میں نے اُسے روکتے ہوئے رُندھی رُندھی آواز میں کہا ''بیگم! اب کچھ یاد نہ دلاؤ۔ یادوں کا ایک ایسا ٹھاٹھیں مارتا سمندر میرے اندر موجزن ہے کہ اگر ہمارا ذاتی مکان بھی اس کی زد میں آجائے تو اس کے بام و در پاش پاش ہوجائیں گے۔ اُس کی اینٹ سے اینٹ اگر خود سے نہ بجی تو بجادی جائے گی۔''

میں یہ کہہ ہی رہا تھا کہ میرا بھتیجا بھاگا بھاگا آیا۔ اُس نے کہا ''انکل معاف کیجئے۔ میں ایک بُری خبر لے کر آیا ہوں۔''

میں نے کہا ''مجھے اس بُری خبر کی اطلاع مل چکی ہے۔''

بھتیجے نے کہا ''نہیں! وہ تو خوش خبری تھی۔ آپ کے ذاتی مکان کے ملنے کی۔''

میں نے پوچھا ''تو پھر بُری خبر کیا ہے؟''

بھتیجے نے کہا ''مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ ہاؤسنگ سوسائٹی نے جس بلاک میں آپ کا فلیٹ تعمیر کیا تھا وہ سارا بلاک ملاوٹی سمنٹ کے استعمال کے باعث گر گیا ہے۔ اب کیا ہوگا؟''

اس بُری اطلاع کو سُن کر ہم دونوں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا۔ ہم خوشی کے مارے ہنسنے لگے تو میرے بھتیجے نے کہا ''انکل آپ کی طبیعت خراب معلوم ہوتی ہے۔ کسی ڈاکٹر

بلاؤں؟'' میں نے کہا ''ڈاکٹر کو نہیں، وقت کو بلاؤ، وقت ہی سب سے بڑا ڈاکٹر ہے۔ جب تم بھی پچاس برس کے ہو جاؤ گے اور کرایہ کے سو ویں مکان میں جاؤ گے تو تمہیں بھی اچانک یہ عرفان ہوگا کہ ''بے مکانی، مکان سے بہتر ہوتی ہے۔''

(الغرض ۱۹۸۷ء)

مرزا کی یاد میں

مرزا تین سال تک سرکاری ملازمت سے وابستہ رہنے کے بعد پرسوں ریٹائر ہوگئے۔ میں ان سے ملنے گیا تو گلے سے لگ گئے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ مَیں نے کہا: ''مرزا! بھلا یہ بھی کوئی رونے کا موقع ہے۔ تمھیں تو خوش ہونا چاہئے کہ تین سال تک عملاً کوئی کام کیے بغیر تم نے سرکاری ملازمت بحُسن وخوبی انجام دی تو پھر رونا کیسا؟''

وہ بولے: ''یار تم ایک سرکاری ملازم کے دِل کا درد کیا جانو۔ تمھیں تو یہ بھی نہیں معلوم کہ دُنیا کے سارے افراد زندگی میں صرف ایک بار مَرتے ہیں لیکن سرکاری ملازم تین مرتبہ مَرتا ہے۔''

مَیں نے پوچھا: ''وہ کیسے؟''

وہ بولے: ''جب وہ سرکاری ملازمت میں داخل ہوتا ہے تو اس کی پہلی موت واقع ہوتی ہے اور جب وہ وظیفہ پر علیحدہ ہوتا ہے تو اُس کی دُوسری موت واقع ہوجاتی ہے۔ اور تیسری موت تو طبعی ہوتی ہی ہے۔''

مَیں نے کہا: ''مرزا۔ مَر مَر کے جیے جانا بھی تو ایک فن ہے۔''

بولے: ''فن تو خیر ہے لیکن یہ بھی سوچ لو کہ لوحِ تُربت پر وفات کی کتنی تاریخیں کندہ کروانی پڑتی ہیں۔ لوحِ تُربت نہ ہوئی ایک اچھی خاصی فائل ہوگئی۔''

مَیں نے مرزا کو تسلی دی اور واپس چلا آیا۔

مرزا کا شمار اُن سرکاری ملازمین میں ہوتا تھا جو بہت زیادہ سرکاری ملازم ہوتے ہیں۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ وہ پیدائشی سرکاری ملازم تھے۔ کیوں کہ بچپن ہی سے وہ ہر کام کو پینڈنگ (Pending) رکھنے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ جب طالب علم تھے تو نہ صرف اُن کا ہوم ورک پینڈنگ رہتا تھا بلکہ اسکول کی فیس بھی پینڈنگ رہا کرتی تھی۔ سوائے شادی کے انہوں نے اپنی زندگی کا ہر کام پینڈنگ رکھا۔ ان کے ہاں ہر کام ''تھرو پراپر چینل'' ہوا کرتا تھا۔ اس تھرو پراپر چینل پر مجھے ایک واقعہ یاد آگیا کہ مرزا نے ایک بار مجھے اپنے دفتر میں ایک مزاحیہ مضمون پڑھنے کو کہا۔ مرزا کا معاملہ تھا سو میں چلا گیا۔ اب جو مَیں نے مضمون پڑھنا شروع کیا تو محسوس ہُوا کہ سامعین بالاقساط ہنس رہے ہیں۔ کبھی کچھ لوگ ہنستے ہیں تو کبھی کچھ۔ کبھی اس گوشے سے ہنسی کی آواز آتی ہے تو کبھی اُس گوشے سے ___ جیسے ہی مَیں نے مضمون ختم کیا، مرزا سے شکایت کی کہ میرے مضمون پر تمہارے دفتر کے لوگوں نے یوں بالاقساط ہنسنے کی سازش کیوں کی؟۔ اس پر مرزا نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ''یار تم کیا جانو کہ دفتری قواعد کیا ہوتے ہیں۔ ہم تو بس تھرو پراپر چینل ہنس رہے تھے۔ تمہارے مضمون پر پہلے ہمارے سکرٹری صاحب ہنستے تھے، اس کے بعد ڈپٹی سکرٹریز کے ہنسنے کی باری آتی تھی۔ پھر اسسٹنٹ سیکرٹریز ہنستے تھے اور تب کہیں یہ ہنسی سُپرنٹنڈنٹس تک پہنچتی تھی۔ اور تم جانتے ہو کہ سُپرنٹنڈنٹس کسی بھی معاملہ کو دبادینے میں کتنی مہارت رکھتے ہیں۔ اگر خوش قسمتی سے سُپرنٹنڈنٹس ہنس دیتے تو پھر ہم کلرکوں کی باری آتی تھی۔''

مَیں نے کہا: ''یار ہنسی تو ایک بے ساختہ عمل ہے، یہ تو انگلش چینل کو بھی عبور کرسکتی ہے۔ تھرو پراپر چینل کی کیا اہمیت ہے۔''

بولے: ''تمہیں کیا معلوم کہ دفتری قواعد کی رُو سے آدمی، انگلش چینل کو تو بآسانی عبور کرسکتا ہے لیکن تھرو پراپر چینل کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔''

مرزا زندگی بھر تھرو پراپر چینل کے چکّر میں پھنسے رہے اور اس حد تک پھنسے رہے کہ اگر گھر میں اُن کا سب سے چھوٹا بچّہ شرارت کرتا تو اسے تھرو پراپر چینل ڈانٹنے کے لیے وہ پہلے اپنی بیوی کو ڈانٹتے پھر بڑے لڑکے کو اور علی الترتیب اپنی ساری اولادوں کے گالوں پر طمانچے رسید کرتے ہوئے اپنے چھوٹے بچے کے گال تک پہنچتے تھے۔

مرزا یہ سمجھتے تھے کہ دُنیا کا ہر کام ''روٹین کورس'' میں ہوتا ہے۔ اُن کے سامنے دُنیا کا کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو اسے روٹین کورس کے حوالے کر کے مطمئن ہو جایا کرتے تھے۔ اسی روٹین کورس میں مرزا نے گیارہ بچے پیدا کیے۔ اسی روٹین کورس میں وہ اپنی بیوی سے مسلسل پچیس برس تک لڑتے جھگڑتے رہے۔ اسی روٹین کورس میں وہ دس ہزار کے مقروض ہو گئے۔ غرض مرزا تمیں ۳۰ سال تک ہر روز ایک ہی قسم کا کام انجام دیتے ہوئے خود ایک روٹین کورس میں تبدیل ہو گئے تھے۔ مرزا کا سب سے بڑا سرکاری فریضہ یہ تھا کہ ہر روز رجسٹر حاضری میں دستخط کریں۔ رجسٹر حاضری میں دستخط کرنے سے پہلے مرزا کی حالت بالکل وہی ہوتی تھی جو انڈا دینے سے پہلے مُرغی کی ہُوا کرتی ہے۔ رجسٹر حاضری میں دستخط کر دینے کے بعد مرزا یوں سمجھتے تھے جیسے وہ دن بھر کے سارے فرائضِ منصبی سے عُہدہ برآ ہو چکے ہوں۔

مَیں نے ایک دن ان سے پوچھا: ''بھئی جب تم کوئی کام کرتے ہی نہیں ہو تو پھر رجسٹر حاضری میں دستخط کرنے کا تکلف کیوں کرتے ہو؟''

وہ بولے: ''یار مَیں کام کرنے کے لیے رجسٹر حاضری میں دستخط نہیں کرتا بلکہ دستخط کرنے کو ہی سب سے بڑا کام سمجھتا ہوں۔ مَیں تو رجسٹر میں دستخط صرف اس لیے کرتا ہوں کہ اس طرح دُنیا میں میرے موجود رہنے کا کوئی ثبوت تو باقی رہے، ورنہ تاریخ کے اتنے بڑے دھارے میں اور اتنی بڑی کائنات میں کون یہ دیکھتا ہے کہ مجھ جیسا اَدنیٰ کلرک زندہ بھی ہے یا مر گیا۔ مَیں تو صرف اپنے زندہ رہنے کی حاضری ڈلواتا ہوں۔ یوں بھی حکومت جو تنخواہ مجھے دیتی ہے اس میں آدمی صرف دستخط ہی کر سکتا ہے۔ اس سے زیادہ کچھ کرنے کا معاوضہ الگ ہوتا ہے جو حکومت مجھے نہیں دیتی۔ اب تم ہی بتاؤ کہ مَیں کیا کروں؟''

رجسٹر حاضری میں دستخط کرنے کے بعد، مرزا کو ہمیشہ بڑی شدت سے چائے کی طلب ہوا کرتی تھی، لہٰذا وہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے نکل جاتے جو انہیں چائے پلا سکے۔ جب بارہ بجے وہ اپنی سیٹ پر پہنچتے تو انہیں لنچ کا خیال آنے لگتا تھا۔ درمیانی وقفہ میں وہ اپنی فائلوں پر سے گرد جھاڑتے اور انہیں سونگھ سونگھ کر پھر اپنی جگہ پر رکھ دیتے تھے۔ مرزا کے پاس فائلیں اتنے طویل عرصہ تک رہا کرتی تھیں کہ اُن کی اصل بُو تو کہیں غائب ہو جاتی تھی اور اُن میں سے مرزا کی بُو آنے لگتی تھی۔ ان کے ساتھی صرف فائلوں کو سونگھ کر یہ پتا چلا لیا کرتے تھے

کہ کون سی فائل مرزا کی ہے اور کون سی نہیں۔

فائلوں کی گرد جھاڑنے سے فرصت ملتی تو وہ تھوڑی دیر کے لیے اپنی کُرسی پر محض اس خیال سے بیٹھ جاتے کہ اس عمل سے بھی اُن کی کُرسی صاف ہو جایا کرتی تھی۔ کُرسی کے صاف ہونے تک لنچ کا وقفہ آ جاتا تھا اور مرزا اپنی ٹوپی میز پر چھوڑ کر لنچ کے لئے نکل جاتے تھے۔

میں مرزا سے ملنے جب بھی اُن کے دفتر جاتا تو ہمیشہ اُن کی ٹوپی سے ہی ملاقات ہوا کرتی تھی۔ میں اکثر اس ٹوپی کو اُٹھا کر دیکھ لیتا کہ شاید مرزا ٹوپی کے نیچے موجود ہوں۔ مگر مجھے ٹوپی ہمیشہ خالی ہی ملی۔

مرزا کا لنچ دُنیا کا طویل ترین لنچ ہُوا کرتا تھا۔ حالاں کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مرزا کے توشے میں دو سے زیادہ چپاتیاں نہیں ہوا کرتی تھیں، بلکہ اکثر اوقات تو وہ اپنے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے خالی توشہ دان ہی لایا کرتے تھے۔

میں اُن سے پوچھتا: ”مرزا! دو چپاتیاں کھانے کے لیے تمہیں تین گھنٹے کیوں درکار ہوتے ہیں؟“

اس پر وہ کہتے: ”بھئی دو چپاتیاں تو میں دو منٹ میں کھالیتا ہوں لیکن بعد کے سارے وقت میں جگالی کرتا رہتا ہوں۔ آخر غذا کو ہضم کرنے کے لئے بھی تو کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔“

مرزا کے لنچ سے واپس آنے تک چار بج جایا کرتے تھے اور یہ وقت حالاتِ حاضرہ پر تبادلۂ خیال کرنے کے لئے بہت موزوں ہوتا ہے اور پھر مرزا کو گھر واپس جانے کی تیاری بھی تو کرنی پڑتی تھی۔ اُن کی نظر ہمیشہ گھڑی پر لگی رہتی۔ دِن کے کسی بھی عرصہ میں اگر کوئی اُن سے وقت پوچھتا تو مرزا اپنی گھڑی کی طرف دیکھ کر نہایت وثوق سے کہتے: ”بھئی وقت کیا پوچھتے ہو، دفتر کے برخواست ہونے میں ابھی پورے چار گھنٹے پچیس منٹ باقی ہیں۔“

مرزا نے ساری زندگی اسی طرح گزاری۔ دفتر کے برخواست ہونے کا وقت دیکھ دیکھ کر۔ لیکن انہوں نے کبھی گھڑی میں جھانک کر یہ نہ دیکھا کہ ایک دِن وہ خود بھی دفتر سے برخواست ہونے والے ہیں۔

مرزا کی میز پر بھانت بھانت کی فائلیں رکھی رہتی تھیں اور اُن کا بیان تھا کہ فائلوں

کے اس انبار سے اُن کا کوئی تعلق نہیں، کیوں کہ یہ فائلیں اُن کے یہاں آنے سے پہلے ہی میز پر رکھی ہوئی تھیں، وہ کہا کرتے کہ اپنے بزرگوں کی نشانیوں کو جوں کا توں برقرار رکھنا ہم سب کا اوّلین فرض ہے۔ دفتر میں کوئی بھی فائل کہیں گم ہو جاتی تو وہ بالآخر مرزا کی میز پر مل جاتی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ دفتر کی گم شدہ فائلوں کے انچارج ہیں۔ اُن کی میز پر فائلوں کا اتنا انبار تھا کہ ایک دن جب انہوں نے ان فائلوں کو محافظ خانہ میں بھجوانے کی تجویز پیش کی تو محافظ خانے کے انچارج نے انہیں منع کرتے ہوئے لکھا کہ آپ اپنی فائلیں محافظ خانے میں بھجوانے کا تکلّف کیوں کرتے ہیں۔ مَیں خود اپنا محافظ خانہ آپ کے پاس بھیج دُوں گا۔ وہ جب بھی ان فائلوں کے انبار میں بیٹھ جاتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے وہ کسی خندق میں گر کر باہر نکلنے کی ساری کوششوں میں ناکام ہو گئے ہوں۔ مرزا زندگی بھر اسی خندق میں گھرے رہے اور کبھی باہر نہ نکل سکے۔

مرزا Casual Leave (رخصتِ اتفاقی) لینے میں بڑی مہارت رکھتے تھے۔ یوں بھی وہ ہمیشہ بیمار رہا کرتے تھے اور چوں کہ بیماری ان کے لیے ایک ''اتفاق'' نہیں بلکہ ایک ''مستقل ساتھی'' بن گئی تھی، اسی لیے وہ اس سلسلے میں رخصتِ اتفاقی سے استفادہ نہیں کرتے تھے۔ ایک دِن انہوں نے اپنے دفتر کو اس قسم کی رخصت کی درخواست بھجوائی کہ:

> ''حضور والا، آج ناچیز کی طبیعت اتفاق سے بہتر ہے لہٰذا
> فِدوی آج زندگی کا کچھ لطف اٹھانا چاہتا ہے۔ آج اگر
> ایک دن کی رخصت اتفاقی منظور کی جائے تو فدوی آپ
> کا احسان مند رہے گا۔''

لیکن مرزا کی رخصتِ اتفاقی منظور نہیں ہوئی۔ اس کے بعد سے مرزا نے رخصتِ اتفاقی کے حصُول کے لیے باری باری سے اپنے رشتہ داروں کو دُوسری دُنیا میں بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ چناں چہ اس کوشش میں انہوں نے اپنے والد کو چار مرتبہ، والدہ کو دو مرتبہ، نانی کو دس مرتبہ اور دادی کو سولہ مرتبہ جامِ شہادت نوش کروایا۔ دفتر والے حیران رہتے تھے کہ آخر مرزا کے اتنے سارے والد اور اتنی ساری والدائیں کہاں سے آ گئیں۔ اس کے جواب میں وہ کہتے۔ ''بھئی مَیں خود اپنے باپ کو پیدا کرتا ہوں اور رخصتِ اتفاقی کے وقت اسے مار دیتا

ہوں۔ دفتری قواعد کی پابندی کے لیے آدمی کو کیا نہیں کرنا پڑتا۔"

اپنی بیماری کے دوران میں مرزا پابندی سے دفتر آیا کرتے تھے۔ کیوں کہ اُن کا خیال تھا کہ اگر بیماری کے سبب وہ رخصت لے کر گھر میں بیٹھ رہیں تو ان کی خانگی ذمہ داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے اور بیوی اُن سے گھر کے کئی پینڈنگ کام کرواتی ہے۔ ایک مرتبہ مرزا نے اپنے کسی خانگی کام کے سلسلے میں دو مہینوں کی رخصتِ خاص حاصل کی تھی۔ لیکن ابھی رخصت کے آٹھ دِن بھی نہیں گزرے تھے کہ دفتر میں مرزا کی ایک درخواست طبّی صداقت نامے کے ساتھ پہنچی جس میں لکھا تھا:

"حضور والا! فدوی نے اپنے بعض خانگی اُمور کے سلسلے میں دو مہینوں کی رخصت حاصل کی تھی لیکن اسی اثنا میں فدوی کی صحت کافی خراب ہوگئی ہے۔ ڈاکٹروں نے مشورہ دیا ہے کہ فدوی مکمل آرام کرے ورنہ جان کا خطرہ ہے۔ لہٰذا استدعا ہے کہ فدوی کی رخصت کو منسوخ فرماتے ہوئے آج ہی سے رجوع بکار ہونے کی منظوری دی جائے۔ ڈاکٹر کا طبّی 'صداقت نامہ' بملاحظہ عالی پیش ہے۔"

مرزا کی کامیاب تیس سالہ ملازمت کا راز صرف یہی تھا کہ وہ اپنے عہدہ دارانِ بالا کو خوش رکھنے کا فن خوب جانتے تھے۔ عہدہ درانِ بالا کے دُکھ سُکھ میں وہ ہمیشہ ضرورت سے زیادہ شریک رہا کرتے تھے۔ اگر اُن کے کسی عہدہ دار کا لڑکا کسی امتحان میں کامیاب ہوتا تو یوں اظہارِ مسرّت کرتے جیسے یہ کامیابی خود اُن کے لڑکے کے حصّے میں آئی ہو۔ مَیں لاکھ منع کرتا کہ مرزا اپنے عہدہ داروں کے دُکھ سُکھ میں اتنا زیادہ شریک نہ رہا کرو کہ کسی دن نقصان بھی پہنچ سکتا ہے، مگر وہ نہ مانتے۔ چناں چہ ایک بار انہیں اس کی سزا بھی مل گئی۔ ہوا یوں کہ اُن کے متعلقہ اسسٹنٹ سکریٹری کی بیوی کا کسی عارضہ میں انتقال ہوا تو مرزا اس خبر کو سُن کر تقریباً بے ہوش ہو گئے اور رو رو کر بُرا حال کر لیا۔ اسسٹنٹ سکریٹری کی بیوی کا نام لیتے جاتے تھے اور آہیں بھرتے جاتے تھے۔ اُن کی اس مجنونانہ حالت پر اسسٹنٹ سکریٹری بھی دنگ رہ گیا۔ چناں چہ دُوسرے ہی دن اس نے مرزا سے ایکسپلینیشن (Explanation) طلب کیا کہ آخر میری بیوی کے انتقال پر تمہیں اس قدر آنسو بہانے کی کیا ضرورت تھی۔ اگر صحیح صحیح وضاحت پیش نہ کرو گے تو معطّل کر دیئے جاؤ گے۔ مرزا بہت پریشان ہوئے اور بالآخر

رخصت لے کر گھر بیٹھ گئے، اور اسسٹنٹ سکریٹری کا تبادلہ ہونے کے بعد ہی دفتر آسکے۔

مرزا اپنے عہدہ دارانِ بالا کے پاس تحفے تحائف پہنچانے میں بھی بڑی مہارت رکھتے تھے۔ اس معاملہ میں ان کا طریقۂ کار یہ تھا کہ وہ کسی شیرینی فروش کے پاس سے مٹھائی خریدتے اور اپنے عہدہ دار کے گھر پر پہنچ کر کہتے۔ ''صاحب! لکھنؤ سے میرے بھائی نے مٹھائی بھجوائی ہے، سوچا کہ آپ کی خدمت میں بھی تھوڑی سی مٹھائی پیش کردوں۔''

ایک بار تو انہوں نے ایک عہدہ دار کے گھر پر ایک بھینس لے جاکر باندھ دی۔ جب اس سلسلے میں استفسار کیا گیا تو بولے۔ ''حضور، میرے گھر میں تین چار بھینسیں بے کار پڑی سڑ رہی تھیں، اُن کا کوئی مصرف سمجھ میں نہ آتا تھا۔ سوچا کہ ایک بھینس آپ کی خدمت میں پیش کردوں۔ ایک غریب آدمی کا تحفہ ہے اسے قبول کیجئے۔''

مَیں نے مرزا کو اس بات پر ڈانٹا کہ اپنے عہدہ دار کو تحفہ میں بھینس دینے کی کیا تُک ہے؟ — بولے۔ ''میاں زمانہ ترقی کر گیا ہے۔ اب مکھن لگانے کے پُرانے طریقے بھی بدل گئے ہیں۔ بھینس کا تحفہ تو مکھن لگانے کا بالواسطہ طریقہ ہے کہ خود دُودھ دوہ کر مکھن نکالو اور خود ہی اُسے لگالو۔''

پہلی تاریخ آتی تھی تو مرزا سے پہلے مرزا کے قرض خواہ دفتر پہنچ جاتے تھے۔ وہ اپنے قرض خواہوں کی بڑی خاطر مدارات کرتے اور ان کے ساتھ کچھ ایسی ہوشیاری سے پیش آتے تھے کہ بے چاروں کی زبان پر اپنا قرض مانگنے کی بات تک نہ آتی تھی۔ وہ انہیں اپنی چکنی چپڑی باتوں میں لاکر نہ صرف پچھلے قرض کی ادائیگی کی بات کو ٹال جاتے تھے بلکہ ان سے نیا قرض بھی حاصل کرلیتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مرزا کے اکثر قرض خواہ ایک بار انہیں قرض دینے کے بعد اُن سے منہ چُھپانا زیادہ مناسب سمجھتے تھے۔ میں نے یہ منظر بھی دیکھا ہے کہ جب مرزا سڑک پر نکلتے تو اُن کے قرض خواہ اِدھر اُدھر گلیوں میں بھاگ جاتے تھے اور دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہوجایا کرتی تھی۔ اس بات سے آپ اندازہ لگاسکتے ہیں کہ مرزا کے قرض خواہوں کی تعداد کتنی زیادہ تھی۔ مَیں اُن سے کہتا کہ اگر تم اپنے قرض خواہوں کا ایک حلقۂ انتخاب بنانے میں کامیاب ہوسکو تو تمہارا رُکنِ اسمبلی بن جانا یقینی ہے۔ مگر مرزا کو تو کلرکی عادت پڑگئی تھی۔

مرزا میرا بہت زیادہ خیال رکھتے تھے۔ جب بھی ملاقات ہوتی تو میری خاطر تواضع پر بے دریغ رقم خرچ کیا کرتے تھے۔ مَیں سمجھاتا۔ ''مرزا تم ایک کلرک ہو، فضول خرچی کیوں کرتے ہو؟''

وہ کہتے۔ ''یار۔ بخدا میں اپنی کمائی سے فضول خرچی نہیں کرتا۔ تم فکر نہ کرو۔ میری جیب پر کوئی بار نہیں پڑتا۔ مَیں تو لوگوں سے قرض لاتا ہوں اور تم پر خرچ کرتا ہوں، بھلا میرا کیا جاتا ہے۔ مَیں تو قُدرت کا وہ وسیلہ ہوں جس کے توسّط سے، جس کا رزق اسے پہنچ جایا کرتا ہے۔ اپنا کام تو صِرف ایک دَرمیانی شخص کا فریضہ انجام دینا ہے۔''

مرزا دوسری تاریخ ہی سے اپنے ساتھیوں سے قرض مانگنا شروع کر دیتے تھے۔ مہینہ کی آخری تاریخیں مرزا کے حق میں دُوسری تاریخ ہی سے شروع ہو جایا کرتی تھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ مہینہ کی ساری ابتدائی تاریخیں تو پہلی تاریخ کو ہی گزر جاتی ہیں اور بقیہ سارے مہینے میں صرف ایک ہی تاریخ سُبک خرامی سے گزرتی ہے۔ وہ ہے ۳۱ یا ۳۰ تاریخ۔

مرزا کو قرض حاصل کرنے کے نت نئے طریقے معلوم تھے۔ مَیں تو کہتا ہوں کہ اگر وہ قرض حاصِل کرنے کے طریقوں پر ایک کتاب لکھ ڈالتے تو ہاتھوں ہاتھ بِک جاتی اور مرزا کو اتنی رائلٹی تو ضرور مِل جاتی کہ وہ اپنے قرض خواہوں کی پائی پائی کا حساب چکا دیتے۔

مرزا زندگی بھر اپنی ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ اُن کے کئی ساتھی ترقی کر کے گزیٹیڈ بن گئے مگر مرزا آخر وقت تک پُوری مستقل مزاجی کے ساتھ اسی عُہدے پر ڈٹے رہے، جس پر اُن کا ابتدائی تقرر ہُوا تھا۔ وہ اپنے ان ساتھیوں کا بڑی حقارت سے ذکر کرتے تھے، جنہیں ترقی مِل چکی تھی۔ وہ اندر ہی اندر حسد کی آگ میں جلتے رہتے۔ اُن کی آنکھوں میں وہ منظر ہمیشہ تازہ رہتا جب اُن کے ایک ساتھی کو گزیٹیڈ عُہدے پر ترقی کا آرڈر ملا تھا۔ اس آرڈر کو پاتے ہی اُن کے ساتھی نے کسی سے کچھ نہیں کہا۔ مرزا اُس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے رہے۔ وہ بس اچانک اپنی کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا اور آرڈر کو اپنے ہاتھ میں پکڑ کر اپنے سارے نان گزیٹیڈ ساتھیوں پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا اور پوری شان کے ساتھ چلتا ہوا گزیٹیڈ آفیسرس کے 'ٹائلیٹ رُوم' میں داخل ہوگیا۔ یہ حرکت اس بات کے اعلان کی حیثیت رکھتی تھی کہ وہ گزیٹیڈ بن گیا ہے۔

مرزا بھی زندگی بھر گزیٹیڈ آفیسرس کے ٹائیلٹ روم سے استفادہ کرنے کی حسرت اپنے دل میں پالتے رہے، لیکن بالآخر اُن کے وظیفے پر سُبکدوش ہونے کا وقت آ گیا۔ جس روز وہ وظیفہ پر علیٰحدہ ہوئے، اُس روز انہوں نے سارے دفتر میں گھوم کر سارے عہدے داروں سے ملاقات کی۔ حتیٰ کہ اپنے سکریٹری کے کمرے میں بھی چلے گئے، اور جب سب سے رخصت ہو کر دفتر سے نکلنے لگے تو تھوڑی دیر کے لئے گزیٹیڈ آفیسرس کے ٹائیلٹ رُوم کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اچانک اُن کی آنکھوں سے ایک جھیل سی بہہ نکلی۔ ٹائیلٹ رُوم پر ایک مغموم سی نگاہ ڈالی اور ایک طویل و عریض آہ بھر کر کہا:

اے بَسا آرزُو کہ خاک شُدہ

(قصہ مختصر۔ ۱۹۷۲ء)

حیدر آباد کا جوذکر کیا

صاحبو! ہمیں حیدر آباد کو چھوڑے ہوئے تیرہ برس بیت گئے۔ اب ہم زندگی میں ٹھوکریں کھانے کے لیے حیدر آباد کی نہیں بلکہ دہلی کی سڑکوں کو زحمت دیتے ہیں۔ پھر بھی سال میں دو تین موقعے ایسے ضرور آجاتے ہیں جب ہم حیدر آباد کی سڑکوں پر پھر سے ٹھوکریں کھانے کے لیے آجاتے ہیں کیوں کہ ٹھوکریں کھانے کے لیے اس سے بہتر سڑکیں کسی اور شہر میں دستیاب نہیں ہیں۔ ان تیرہ برسوں میں حیدر آباد میں کیا تبدیلی آئی اور کیا نہیں آئی یہ ہم نہیں جانتے۔ بس اتنا جانتے ہیں کہ تیرہ برس پہلے ہمارے گھر کے سامنے مین ہول کا جوڈھکن غائب تھا وہ ہنوز غائب ہے۔ ہمارے گھر کے سامنے ایک پبلک نل بھی تھا بلکہ اب بھی ہے۔ تیرہ برس پہلے عوام کو اس نل کی ٹوٹنی کو بار بار کھولنے میں دُشواری پیش آتی تھی لہٰذا کسی نے عوام کی سہولت کی خاطر اس کی ٹوٹنی غائب کردی تھی۔ یہ ٹوٹنی ابھی تک غائب ہے۔

ہمارے گھر کے سامنے بیس برس پہلے ایک دیوار پر منجن بنانے والی ایک کمپنی نے اپنے منجن کا اشتہار جلی حروف میں لکھوایا تھا۔ ہم یہ منجن تو استعمال نہیں کرتے تھے مگر اجنبیوں کو اپنے گھر کا پتہ سمجھانے کے لیے اس اشتہار کو ضرور استعمال کرتے تھے۔ یہ اشتہار اب بھی وہیں موجود ہے۔ اگرچہ منجن بنانے والی کمپنی کب کی مرچکی ہے مگر ہمارا پتہ ابھی تک زندہ ہے۔ اس منجن کو استعمال کرنے والے بھی شاید اب اس دنیا میں زندہ نہیں ہیں۔ اگر یہ مرے نہیں ہیں تو اُن کے دانت ضرور گر گئے ہوں گے کیونکہ منجن کی خاصیت بلکہ خوبی ہی کچھ ایسی تھی۔

یوں تو کہنے کو حیدر آباد جوں کا توں موجود و محفوظ ہے لیکن اس کے باوجود ادھر چند برسوں سے جب بھی ہم حیدر آباد آتے ہیں تو حضرت جگر مراد آبادی کی طرح ہمیں بھی یہاں کی ہر شے میں کسی شے کی کمی نظر آتی ہے۔ حیدر آباد وہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اب حیدر آباد میں ہمیں خود حیدر آباد کی کمی نظر آتی ہے۔ تیرہ برس پہلے شام کو معظم جاہی مارکیٹ پر نکلتے تھے تو ہر چند قدم کے بعد کوئی ملنے والا پیچھے سے ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا تھا کہ ''بھیا! کہاں چلے؟ کیسے ہو؟ کس حال میں ہو؟''۔ اب معظم جاہی مارکیٹ پر نکلتے ہیں تو اس کی سڑک تو وہی ہے مگر وہ ہاتھ جو پیچھے سے ہمارے کندھے پکڑ لیتا تھا کہیں غائب ہو گیا ہے۔ بہت ہوا تو اتنا ہوتا ہے کہ کوئی رکشا والا اچانک ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھکا دے دیتا ہے کہ ''ابے سڑک پر کدھر چلتا ہے۔ فٹ پاتھ پر چل۔'' فٹ پاتھ پر جاتے ہیں تو کوئی بزرگ ہمارے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے ہیں ''ارے میاں! کیا اندھے ہو گئے ہو۔ دیکھتے نہیں فٹ پاتھ پر پردہ دار خواتین بیٹھی ہیں۔ سڑک پر جاؤ۔'' ادھر کئی برسوں سے ہم حیدر آباد میں اس محبت بھرے ہاتھ کی تلاش میں ہیں جس کی اچانک گرمی ہمیں اس شہر سے جوڑ دیتی تھی۔

ہمیں یاد ہے کہ پچھلے سال مارچ میں لندن کی ایک سرد شام کو آکسفورڈ اسٹریٹ سے گذر رہے تھے کہ ہو بہو ایسا ہی ایک نرم گرم ہاتھ ہمارے کندھے پر رکھا گیا۔ پیچھے پلٹے بغیر ایک لمحہ کے لیے سوچتے رہے کہ ایک اجنبی شہر میں یہ کیسا اجنبی ہاتھ ہے جس کا لمس جانا پہچانا سا لگتا ہے۔ ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری نوجوانی کا دوست مجید اپنے بالوں میں چاندی سجائے کھڑا ہے۔ اس نے ہم سے بے ساختہ بغلگیر ہوتے ہوئے کہا ''ارے تم! تم آکسفورڈ اسٹریٹ پر کیسے آ گئے؟''

ہم نے کہا ''یار! میں لندن کی آکسفورڈ اسٹریٹ پر کہاں ہوں۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے میں کئی برسوں بعد حیدر آباد کی عابد روڈ پر کھڑا ہوں۔ میں تو تمہیں عابد روڈ پر ڈھونڈتا رہا اور تم لندن میں کیا کر رہے ہو؟''

مجید بولا ''بیس برس سے لندن میں ہوں اور تم مجھے ابھی تک عابد روڈ پر ڈھونڈتے ہو۔ عجیب احمق ہو۔ اچھا یہ بتاؤ لندن میں کہاں ٹھہرے ہو۔ اپنا پتہ دو۔ ایک دن میرے گھر چلو۔ خالص حیدر آبادی کھانا کھلاؤں گا۔'' ہم نے کہا ''یار لندن آئے ہوئے بیس دن ہو گئے۔

ان بیس دنوں میں اتنے حیدرآبادی کھانے کھائے ہیں کہ خود حیدرآباد میں بھی پچھلے تیرہ برسوں میں نہ کھائے ہوں گے۔ کھلانا ہی ہو تو انگریزی کھانا کھلاؤ۔ میں تو انگریزی کھانا کھانے کے لئے ترس گیا ہوں۔"

مجید بولا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ دو حیدرآبادی پردیس میں ملیں اور بگھارے بینگن بیچ میں نہ آئیں۔"

☆

سچ پوچھئے تو پچھلے برس یوروپ، امریکہ اور کینیڈا کے دورہ کے بعد ہی ہمیں یہ احساس ہوا کہ جس حیدرآباد کو ہم حیدرآباد کی سڑکوں پر تلاش کرتے پھرتے ہیں وہ تو اب لندن کی سڑکوں پر ملتا ہے۔ پیرس کی گلیوں میں پایا جاتا ہے۔ شکاگو کے چنچل گوڑہ میں ملتا ہے۔ ٹورانٹو کے بنجارہ ہلز میں پایا جاتا ہے۔

ہمیں اس وقت پچھلے سال ۱۰/ مارچ کی وہ شام یاد آرہی ہے جب جنوبی لندن کے ایک ہال میں ہمارے دوست حبیب حیدرآبادی کی بیٹی کی شادی مقرر تھی۔ ہم تقریب عقد میں پہنچے تو یوں لگا جیسے ہم کئی برس بعد حیدرآباد واپس آئے ہیں۔ وہ سارے حیدرآبادی جو حیدرآباد میں ہم سے منہ چھپاتے تھے وہ سب کے سب وہاں موجود تھے۔ حیدرآبادی شیروانیوں میں ملبوس ان حیدرآبادیوں کو دوبارہ زندہ و سلامت پاکر ہمیں کتنی خوشی ہوئی، اس کا حال ہم کیا بیان کریں۔

حیدرآبادی کھانوں اور شمامتہ العنبر کی ملی جلی خوشبوؤں میں بسے حیدرآباد کی بازیافت ہمارے لیے ایک انوکھا تجربہ تھی۔ ہمارے ایک حیدرآبادی دوست جن کی مغفرت کے لیے ہم پچھلے کئی برسوں سے دُعا کرتے آرہے ہیں، وہ ہمیں وہاں نہ صرف زندہ سلامت ملے بلکہ اپنی تیسری انگریز بیوی کا تعارف بھی ہم سے کروایا۔ معلوم ہوا پچھلی دو انگریز بیویوں میں سے ایک تو اللہ کو پیاری ہوگئی اور دوسری کسی اور کو پیاری ہوگئی۔ حبیب حیدرآبادی کی بیٹی کی شادی کی جس تقریب کا ہم ذکر کررہے ہیں اس کی خصوصیت یہ تھی کہ دولہا انگریز تھا اور

ایک حیدرآبادی لڑکی سے شادی کرنے کی کوشش میں مسلمان ہوگیا تھا۔ اس کے اصلی انگریزی نام کے ساتھ اس کے نئے اسلامی نام کو جوڑنے سے اس کا نیا نام ''الفریڈ عرفان'' بن گیا تھا۔ چنانچہ شادی کے کارڈ میں دولہا کا نام ''نورچشم الفریڈ عرفان'' لکھا گیا تھا۔ شادی اسلامی طریقہ سے ہوتی تو کوئی بات بھی تھی مگر یہاں شادی حیدرآبادی رسومات کے مطابق ہورہی تھی۔ دلہن کے ماموں اور ہمارے دوست ڈاکٹر مغنی تبسّم نورچشم الفریڈ عرفان کی شادی کا سہرا حیدرآباد سے بطورِ خاص بنوا کر لے آئے تھے۔ سہرے کو صحیح و سالم حالت میں لندن لانے کی جستجو میں مغنی تبسّم کا سوٹ کیس سیرین ایرلائینس کے طیارے میں ہی رہ گیا تھا اور وہ جب سے لندن آئے تھے ایک ہی سوٹ پہن کر شادی کی تقاریب میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے۔ اس حیدرآبادی سہرے کی خوبی یہ تھی کہ اس میں سے دولہا کا چہرہ بالکل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ہمارے حیدرآبادی دولہے کبھی کبھی سہرے کو اپنے چہرے سے ہٹا کر باراتیوں کو دیکھ بھی لیتے ہیں مگر نورچشم الفریڈ عرفان نے حیدرآبادی رسومات کا اتنا پاس و لحاظ رکھا کہ کسی نامحرم کی نظر اپنے چہرے پر پڑنے نہیں دی۔ دولہا کے انگریز رشتہ داروں اور احباب کی سہولت کی خاطر حیدرآبادی رسومات کی نزاکتوں کے بارے میں سلیس انگریزی زبان میں ایک تقریر بھی کی گئی۔ انگریزوں کو بتایا گیا کہ عقد کے بعد جب چھوارے اُچھالے جائیں تو انہیں لوٹا جائے۔ انگریزوں کی نوآبادیات جب سے ختم ہوئی ہیں وہ لوٹ مار کے عادی نہیں رہے۔ مگر چھواروں کی لوٹ مار میں اُن کی فطری صلاحیتیں کام کر گئیں۔ ہم نے دو بادام، ایک کھجور اور مصری کی ایک ڈلی لوٹی تھی۔ ہم لوٹ کا یہ مال ہاتھ میں لیے بیٹھے تھے کہ ایک انگریز نے اچانک ہمارے ہاتھ کو زبردستی مروڑ کر یہ مالِ غنیمت حاصل کیا اور بھیڑ میں غائب ہوگیا۔ عقد کے بعد ہمارے دوست حبیب حیدرآبادی کی طرف سے عشائیہ کا انتظام تھا۔ عشائیہ کیا تھا حیدرآبادی کھانوں کی نمائش تھی۔ تین اقسام کی بریانی تھی۔ قمیاں، دہی کی چٹنی، کباب، بگھارے بینگن، دم کا مرغ، ڈبل کا میٹھا، خوبانیوں کا میٹھا، سویاں سب کچھ تھا۔ اس عشائیہ کی خوبی یہ تھی کہ یہ بلا لحاظ مذہب و ملّت سب کے لئے تھا۔ دولہا کے انگریز رشتہ داروں کی خدمت میں یہی حیدرآبادی کھانا پیش کیا گیا۔ لہٰذا ہم نے دیکھا کہ ایک انگریز دہی کی چٹنی میں ڈبل کا میٹھا ملا کر نہ صرف کھا رہا تھا بلکہ حیدرآبادی پکوان کی تعریف بھی کر رہا تھا۔ ایک انگریز کباب میں بگھارے

بینگن ملا کر کھا رہا تھا۔ ایک اور انگریز مرغ کی ٹانگ کی مدد سے خوبانیوں کا میٹھا کھا رہا تھا۔ انگریز جس طرح حیدرآبادی تہذیب کو کھا رہے تھے اسے دیکھ کر ہمارے منہ میں پانی بھر آ رہا تھا۔ ہمارے دوست مغنی تبسم نے کئی گھنٹوں کی محنت کے بعد مہمانوں کے لیے حیدرآبادی پان بھی بنا رکھے تھے۔ یہ پان کھانے کے بعد مہمانوں کو پیش کیے گئے۔ انگریزوں کو آسان انگریزی میں بتایا گیا کہ اگر پان کھانے کے بعد منہ سے لال رنگ کا تھوک نکلے تو اس سے پریشان ہو کر ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ انگریز تھوکنے کو بہت برا سمجھتے ہیں لیکن اس دن بہت سے انگریزوں کو پان کھانے کے بعد پہلی بار پتہ چلا کہ تھوکنا کس کو کہتے ہیں اور تھوکنے کے حیدرآبادی آداب کیا ہیں۔ ایک انگریز دیر سے محفل میں آیا۔ اس نے لوگوں کو پان کھاتے دیکھا تو کھاتا ہی چلا گیا۔ ہم نے سوچا یہ انگریز تو پان کا بہت شوقین معلوم ہوتا ہے مگر جب اس نے آستین چڑھا کر پان پر پان کھانا شروع کیا تو ڈرتے ڈرتے پوچھا ''بھیّا! کھانا وانا کھایا یا نہیں؟'' بہت حیرت کے ساتھ ہم سے پوچھنے لگا۔ ''کیا اس کھانے کے علاوہ اور بھی کچھ کھانے کا انتظام ہے۔''

غرض لندن میں قیام کے دوران میں ہم نے حیدرآبادی تہذیب کو جس طرح پروان چڑھتے دیکھا اس سے ہمارا دل باغ باغ ہو گیا۔

ہمارے دوست عامر موسوی اور عباس زیدی کے ہاں حیدرآبادی نہاری اور بکرے کی جتنی زبانیں کھائیں اتنی کبھی اور کہیں نہیں کھائیں۔ عامر موسوی نے ہمیں بتایا کہ حیدرآبادیوں کے لندن آنے سے پہلے انگریز اپنی زبان کی اہمیت سے تو واقف تھے لیکن بکرے کی زبان کی اہمیت اور افادیت سے نا آشنا تھے۔ انگریزوں نے اپنی زبان کے علاوہ بکرے کی زبان کی عزت کرنا حیدرآبادیوں سے ہی سیکھا۔ پہلے انگریز قصائی بکرے کی زبان کو پھینک دیتا تھا مگر اب حیدرآبادیوں کے انتظار میں سینت سینت کے ریفریجریٹر میں رکھتا ہے۔ اگر کوئی حیدرآبادی نہیں آتا تو خود کھا لیتا ہے۔ مانا کہ انگریزوں نے ہمیں بہت کچھ سکھایا مگر تم اس بات کو کیوں تسلیم نہیں کرتے کہ حیدرآبادیوں نے انہیں بکرے کی زبان کھانے کا گُر سکھایا۔ حیدرآبادیوں کے آنے سے پہلے انگریز دنیا کی ایک بڑی لذت سے محروم تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اب بعض انگریز بھی صبح کو کھچڑی، خاگینہ، آچار اور املی کی چٹنی، پاپڑ وغیرہ کھانے لگے

ہیں۔ لندن میں ہمارا قیام، قیام الدین کے ہاں تھا اور وہ لندن میں مقیم ہی اس لیے تھے کہ یہاں رہ کر خالص اشیاء کی مدد سے لذیذ حیدرآبادی کھانے بنائے جا سکتے ہیں۔

لندن تو خیر لندن ہے پیرس میں ہم چار دن کے قیام کے لیے اپنے دوست مسرور خورشید کے ہاں پہنچے تو انہوں نے جاتے ہی اپنا ریفریجریٹر کھول کر دکھا دیا کہ بھیا! میں نے اس میں پورے ایک ہفتہ کے حیدرآبادی کھانے پکا کر رکھ دیئے ہیں تم صرف چار دن کیوں رہتے ہو۔ ایک ہفتہ رہو۔ یہ رہی نہاری، یہ رہے بگھارے بینگن، یہ رہی دہی کی چٹنی، یہ رہی کھچڑی اور یہ رہی۔۔۔۔۔۔''

ہم نے اپنے اور اُن کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا'' خدا کے لیے اب حیدرآبادی کھانوں کا ذکر نہ کیجئے۔ مجھے اُبکائی آ رہی ہے۔ کیا حیدرآبادی تہذیب اب صرف پکوان میں ہی اٹک کر رہ گئی ہے۔''

بولے'' یہ بات ہے تو لو مجھ سے مخدوم کے شعر سنو۔ امجد حیدرآبادی کی رباعیات، شاذ تمکنت کے شعر سنو، میں تو ضرورت پڑنے پر کنول پرشاد کنول کے بھی شعر سنا سکتا ہوں۔''

مسرور خورشید کا گھر حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں سے بھرا پڑا ہے۔ گھر میں اتنی کتابیں ہیں کہ اُن کا پلنگ بڑی مشکل سے گھر میں سما پاتا ہے۔ پیرس میں ہماری آمد کے پیشِ نظر اپنا پلنگ انہوں نے ہمارے لیے خالی کر دیا تھا اور خود حیدرآبادی ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں پر سو جاتے تھے۔ رباعیات امجد کو سرہانے کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ فرہنگِ آصفیہ کو اسٹول کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ کھڑکی کو اچھی طرح بند کرنے کے لیے کلیات قلی قطب شاہ سے استفادہ کرتے تھے۔ حیدرآبادی تہذیب اُن کے لیے صرف کھانا ہی نہیں بلکہ اوڑھنا بچھونا بھی تھی۔ پیرس میں پہلے ہی دن پیرس کی سیر کروانے کے لیے ہمیں زمین دوز ٹرین ''میٹرو'' سے لے کر چلے تو بولے ''ذرا اس اسٹیشن کا نام پڑھیئے۔'' ہم نے رومن رسم الخط میں فرانسیسی نام کو پڑھنے کی کوشش کی تو پتہ چلا اسٹیشن کا نام ''بواسیر'' ہے۔ ہم نے کہا'' یہ اسٹیشن ہے یا بیماری۔ پیرس کی سیر کا آغاز ہی ہم غلط اسٹیشن سے کر رہے ہیں'' بولے ''کوئی فکر کی بات نہیں۔ ایفل ٹاور سے قریب آپ جس اگلے اسٹیشن پر اتریں گے۔ اس سے آپ کی پریشانی دور ہو جائے گی۔'' ایفل ٹاور سے قریب اسٹیشن پر اُترے تو مسرور خورشید نے

کہا "اب اس اسٹیشن کا نام پڑھیئے۔" ہم نے نام پڑھا تو تلفظ اس طرح ادا ہوا "بہرے حکیم"۔ ہنس کر بولے "جب ہم بواسیر سے اپنے حیدرآباد کے بہرے حکیم صاحب کے پاس پہنچ رہے ہیں تو اس میں ڈرنا کیسا۔ جو کوئی دار سے نکلے تو سوئے یار چلے!"

پیرس کی شاہراہ شانزالیزے پر چلتے ہوئے انہوں نے عابد روڈ کا حال پوچھا۔ مامارت کے گرجا گھر پر نوبت پہاڑ کی خیریت پوچھی، لووف کے میوزیم میں سالار جنگ میوزیم کی مزاج پرسی کی۔ وارسائی کے محل میں چومحلہ پیلیس کا حال دریافت کیا۔ ناترے دیم کے گرجا گھر پر آل سینٹس کے گرجا گھر کی خیریت پوچھی۔ ہم نے جواباً فرانس کے صدر مسٹر متراں کا حال پوچھا تو انہوں نے اپنے حیدرآبادی دوست نرسنگ راؤ کا حال پوچھا۔ حیدرآباد مسرور خورشید کو پیرس میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتا۔

ہم یوروپ کے حیدرآبادیوں کو نپٹا کر امریکہ پہنچے تو احساس ہوا کہ امریکہ میں شاید ہی کوئی ایسا شہر ہوگا جس میں حیدرآبادی آباد نہ ہوں۔ ہم اپنے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین اور ایک پاکستانی ڈاکٹر فرحت خاں کے ساتھ واشنگٹن سے ساحل میامی تک کے کئی ہزار میل کے سفر پر روانہ ہوئے تو امریکہ کی ریاست جارجیا سے گذرتے ہوئے ہمیں شام کے وقت ایک چھوٹا سا قصبہ دکھائی دیا۔ غالباً تلادیگا نام تھا اس کا۔ پشاور کے ڈاکٹر فرحت خاں کو یہ شکایت ہے کہ حیدرآبادی نہ صرف سارے امریکہ میں پھیلے ہوئے ہیں بلکہ اُن کی تعداد امریکہ کے اصلی باشندوں ریڈ انڈینس سے بھی زیادہ ہے۔ اگر کہیں سے پتھر بھی اٹھاؤ تو اس کے نیچے سے ایک حیدرآبادی فرشی سلام کرتا ہوا برآمد ہوتا ہے۔ ہم نے کہا "اس وقت ہم جس چھوٹے سے قصبہ سے گذر رہے ہیں اس کی آبادی ہزار دو ہزار نفوس پر مشتمل ہوگی اس میں تو کوئی حیدرآبادی نہیں ہوگا۔"

فرحت خاں بولے "لگایئے اسی بات پر شرط۔"

ہمارے بھائی ڈاکٹر اصغر حسین نے مداخلت کرتے ہوئے کہا "شرط نہ لگایئے، آپ نقصان میں رہیں گے۔ ہمیں آج کی رات اسی قصبہ میں رکنا ہے۔ میرا ایک حیدرآبادی دوست ڈاکٹر احمد یہاں رہتا ہے۔"

ڈاکٹر احمد جو چنچل گوڑہ کے رہنے والے ہیں اس چھوٹے سے قصبہ میں ایک ایسے

مکان میں رہتے ہیں جو محل سے کم نہیں۔ گھر کے باہر تین چار موٹریں کھڑی تھیں۔ بہت خوش ہوئے مگر ان سے زیادہ ان کے والد ہم سے مل کر خوش ہوئے جو چھ مہینوں سے امریکہ کے اس چھوٹے سے قصبہ میں رہ رہے تھے۔ کہنے لگے چھ مہینوں سے اپنے بیٹے کے سوائے کسی اور حیدرآبادی کی صورت نہیں دیکھی۔ میں تو امریکہ کی آسائشوں سے تنگ آ گیا ہوں۔ چنچل گوڑہ بہت یاد آتا ہے۔ ایک دو مہینوں میں واپس چلا جاؤں گا۔ دوسرے دن صبح کو وہ اپنے بیٹے کا مکان اور جائیداد بالتفصیل دکھانے کے لیے ہمیں لے گئے۔

ایک ٹیلہ پر کھڑے ہو کر انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''وہ جو پہاڑ آپ دیکھ رہے ہیں وہ میرے بیٹے کے ہیں۔ وہ جو بادلوں کے نیچے جنگل نظر آ رہے ہیں، وہ میرے بیٹے کے ہیں۔ یہ جو جھیل بہہ رہی ہے۔ وہ بھی میرے بیٹے کی ہے۔''

ہم نے بڑے میاں کی بات کو کاٹ کر کہا ''اور وہ جو آسمان پر سورج چمک رہا ہے وہ کس کا ہے؟''

فوراً اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولے ''نعوذ باللہ! اس سورج سے میرے بیٹے کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ کسی اور کا ہے۔''

شکاگو میں ہم اپنے سائنسداں دوست مظفر الدین فاروقی کے مہمان تھے۔ اُن کی اہلیہ نے پہلی ہی شام کو امباڑے کی بھاجی کھلا کر ہمیں حیرت زدہ کر دیا۔ پوچھا ''امباڑے کی بھاجی اور وہ بھی شکاگو میں۔''

بولیں ''جی نہیں۔ یہ کو ہیر سے آئی ہے۔ اسے بے وقت ضرورت کے لیے سُکھا کر رکھ لیا ہے۔''

مظفر الدین فاروقی بولے ''میں پچھلے چند برسوں سے اس بھاجی کو اپنے کچن گارڈن میں اُگانے کے تجربے کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ دو ایک برس بعد اس تجربہ میں کامیاب ہو جاؤں گا۔''

''اور اس ضمن میں شاید آپ کو سائنس کا نوبل انعام بھی مل جائے۔'' ہم نے ہنس کر کہا۔

شکاگو میں ہی ہمیں اپنے پرانے دوست عزیز الرحمٰن ملے جنہوں نے اپنے اطمینانِ

قلب کے لیے ٹھیٹ حیدر آبادی گالیوں کا ٹھیٹ انگریزی میں ترجمہ کر رکھا ہے جنہیں وہ آئے دن ہسپانوی ٹیکسی ڈرائیوروں کو پابندی سے دیتے رہتے ہیں۔ ہم نے پوچھا ''ہسپانوی ڈرائیور ناراض تو نہیں ہوتے ؟''

بولے '' سچ پوچھیئے تو حیدر آبادی گالیوں میں اتنی تجرید ہوتی ہے کہ یہ جب اُردو میں ہی بُری نہیں معلوم ہوتیں تو ترجمہ کی چھلنی سے گذرنے کے بعد انگریزی میں کیا بُری معلوم ہوں گی۔ میں نے تو بس اپنے اطمینان قلب کے لیے اُن کا ترجمہ کر رکھا ہے۔ چلو اپنے ڈھنگ سے گالی دے دی اور وطن والوں سے اپنا رشتہ بنائے رکھا''۔

ہمیں شکاگو کے چینچل گوڑہ میں بھی جانے کا موقع ملا۔ یہاں زیادہ تر وہی لوگ رہتے ہیں جو پہلے حیدر آباد کے چینچل گوڑہ میں رہتے تھے۔ اس میں اور حیدر آباد کے چینچل گوڑہ میں ہمیں کوئی مماثلت نظر نہیں آئی۔ ایک صاحب نے اسی چینچل گوڑہ میں کھانے پر بلایا تھا۔ ہم نے اُن سے پوچھا '' یہ کیسا چینچل گوڑہ ہے۔ جہاں بھینسیں نہیں بندھی ہوئی ہیں''

بولے '' بھینسیں تو ہمارے ذہنوں میں بندھی ہوئی ہیں''

پوچھا '' تو پھر دودھ بھی وہیں دیتی ہوں گی''

ایک آہ بھر کر بولے '' اب اس ذکر کو جانے دیجئے۔ کھانا شروع کیجئے۔ اللہ دیا ہے۔''

اچانک اس '' اللہ دیا'' کو سن کر ہمیں یقین آگیا کہ ہم سچ مچ حیدر آباد کے چینچل گوڑہ میں بیٹھے ہیں۔

ہم نے اُن صاحب سے کہا '' مگر ذرا سوچئے کہ اللہ نے آپ کو جو کچھ بھی دیا ہے وہ حیدر آباد سے کتنی دور لا کر دیا ہے۔''

اپنی آنکھوں میں آنسو لا کر بولے '' آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ اگر اللہ نے اس کا دسواں حصہ بھی ہمیں حیدر آباد میں دیا ہوتا تو ہم چینچل گوڑہ کی گلیاں چھوڑ کر یہاں کیوں آتے۔''

ہم نے بات کو اور آگے نہیں بڑھایا کیونکہ آنسو ان کی پلکوں پر چھلکنے کو بے قرار تھے۔ اور ہمیں یوں لگا جیسے حیدر آباد ایک شہر نہیں، پھیل کر کائنات بن گیا ہے۔

(الغرض ۔ ۱۹۸۵ء)

یونیسکو کی چھتری

وہ ہمیں ٹوکیو میں دوسرے دن ملی اور ہم نے اُسی دن اپنی بیوی کو خط لکھا'' وہ ہمیں آج ملی ہے۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے۔ اب ہمیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں اور اسی کے سائے میں رہنا ہے'' آٹھ دن بعد ہم اپنے ہوٹل میں گہری نیند سے لطف اندوز ہو رہے تھے کہ فون کی گھنٹی بجی۔ نیند سے جاگ کر فون کا ریسیور اٹھایا تو پتہ چلا کہ ہندوستان سے فون آیا ہے۔ دوسری طرف سے ہماری بیوی کی آواز آئی تو ہم نے بے ساختہ پوچھا'' ہیلو کیسی ہو؟ خیریت سے تو ہو نا؟''

ہماری بیوی نے کہا'' میری خیریت جائے بھاڑ میں۔ پہلے یہ بتاؤ اس وقت کمرے میں اکیلے ہو یا وہ بھی تمہارے ساتھ ہے۔''

ہم نے آنکھیں ملتے ہوئے پوچھا'' وہ کون؟۔ میں تو کمرے میں اکیلا رہتا ہوں۔ کیسی باتیں کرتی ہو۔ میری غریب الوطنی کا تو لحاظ کرو۔ پھر ایسی باتیں کرنے کے لیے کئی سمندر پار سے فون ملانے کی کیا ضرورت ہے۔''

بولیں'' یہ تمہاری آواز میں اتنا خمار کیوں ہے؟ ایک عجیب سی مستی کیوں ہے؟''

ہم نے کہا'' رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔ تمہارے فون کی گھنٹی پر جاگے ہیں۔ گہری نیند میں کیا اتنا خمار اور اتنی مستی بھی نہ آئے گی۔''

بولیں'' بالکل غلط۔ اس وقت تو رات کے صرف دس ہی بجے ہیں۔''

ہم نے بات کو کاٹ کر کہا ''ٹھیک ہے ہندوستان میں دس بجے ہوں گے مگر یہاں تو رات کا ڈیڑھ بجا ہے۔''

بولیں ''مجھے معلوم ہے کہ اب تمہارا وقت اور میرا وقت کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے پہلے ہی شبہ تھا۔ تمہارے لہجہ کی سرشاری بتا رہی ہے کہ وہ چنڈال اب بھی تمہارے کمرے میں ہی ہے۔''

ہم نے غصہ سے کہا ''یہ کیا مذاق ہے۔ تم کس چنڈال کا ذکر کر رہی ہو۔ جاپان میں کوئی چنڈال ونڈال نہیں رہتی۔''

بولیں ''اب تو تم اُدھر ہی کے گُن گاؤ گے۔ اسی لئے تو میں تمہارے جاپان جانے کی مخالف تھی۔ سچ بتاؤ وہ کون ہے جس کے بارے میں تم نے خود اپنے خط میں لکھا ہے کہ وہ تمہیں ٹوکیو میں دوسرے ہی دن مل گئی تھی۔ دیکھنے میں کچھ خاص نہیں مگر پھر بھی اچھی ہے اور یہ کہ اب تمہیں اسی کی رفاقت میں ٹوکیو کے شب و روز گزارنے ہیں۔''

ہم نے زوردار قہقہہ لگا کر کہا ''تم سچ مچ بڑی بھولی ہو۔ ٹوکیو میں ہمیں دوسرے دن جو ملی وہ کوئی حسینہ نہیں بلکہ یونیسکو کی چھتری ہے۔ رو میں شاید ہم چھتری لکھنا بھول گئے اور تم نے اس کا رشتہ عورت سے جوڑ لیا۔''

پوچھا ''اچھا تو یہ چھتری ہے؟''

ہم نے کہا ''اور کیا؟''

پوچھا ''اچھا یہ بتاؤ چھتری شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ؟''

ہم نے کہا ''بھلا چھتریوں کی بھی کہیں شادی ہوتی ہے؟''

بولیں ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ شادی شدہ نہیں ہے۔ یہ بتاؤ عمر کیا ہے؟''

ہم نے کہا ''بڑی پرانی چھتری ہے۔ اس سے پہلے بھی کئی لوگ اسے استعمال کر چکے ہیں؟''

بولیں ''اے ہے کچھ تو اپنی عمر کا لحاظ کرو۔ اب تمہیں کون سی غیر مستعملہ چیز ملے گی۔ مرد کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ رسی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا''۔ پھر اپنے لہجے میں غمگینی اور رقت طاری کرتے ہوئے بولیں ''خدا کے لئے راہِ راست پر آ جاؤ۔ تمہاری اولاد

اب شادی کے قابل ہو رہی ہے اور تمہیں اب بھی نئی نئی چھتریوں کی تلاش ہے۔"

ہم نے کہا "تمہارا الزام بالکل غلط ہے۔ یہاں ایسا کوئی سلسلہ نہیں ہے۔ میں نے اپنے خط میں جس کا ذکر کیا ہے وہ سچ مچ چھتری ہے۔ کہو تو تمہارے سر کی قسم کھاتا ہوں جسے میں نے ہمیشہ عزیز رکھا ہے"

بولیں "اچھا تو تم میرے سر کی عزت کرتے ہو۔ تبھی تو میرے سر پر ایک نئی چھتری لا رہے ہو۔"

یہ کہہ کر ہماری بیوی نے دھڑ سے فون رکھ دیا اور ہندوستان سے تھوڑی دیر کے لئے اچانک جو ہمارا رشتہ قائم ہو گیا تھا وہ ٹوٹ گیا۔ نیند کوسوں دور بھاگ گئی۔ ہمیں ہندوستان چھوڑے ہوئے گیارہ دن ہو گئے تھے۔ کوفت ہوتی رہی کہ یونیسکو کی چھتری نے خواہ مخواہ گڑ بڑ کر دی ورنہ ہمیں اپنی بیوی سے کتنی اہم اور ضروری باتیں کرنی تھیں۔ اپنے وطن عزیز کا حال پوچھنا تھا۔ یہ جاننا تھا کہ ہمارے بغیر ہندوستان کیسا لگ رہا ہے۔ کیا یہ اب بھی ترقی کر رہا ہے۔ ہمارے پیچھے سورج وقت پر طلوع ہو رہا ہے یا نہیں۔ ہمارے بغیر کہیں چاند کی روشنی ماند تو نہیں پڑ گئی۔ ان ضروری باتوں کے علاوہ کچھ غیر ضروری باتیں بھی کرنا تھیں۔ مثلاً ہمارے نکلتے وقت پکوان کی گیس ختم ہو گئی تھی۔ یہ آئی یا نہیں۔ ایک دوست کو مٹی کا تیل اکٹھا کر کے پہنچانے کے لئے کہا تھا یہ ملا یا نہیں۔ بجلی کٹنے والی تھی کٹی یا نہیں۔ ہم جب چلے تھے تو آندھرا پردیش کے چیف منسٹر کا تقرر زیر تصفیہ تھا۔ اس کا تصفیہ ہو گیا یا ہماری واپسی کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ ایسی ہی کئی باتیں تھیں مگر یونیسکو کی چھتری نے ٹانگ اڑا دی۔ بیوی پر سخت غصہ بھی آیا کہ محترمہ کی اولاد اب شادی کے قابل ہو گئی ہے لیکن اب تک ہم پر شک کرنے کی عادت نہیں گئی۔ عورت کی ذات ہی ایسی ہوتی ہے۔ رسی جل جاتی ہے پر بل نہیں جاتا۔ اصل غصہ تو اس بات پر تھا کہ اس ٹرنک کال پر کم از کم سو روپے کا خرچہ تو آ ہی جائے گا۔ جو بالآخر ہماری جیب سے ادا ہو گا۔

نیند اُچٹ گئی تو بس اُچٹتی ہی چلی گئی۔ گھڑی دیکھی تو تین بج رہے تھے۔ کمرے کی کھڑکی کھولی تو ٹوکیو کی سڑکوں کو بدستور مصروف پایا۔ کھڑکی سے نظر ہٹائی تو میز کے برابر رکھی ہوئی یونیسکو کی وہ چھتری نظر آ گئی جو فساد کی اصل جڑ تھی۔

دس دن پہلے ہم یونیسکو کے سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں پہنچے تھے تو یونیسکو کی عہدہ دار مس جو نے ہمیں کئی اشیاء دینے کے بعد کہا تھا ’’میں یہ چھتری بھی آپ کو سونپ رہی ہوں۔ ٹوکیو کا موسم بڑا غیر یقینی ہوتا ہے۔ کسی بھی وقت بارش ہو سکتی ہے۔ اس چھتری کو ہمیشہ اپنے پاس رکھئے۔ دیگر اشیاء تو اب آپ کی نجی ملکیت بن گئیں۔ لیکن خیال رہے یہ چھتری یونیسکو کی ملکیت ہے۔ جب تک جاپان میں رہیں اسے اپنے پاس رکھیئے اور جاتے ہوئے ہمیں واپس دے جایئے تاکہ یہ یونیسکو کے دیگر سیمیناروں میں آنے والے مندوبین کے استعمال میں آسکے۔‘‘

ہم نے مس جو کے ہاتھ سے چھتری کو لیتے ہوئے کہا ’’مس جو ہم نے ہمیشہ چھتری کے استعمال سے گریز کیا ہے۔ برسات تو ہمارے پاس بھی ہوتی ہے لیکن ہم بھیگنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں یا موقع پاتے ہی دوسرے کی چھتری کے نیچے گھس جاتے ہیں۔ غریب آدمی کی زندگی بہر طور گزر جاتی ہے۔ چھتری کو ہر جگہ اپنے ساتھ ٹنگائے پھرنا ہمیں پسند نہیں۔ چھتری تو پھر چھتری ہے ہم تو اپنی بیوی کو بھی کبھی اپنے ساتھ لے جانے کے روادار نہیں ہیں۔‘‘

مس جو نے ہنس کر کہا ’’ ۳۵ دن اس چھتری کو اپنے ساتھ رکھئے۔ ہندوستان جانے کے بعد آپ شاید اپنی بیوی کو چھتری کے نعم البدل کے طور پر رکھنے لگ جائیں گے۔ عادت اور سنگت بڑی بُری چیز ہے۔‘‘

ہم نے کہا’’ آگے کا حال ہم نہیں جانتے چونکہ یہ یونیسکو کی ملکیت ہے اسی لئے اس چھتری کی حفاظت کرنے کی پوری کوشش کریں گے۔ بیوی کی طرح نہیں محبوبہ کی طرح دل و جان سے عزیز رکھیں گے۔‘‘

یہ پلاسٹک کی چھتری تھی جس کے مٹھ پر گم ٹیپ سے چپکا ہوا ہمارا نام تھا ’’مسٹر حسین انڈیا‘‘۔ ہو بہو ایسی ہی چھتریاں سیمینار کے دیگر مندوبین کے حوالے بھی کی گئیں تھیں۔ ہم اس چھتری کو لے کر کانفرنس روم میں آئے تو یوں لگا جیسے ہمارے پیروں تلے سے زمین نکلی جارہی ہو۔ جاپان کے زلزلوں کے شہرہ آفاق جھٹکوں سے یہ ہمارا پہلا واسطہ تھا۔ ہم چھتری چھوڑ کر بھاگنا چاہتے تھے کہ ایک جاپانی دوست نے کہا ’’زلزلوں

کے ایسے جھٹکوں پر یہاں چھتری چھوڑ کر بھاگنا منع ہے۔ یہ تو روز کا معمول ہے۔ کب تک آپ بھاگیں گے اور کہاں تک آپ بھاگیں گے۔" سیمینار کے دیگر مندوبین بھی ہراساں تھے بلکہ سری لنکا کے مندوب مسٹر جیا کوڈی تو اتنے خوفزدہ ہو گئے کہ گھبراہٹ میں اچانک یونیسکو کی چھتری کو کھول کر کھڑے ہو گئے۔

زلزلے کا زور تھما تو ہم نے مس جو سے کہا "بی بی! ہمیں آسمان سے آنے والی بلاؤں سے بالکل ڈر نہیں لگتا۔ فلک کج رفتار سے یوں بھی ہماری پرانی آشنائی ہے۔ ہمیں کوئی ایسی چھتری دیجئے جو ہمیں زمین کے نیچے سے آنے والی بلاؤں سے محفوظ رکھ سکے۔ جاپان اتنا ترقی یافتہ ملک ہے آپ نے ایسی چھتری ضرور ایجاد کی ہوگی۔"

وہ مسکرا کر چلی گئیں تو سری لنکا کے مسٹر جیا کوڈی تھر تھر کانپتے ہوئے ہمارے پاس آئے اور کہنے لگے "مسٹر حسین! میں کل ہی جاپان سے چلا جاؤں گا۔ مجھے ایسا دہلانے والا سیمینار نہیں چاہئے۔ اگر یہ روز کا معمول ہے تو میں یہاں بقیہ دن کیسے گزاروں گا۔ سری لنکا میں میرے دو چھوٹے اور معصوم بچے ہیں۔ اُن کی ایک معصوم ماں بھی ہے اُن کا کیا ہوگا۔"

ہم نے کہا "مسٹر جیا کوڈی! آپ تو پھر بھی مزے میں ہیں۔ ہمارے تو چار بچے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ کے بچوں کی طرح معصوم نہیں ہیں۔ ایک بیوی ہے جو اتفاق سے معصوم ہے اور پھر اوپر سے یہ یونیسکو کی چھتری بھی اب ہمارے سایۂ عاطفت میں چلی آئی ہے۔"

صاحبو! ہم جاپان کو ذرا دلجمعی اور اطمینان کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے لیکن ہماری یہ خواہش محض اس لئے پوری نہیں ہوئی کہ یونیسکو کی چھتری ہمارے ساتھ تھی۔ محض اس چھتری کی خاطر ہمیں ایک ہی مقام کو دو دو مرتبہ دیکھنا پڑتا تھا۔ پہلی مرتبہ اس مقام کو دیکھنے جاتے تھے اور دوسری مرتبہ اس مقام سے اپنی بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے جاتے تھے۔ جاپان ریڈیو بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا انٹرویو ریکارڈ کرانے اور دوسری مرتبہ اپنی چھتری کو واپس لانے کے لئے۔ جاپان کی زنانہ یونیورسٹی میں بھی دو مرتبہ گئے۔ ایک مرتبہ اپنا خیر مقدم کروانے کے لئے اور دوسری مرتبہ اپنی چھتری کو واپس لانے کے

لئے ۔اگرچہ تھائی لینڈ کی مندوب مس پرینیا کا خیال تھا کہ ہم جان بوجھ کر زنانہ یونیورسٹی میں اپنی چھتری بھول آئے تھے تاکہ وہاں ایک بار اور جانے کا بہانہ ہاتھ آسکے۔اُن کا کہنا تھا کہ ہماری بھول بھی بڑی سوچی سمجھی ہوتی ہے۔خیر دنیا کی زبان کو کون روک سکتا ہے اور دنیا نے کب کس کا بھلا چاہا ہے۔تاہم اتنا جانتے ہیں کہ زنانہ یونیورسٹی سے اپنی بھولی ہوئی چھتری کو واپس لانے کے لئے ہم جس قدر خوشی خوشی گئے تھے کہیں اور نہیں گئے بلکہ دوسری مرتبہ بھی اس چھتری کو وہیں چھوڑے آرہے تھے، برا ہو یونیورسٹی کی عہدہ دار کا کہ ہمارے دبے پاؤں واپس جاتے وقت پکار کر کہا '' مسٹر حسین آپ جس چھتری کو لینے آئے ہیں اسے پھر بھولے جارہے ہیں'' ہم نے بادل ناخواستہ عہدیدار کا شکریہ ادا کیا اور راستہ بھر اُن کے تیز حافظے کو کوستے آئے۔اس چھتری کو ہم کہاں کہاں بھولے اس کا حساب بتانا دشوار ہے۔ہم اسے لے کر یوکوہاما گئے، اومیا گئے، نارا گئے، کیوٹو گئے اور ہر جگہ اسے بھولے مگر یہ پھر بھی ہمیں واپس مل گئی۔کیوٹو کی ہالی ڈے ان ہوٹل کا کمرہ خالی کرکے ہم باہر نکل آئے۔کچھ دیر بعد یاد آیا کہ ہماری چھتری تو ہالی ڈے ان میں ہی رہ گئی ہے۔بھاگم بھاگ واپس گئے تو دیکھا کہ کمرے پر ایک نوجوان جوڑے نے قبضہ کرلیا ہے۔نوجوانوں کی سرگرمیوں میں خلل ڈال کر اپنی چھتری واپس حاصل کی تو اس لطیفے کی صداقت پر ایمان لانا پڑا کہ ایک بزرگ ہماری ہی طرح اپنی چھتری ہالی ڈے اِن کے کمرے میں بھول کر چلے گئے۔چھتری کو واپس حاصل کرنے کے لئے ہماری ہی طرح واپس آئے تو دیکھا کہ ہنی مون منانے کے لئے آئے ہوئے ایک نوجوان جوڑے نے اُن کے سابقہ کمرے پر قبضہ کرلیا ہے۔چونکہ ہم سے زیادہ سمجھدار تھے۔اسی لئے کمرے کے دروازے پر کان رکھ کر اندازہ لگانے لگے کہ دیکھیں جوڑا کیا کررہا ہے۔اس وقت لڑکا لڑکی سے پوچھ رہا تھا '' ڈارلنگ! یہ گھنیری زلفیں کس کی ہیں؟''

لڑکی بولی '' تمہاری ہیں''۔

'' اور یہ ہرنی جیسی آنکھیں کس کی ہیں؟''

لڑکی بولی '' یہ بھی تمہاری ہیں''۔

'' اور یہ موتی جیسے دانت؟''

لڑکی بولی "یہ بھی تمہارے ہیں۔"

ان مکالموں کو سن کر بڑے میاں پریشان ہو گئے اور چیخ کر بولے "میاں برخوردار! جب معاملہ چھتری تک پہنچے تو خیال رہے کہ یہ تمہاری نہیں میری ہے۔"

صاحبو! اس چھتری سے ہمارے کمزور حافظے کا رشتہ کچھ اتنا استوار ہو گیا تھا کہ آدھی رات کو اچانک نیند سے جاگ کر اس چھتری کو تلاش کرتے تھے۔ جاپان میں سارے عام مقامات پر چھتریاں رکھنے کے اسٹینڈ ہوتے ہیں۔ چھتری کو اسٹینڈ میں رکھ کر مقفل کیجئے اور کنجی اپنے ساتھ لیتے جایئے۔ دو مرتبہ ہم چھتری کے اسٹینڈ کی کنجی بھول گئے۔ کنجی کو نہ ملنا تھا نہ ملی۔ بے چارے اسٹینڈ والے کو فاضل کنجی کا سہارا لینا پڑا۔ غرض اس چھتری نے ہمیں جاپان میں جگہ جگہ رسوا کیا۔ کسی مقام کی سیر کر کے واپس جانے کے لئے یونیسکو کی بس میں بیٹھتے تو اچانک ہمیں چھتری کی یاد آ جاتی تھی اور ہم اسے لینے کو بس سے کود پڑتے تھے۔ ایک پبلشنگ کمپنی کا معائنہ کرنے کے بعد ہم بس میں واپس چلے آئے اور معمول کے مطابق پھر چھتری کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ آدھے گھنٹے کی تلاش کے بعد مایوس ہو کر بس میں خالی ہاتھ لوٹے تو دیکھا کہ چھتری ہماری نشست پر آرام کر رہی ہے۔ بس ڈرائیور کو بھی ہماری عادت کا اندازہ ہو گیا تھا۔ بس چلانے سے پہلے پوچھتا تھا۔ "کیا مسٹر حسین کی چھتری بس میں آ گئی ہے"؟ اثبات میں جواب ملتا تو کہتا "اس کا مطلب یہ ہوا کہ سارے مندوبین بس میں آ چکے ہیں۔"

عوام الناس کی اطلاع کے لئے ہم یہ عرض کرتے چلیں کہ جاپان میں قیام کے دوران میں ہمیں صرف دو منٹ کے لئے اس چھتری کو استعمال کرنے کا موقع ملا تھا۔ غالباً ٹوکیو میں ہماری آمد کا ہی فیض تھا کہ موسم اچانک خوش گوار ہو گیا تھا۔ جاپانی بھی حیران تھے کہ آخر موسم کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم ان پر اس راز کو فاش نہیں کرنا چاہتے تھے کہ موسم کی یہ خوشگواری ہماری دین ہے ورنہ وہ ہمیں وہیں روک لیتے۔

ایک دن ذرا سی بوندا باندی ہوئی تو ہم نے کہا چلو آج اس چھتری کو استعمال کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ مگر وہ تھی جاپانی چھتری۔ ہم سے کھلنے کا نام نہ لیتی تھی ایک جاپانی کی خدمات حاصل کر کے چھتری کھلوائی لیکن اِدھر چھتری کھلی اور اُدھر برسات رُک گئی۔

چارو ناچار دوسرے جاپانی کی خدمات حاصل کر کے چھتری بند کروائی۔

جب اس چھتری کے دوبارہ حصول کے پیچھے ٹیکسیوں اور ٹرینوں میں خاصی رقم خرچ کر چکے اور جاپان کو چھوڑنے میں صرف آٹھ دن باقی رہ گئے تو ایک دن ہم نے چھتریوں کی ایک دکان پر اس چھتری کی قیمت پوچھی۔ پتہ چلا کہ ایک ہزار ین کی ہے۔ اس کے بعد ہم نے اس رقم کو جوڑا جو ہماری غائب دماغی کے باعث اس چھتری پر خرچ ہوئی تھی۔ معلوم ہوا کہ کل پانچ ہزار ین خرچ ہوئے ہیں۔ واضح رہے کہ اس رقم میں اس ٹرنک کال کا سو روپے کا بل بھی شامل ہے جسے ہماری بیوی نے اس چھتری سے گھبرا کر ہمیں کیا تھا۔ آدمی کو حساب کے معاملے میں ایماندار رہنا چاہئے۔

جب سیمینار ختم ہوا تو وداعی تقریب کے بعد ہم نے سینہ تان کر بڑے فخر کے ساتھ اس چھتری کو مس جو کے حوالے کیا۔ بلکہ جوش جنون میں فارسی میں یہاں تک کہہ دیا کہ ''سپردم بتو مایہ خویش را''

مس جو نے ہنس کر کہا ''مسٹر حسین! اب آپ ہندوستان جا کر اپنی بیوی کو بھی اسی طرح ساتھ رکھیں گے جس طرح یہاں چھتری کو رکھا کرتے تھے۔''

ہم نے کہا ''مس جو! اس چھتری کی وجہ سے اب تو ہمیں سچ مچ کسی کو ساتھ رکھنے کی عادت ہوگئی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ اس چھتری نے جاپان میں ہمیں اپنی بیوی کی عدم موجودگی کا احساس ہی نہ ہونے دیا۔ یہ اب چھتری نہیں سچ مچ ہماری بیوی بن گئی ہے۔ ذرا دیکھئے تو سہی کہ ہم نے اسے کتنا کم استعمال کیا ہے۔ ۳۵ دن میں صرف ایک بار۔''

مس جو نے ہنستے ہنستے اس چھتری کے مٹھ پر سے گم ٹیپ کو چھیلا اور ہمارا نام نکال دیا۔ ہمارے دل پر ایک بجلی سی گری۔ تڑپ کر بولے ''مس جو اس چھتری پر سے ہمارا نام ذرا آہستہ نکالئے۔ دِل پر چوٹیں سی پڑ رہی ہیں'' اتنا کہنے کے بعد نہ جانے کیوں ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ہمیں ٹوکیو سے ہندوستان واپس آئے کئی دن بیت چکے ہیں لیکن یہ چھتری اب بھی ہمارے ذہن میں کھٹ سے کھل جاتی ہے۔ اگرچہ ہم اسے کھولنا نہیں جانتے

تھے۔ نہ جانے کون اس چھتری کو ہمارے ذہن میں کھول دیتا ہے۔ یہ چھتری جو ٹوکیو کے بازاروں میں ہمارے ساتھ رہتی تھی۔ یہ چھتری جس کی مدد سے ہم نے یوکوہاما کے سمندر کی ریت پر نہ جانے کیا کیا شکلیں بنائی تھیں۔ ماؤنٹ فیوجی کے دامن میں یہ ہماری رفیق تھی۔ جاپان کے دیہاتوں کی گرد اس پر جمی تھی۔ نارا کے پگوڈوں میں یہ ہماری ہم رکاب تھی۔ کیوٹو کے گیشا گھروں میں یہ ایک چشم دید گواہ کے طور پر ہمارے ساتھ تھی۔ اس چھتری کے سائے میں اب کتنی جوان یادیں پل رہی ہیں۔ ہمیں یوں لگتا ہے جیسے ہم جان بوجھ کر اس چھتری کو ٹوکیو میں بھول آئے ہیں تاکہ اسے لینے کے بہانے پھر ٹوکیو جا سکیں تاکہ جذبوں کے سلسلے پھر جوڑیں۔ یادوں کی کڑیاں پھر ملائیں۔ لمحوں کے موتی پھر پروئیں۔ ارمانوں کے دھاگوں سے پھر نئی داستانیں بنیں۔

اے یونیسکو کی چھتری! ہماری ہمدم! ہماری رفیق اداس نہ ہونا۔ ہم تجھے دوبارہ حاصل کرنے کے لئے پھر آئیں گے۔ ہماری راہوں میں آنکھیں بچھائے رکھنا۔ کیا عجب کہ اب کی بار ہم بادل بن کر تجھ پر برسنے آ جائیں۔

(جاپان چلو، جاپان چلو۔ ۱۹۸۳ء)

میں نہیں آؤنگا

(اکیسویں صدی کے نام)

وہ ۱۹۷۵ء کے نئے سال کی رات تھی۔ جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں کے آگے ہم چار دوست جمع تھے۔ مخمور سعیدی، امیر قزلباش، کمار پاشی اور میں۔ نیا سال آیا تو امیر نے کہا: ''چلو آج ایک عہد کرتے ہیں۔ جب ۲۰۰۰ء ختم ہو اور اکیسویں صدی شروع ہوگی تو ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو ہم چاروں دوست پھر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر جمع ہوں گے۔ ہم میں سے جو جہاں بھی ہوگا اُسے اُس رات یہاں آنا پڑے گا۔''

میں نے کہا ''امیر قزلباش! تمہارا اور مخمور کا تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کیوں کہ پچیس برس بعد تم دونوں تو خود جامع مسجد کے اندر سے ہاتھوں میں تسبیح لئے باہر نکل کر سیڑھیوں پر آجاؤ گے۔ کمار پاشی برلا مندر سے چلا آئے گا۔ میں اپنے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا ____ ہوسکتا ہے اس وقت تک میں حیدرآباد واپس چلا جاؤں، یا پھر اس دنیا میں ہی نہ رہوں۔''

مخمور نے کہا ''یہ ہو نہیں سکتا، یہ دنیا اگر تمہیں جینے نہیں دے گی تو ہم تمہیں مرنے نہیں دیں گے۔ تم حیدرآباد واپس چلے بھی جاؤ تو ہم تمہیں اسٹریچر پر ڈال کر یہاں لے آئیں گے اور تمہیں بتائیں گے کہ دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں۔''

میں نے کہا ''یارو! مجھے اس طرح کے عہد سے دور رکھو۔ سامان سو برس کے

ہیں، پَل کی خبر نہیں۔ میں صرف اس خیال کے ساتھ زندگی نہیں گذار سکتا کہ ہمیں پچیس برس بعد جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ملنا ہے، کیوں مِلنا ہے؟ آخر ایسا کیا ضروری کام ہے؟ جو بات تم پچیس برس کے بعد کرنا چاہتے ہو، ابھی کرلو۔ آج کا کام کل پر نہ ٹالنا چاہتے ہو تو پرسوں پر ٹالو۔ اس صدی کا کام دوسری صدی پر کیوں ٹالتے ہو؟''

کمؔار پاشی نے کہا'' اس رات ہم تمہیں اپنا غیر مطبوعہ کلام سنائیں گے۔''

میں نے کہا'' اس لیے کہ ۲۰۰۰ء میں اُردو کا کوئی رسالہ ہی نہیں ہوگا جو تمہارے غیر مطبوعہ کلام کو زیورِ طبع سے آراستہ کرسکے۔ یہ تمہاری مجبوری ہے، میں کیا کرسکتا ہوں۔ یوں بھی اب کون سا غیر مطبوعہ کلام سناتے ہو۔ تمہارا غیر مطبوعہ کلام بھی مطبوعہ سا لگتا ہے۔''

مگر میرے اس معقول استدلال کے باوجود ان تینوں نے مجھے زبردستی اس نامعقول عہد کا نہ صرف ایک فریق بنایا بلکہ جب میں وہاں سے جانے لگا اور دور چلا بھی گیا، تو امیر نے مجھے دوبارہ واپس بلا کر یاد دلایا'' یاد رکھنا! ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو ٹھیک بارہ بجے یہیں ملنا ہے۔ ہم سے دو چار منٹ کی دیر سویر ہو جائے تو انتظار کر لینا، اور ہاں یہ سامنے والی سیڑھیوں پر ملنا ہے، کہیں تم پچھلی سیڑھیوں پر نہ چلے جانا۔''

اس رات کو گذرے ہوئے گیارہ برس بیت گئے۔ امیر اور مخمور ابھی تک مسجد سے اور کمار پاشی مندر سے کوسوں دور ہیں اور میں ہنوز دہلی میں ہوں۔ تاہم ہم سب کو اپنا عہد یاد ہے بلکہ اس عہد کا ایک نقصان یہ ہوا کہ اس کے بعد ہم لوگوں نے آپس میں ملنا جلنا کم کر دیا ہے کیوں کہ ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو ہمیں ملنا جو ہے۔ ایک بار مخمؔور نے مجھے فون کر کے کہا'' یار تم سے ایک ضروری کام ہے، بتاؤ کب ملو گے؟'' اور میں نے کہا '' ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو ملنا جامع مسجد کے سامنے، ٹھیک بارہ بجے۔ دو چار منٹ کی دیر سویر ہو جائے تو انتظار کر لینا۔'' اور مخمؔور نے اپنا یہ ضروری کام اُس رات تک کے لیے یوں محفوظ رکھ چھوڑا ہے جیسے لوگ بینک لاکرس میں اپنے قیمتی زیورات کو محفوظ رکھتے ہیں۔

مجھے کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے زندگی کا واحد مقصد اب یہ رہ گیا ہے کہ سانسوں کے تسلسل کو خواہ مخواہ اکیسویں صدی تک لے جاؤ۔ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا

ہوں، تو وہ لطیفہ یاد آتا ہے کہ ایک نوجوان ہوٹل میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس نے چائے میں چینی تو نہیں ڈالی تھی، البتہ ہر گھونٹ کے بعد پیالی میں چمچہ چلاتا جاتا تھا۔ جب کئی بار چمچہ چلا چکا تو ایک بزرگ نے کہا "تم بھی عجیب آدمی ہو، چائے میں چینی تو نہیں ڈالی مگر چمچہ ہے کہ چلاتے جا رہے ہو۔" اس پر نوجوان نے کہا "حضور! میں ایک تجربہ کر رہا ہوں اور اپنے تجربے میں کامیاب ہو چکا ہوں۔" بزرگ نے پوچھا "اس تجربہ کا کیا نتیجہ برآمد ہوا؟" نوجوان نے کہا "میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر چائے میں چینی نہ ہو اور آپ اس میں ہزار بار بھی چمچہ چلا لیں تو چائے میٹھی نہ ہوگی۔"

ہم لوگ بھی اب اس طرح زندگی گذار رہے ہیں جیسے بنا چینی کی چائے میں چمچہ چلا رہے ہوں۔ چمچہ ہے کہ چلتا جا رہا ہے اور چائے ہے کہ میٹھی ہونے کا نام نہیں لیتی۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے جیسے ہم چاروں چمچے ہیں اور زندگی کے پھیکے محلول میں بلا وجہ چلتے جا رہے ہیں۔ میں پرانی دہلی بہت کم جاتا ہوں۔ دو برس پہلے کی بات ہے۔ ایک رات گیارہ بجے جامع مسجد کے سامنے اچانک امیر قزلباش کچھ اس عالم میں ملے جس میں زماں صدیوں سے پرے اور مکاں کائنات کی بندشوں سے ماورا ہو جاتا ہے۔ میں لمحہ لمحہ جوڑ کر زندگی گذارنے والا آدمی ہوں۔ میں امیر قزلباش سے بچنے کے لئے ایک گلی میں چھپنے لگا تو امیر نے پکار کر کہا "کیوں میاں! اتنی جلدی یہاں آ گئے۔ ہمیں تو سولہ برس بعد ملنا ہے۔ ابھی سے یہاں ڈٹے ہوئے ہو۔"

میں نے زوردار قہقہہ لگا کر امیر کو اُن کے حسبِ حال ایک لطیفہ سُنایا کہ دو دوست تھے۔ ایک دوست کو اچانک کسی کام سے تین سال کے لئے ملک سے باہر جانا پڑ گیا۔ لہٰذا دوسرے دوست نے اُسے وداع کرنے کے لئے ایک مے خانہ میں پارٹی دی۔ رخصت ہونے کا وقت آیا تو ملک میں رہنے والے دوست نے باہر جانے والے دوست سے کہا "یار! ایک وعدہ کرو۔ تین سال بعد فلاں تاریخ کو جب تم ہندوستان واپس آؤ تو اسی دن شام کو پھر اسی میخانہ میں ملیں گے۔ ٹھیک تین سال بعد۔ یاد رکھنا، بھولنا مت" __ دونوں رخصت ہو گئے اور تین سال بعد جب پہلا دوست باہر سے واپس آیا تو اُسے وعدہ یاد تھا۔ وہ بھاگم بھاگ میخانہ گیا تو دوسرے دوست کو میخانہ میں موجود پایا۔

وفورِ جذبات سے دونوں بغل گیر ہو گئے۔ باہر سے آنے والے دوست نے کہا ''یار! میں تمہاری محبت کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے یقین نہیں تھا کہ تمہیں تین سال بعد آج ہی کے دن اسی وقت اس میخانہ میں مجھ سے ملنے کا وعدہ یاد رہے گا۔ تم نے نہ صرف وعدہ کو یاد رکھا بلکہ میرے استقبال کے لیے یہاں موجود ہو۔''

اس پردیسی دوست نے لڑکھڑاتی زبان میں کہا ''یار کیسا وعدہ؟۔ کس بات کا وعدہ۔ میں تو تمہارے جانے کے بعد اس میخانہ سے کہیں گیا ہی نہیں۔ یہیں بیٹھا تمہاری واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔''

صاحبو! یہ تمہید جو ذرا لمبی ہو گئی ہے، اس لیے باندھی گئی ہے کہ ہمیں تمہید کو کھولنا نہیں آتا۔ یوں بھی ان دِنوں ہر کس و ناکس کو اچانک یہ احساس ہو گیا ہے کہ کروڑوں برس پرانی دنیا چند برسوں میں بیسویں صدی کی کینچلی کو اُتار پھینکنے والی ہے۔ اُردو کے چار بے فکرے اور لاپرواہ شاعروں اور ادیبوں نے اگرچہ پچیس برس پہلے اکیسویں صدی کے قدموں کی چاپ سُن لی تھی۔ حالانکہ اُن کی زبان کی بساط تین چار صدیوں سے زیادہ کی نہیں ہے بلکہ انہیں تو یہ بھی معلوم نہیں کہ اگر خدانخواستہ اکیسویں صدی آجائے تو یہ اپنی زبان کے ساتھ اکیسویں صدی میں داخل ہوں گے یا اپنی زبان کو بیسویں صدی میں ہی چھوڑ کر اکیسویں صدی میں یوں جائیں گے جیسے سکندر اس دنیا سے گیا تھا۔ اب جب کہ ہر شخص کو پتہ چل گیا ہے کہ اکیسویں صدی آنے والی ہے تو ہر شخص بیسویں صدی سے چھٹکارا پانے کی سوچ رہا ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ جب انیسویں صدی آ رہی تھی تو اس وقت لوگوں نے کیا کیا تھا۔ میں تو اس وقت نہیں تھا۔ میرے والدِ مرحوم ضرور زندہ تھے۔ اُن کا سنِ پیدائش اور علی گڑھ کے ایم اے او کالج کا سنِ پیدائش دونوں ایک ہی تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ انیسویں صدی کے اختتام پر اُن کی جیب میں صرف پانچ روپے پڑے ہوئے تھے۔ اُن دنوں پانچ روپے بہت ہوتے تھے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ اس تحریر کو لکھتے وقت، جب کہ ایک صدی کے پورا ہونے میں صرف چودہ برس باقی رہ گئے ہیں، میں نے اپنی جیب ٹٹولی تو اس میں بھی پانچ روپے ہی پائے گئے۔ یہ اور بات ہے کہ پچھلے چھیاسی برسوں میں روپے کی قدر و قیمت تو گری ہی ہے لیکن آدمی کی قدر و قیمت تو اور بھی گری ہے

اس لحاظ سے میرے والد مرحوم پچھلی صدی کے خاتمہ پر مال و دولت اور کردار کے اعتبار سے جتنے تونگر تھے آج میں اتنا ہی کنگال ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے خاندان کا جملہ اثاثہ جو پانچ روپوں پر مشتمل ہے، اب بھی میرے پاس محفوظ ہے۔ یہ میرے والد مرحوم کی بڑائی تھی کہ انیسویں صدی میں آنے لگے تو اپنے ساتھ میر، غالب، مومن، ذوق، مصحفی اور ڈپٹی نذیر احمد نہ جانے کن کن کو اپنے ساتھ لیتے آئے۔ اَب میں وقت کی چھلنی میں بیسویں صدی کو چھاننے بیٹھا ہوں تو وقت کی چھلنی کے چھید اب کچھ اتنے بڑے ہو گئے ہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد، مصحفی اور ذوق تو کجا، میر اور غالب تک اس چھلنی کے چھیدوں سے پھسلنے لگے ہیں۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ بیسویں صدی کے خاتمہ پر وقت کی چھلنی جب کچھ دیر کے لیے رُکے گی تو میر اور غالب تو چھلنی کے چھیدوں سے نیچے پھسل آئیں گے اور چھلنی میں صرف اُردو اکیڈمیاں باقی رہ جائیں گی۔

صدیوں کے حساب کتاب میں ہمیشہ گھپلا ہوتا ہے۔ میرے ایک بزرگ رشتے دار ہیں، خزاں رسیدہ پتے کے سمان۔ پھر بھی بیسویں صدی کے پیڑ سے چمٹے ہوئے ہیں۔ انہیں بھی اکیسویں صدی میں جانے کی جلدی ہے۔ اسّی کے لپیٹے میں ہیں اور پچھلے اسّی برسوں سے انہیں قیامت کا بے چینی سے انتظار ہے۔ پچیس برس پہلے تک فرماتے تھے کہ قیامت بیسویں صدی میں ہی آئے گی مگر اب انہوں نے قیامت کو مہلت دے دی ہے۔ کہتے ہیں کہ قیامت بیسویں صدی میں نہیں آئی تو کیا ہوا، اکیسویں صدی میں تو ضرور آئے گی۔ اُن کے زندہ رہنے کا واحد مقصد کم از کم مجھے تو یہ نظر آتا ہے کہ وہ قیامت کو بہ نفسِ نفیس اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں۔ دور اندیش اتنے ہیں کہ ابھی سے اپنے علاوہ اُن اشیاء کی فہرست تیار کر چکے ہیں جنہیں وہ اپنے ساتھ اکیسویں صدی میں لے جانا چاہتے اور قناعت پسند اتنے ہیں کہ اُن کی فہرست چار پانچ اشیاء سے زیادہ پر مشتمل نہیں ہے۔ ایک تو اُن کی لاٹھی ہے جس میں آواز بھی ہے اور جس کے سہارے کے بغیر اکیسویں صدی تو بہت دور کی بات ہے، وہ اپنے روم سے باتھ روم تک نہیں جا سکتے۔ دوسری شے اُن کا ٹونٹی کا لوٹا ہے جس پر اُن کا نام معہ ولدیت اور مفصل پتہ کے درج ہے۔ ایک بے معنی سا شعر بھی اس پر کندہ کرا رکھا ہے، جس میں دنیا کی بے ثباتی اور لوٹے کی

باثباتی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اپنے دو جوڑے کپڑوں، ایک بوسیدہ چپل کے علاوہ میرامنؔ کی 'باغ و بہار' کا ایک نسخہ بھی اس فہرست میں شامل کر رکھا ہے۔ میں نے اُن کی فہرست کا بغور معائنہ کرنے کے بعد کہا "حضور! آپ اکیسویں صدی میں وہ چیزیں لے جا رہے ہیں جنہیں بہت سے لوگ اُنیسویں صدی میں ہی چھوڑ آئے تھے۔"

بولے "میاں میں تو طلسم ہوش رُبا اور داستانِ امیر حمزہ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر اکیسویں صدی کے ناتواں کندھوں پر ترس کھا کر اس بھاری بوجھ کو اتار دیا ہے اور ہاں اگر میں انیسویں صدی کی کچھ چیزیں، اکیسویں صدی میں لے جانا چاہتا ہوں تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اپنے ملک میں آدھے لوگ ایسے ہیں جنہیں ابھی تک حضرت عیسیٰ کے پیدا ہونے کی بات تو بہت دور کی ہے، اُن کے دنیا سے اُٹھائے جانے تک کا علم نہیں ہے۔ مہاتما بدھ اُن کے لیے اجنبی ہیں۔ اُن کی زندگی دیکھو تو لگتا ہے بابل و نینوا کی تہذیب ابھی اُن کے لیے آنے والی کئی صدیوں کی بات ہے۔ تمہیں اعتراض ہے کہ میں اپنا ٹونٹی کا لوٹا لے کر اکیسویں صدی میں کہاں جا رہا ہوں۔ بھیا! میرا لوٹا خالص مرادآبادی لوٹا ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش اور جگرؔ مرادآبادی کی تاریخِ پیدائش دونوں کم و بیش ایک ہی ہیں۔ اسی لیے جگرؔ کے شعروں میں جتنا مطلب ہوتا ہے اتنا ہی پانی اس لوٹے میں سماتا ہے۔ برخوردار! اکیسویں صدی میں جانے سے کسی کو روکنا ہی ہے تو اِن افراد کو روکو جو بظاہر زندہ تو اس صدی میں نظر آتے ہیں لیکن ذہنی اور جذباتی طور پر حضرت عیسیٰ سے کئی برس قبل کی صدیوں میں سانس لے رہے ہیں، پھر بھی انہیں اکیسویں صدی میں جانے کی جلدی ہے۔"

میں نے اُن بزرگ سے مزید کوئی باز پرس نہیں کی۔ اب آپ سے کیا چھپانا میں نے چوری چھپے اپنی بیوی کی مرتب کردہ وہ فہرست دیکھی ہے جس میں اُس نے اپنی پسند کی اُن اشیا کو درج کیا ہے جنہیں وہ اکیسویں صدی میں لے جانا چاہتی ہے۔ اس میں اُس نے جہیز کے اس سامان کو بھی شامل کر رکھا ہے جو وہ تیس برس پہلے اپنے ساتھ میرے گھر لے آئی تھی۔ دیگر اشیاء میں چار بچوں کے علاوہ دو عدد نواسے بھی شامل ہیں۔ اس فہرست میں کوڑا کرکٹ تو بہت ہے لیکن دور دور تک کہیں میرا نام شامل نہیں ہے۔ مجھے

اس سے کوئی شکایت بھی نہیں ہے کیوں کہ اگر میں اکیسویں صدی کے اپنے سامان کی فہرست تیار کروں گا تو اس میں اُسے شامل نہیں رکھوں گا۔

صاحبو! ان ساری باتوں کے پیشِ نظر میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ اکیسویں صدی میں ہرگز نہیں جاؤں گا۔ اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ جس سڑک پر میرا مکان واقع ہے اس پر برسات کے موسم میں تیس برس پہلے جن گڑھوں میں پانی ٹھہرتا تھا، اب بھی ٹھہرتا ہے بلکہ برسات کے موسم کی تخصیص کے بغیر ٹھہرتا ہے۔ اس کے دو مین ہولس کے ڈھکن پتہ نہیں کب سے کھلے ہوئے ہیں۔ اس سڑک پر آدمی چلتا کم ہے اور ٹھوکریں زیادہ کھاتا ہے۔ کیا یہ سڑک مجھے اکیسویں صدی تک لے جائے گی؟ ___ پھر اس سڑک کو عبور کرنے کے بعد جس بس اسٹاپ پر میں بس کا انتظار کرتا ہوں وہاں ہاتھ دکھانے کے باوجود کئی بسیں مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں اور اگر اتفاقاً کوئی بس میری خاطر نہیں بلکہ کسی تکنیکی خرابی کی وجہ سے رُک بھی جاتی ہے تو میں اُس کے ڈنڈے سے لٹک کر منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہوں۔ کیا میں اکیسویں صدی میں ڈنڈے سے لٹک کر ہی جاؤں گا؟۔ جس آدمی کی زندگی کا بڑا حصہ راشن کی دکان کے کیو سے نکل کر دودھ کے ڈپو کے کیو میں لگنے اور وہاں سے کسی اور کیو میں لگنے اور پھر وہاں سے نکل کر مٹی کے تیل کے کیو میں لگنے میں گذر جاتا ہو اُسے اکیسویں صدی میں جا کر کیا کرنا ہے؟۔ پھر جب کہ مجھے معلوم ہے کہ خود اکیسویں صدی میں جانے کے لیے لوگوں نے ابھی سے کیو لگانا شروع کر دیا ہے۔ اسی لیے میں اپنا حساب کتاب اسی صدی میں چکتا کر دینا چاہتا ہوں۔ میں اپنی اولاد کو وہ پانچ روپے سونپ دینا چاہتا ہوں جو پچھلی صدی کے خاتمہ کے وقت میرے والدِ مرحوم کے پاس تھے اور اب اس صدی کے خاتمہ پر میرے پاس موجود ہیں۔ مجھ سے اب اِن پانچ روپوں کی حفاظت نہ ہو سکے گی۔ ان روپوں کی حفاظت کے لیے کیا کیا جتن نہ کیے۔ کتنے بجٹوں سے اُن کو بچا کر یہاں تک لے آیا ہوں۔ دنیا کی بڑی طاقتوں کی نظر ان پانچ روپوں پر ہے۔ دنیا بھر کے منافع خور تاجر، رشوت خور بدعنوان افسر اور اسمگلر میرے ان پانچ روپوں پر گھات لگائے بیٹھے ہیں ___ اب مجھ میں ان پانچ روپوں کو بچانے کی سکت نہیں ہے۔ ''ساغر کو میرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں'' والا معاملہ ہے۔

پھر مسئلہ یہ بھی ہے کہ مجھے بیسویں صدی سے محبت ہوگئی ہے۔ اس صدی میں سانس لینے کے لیے میں نے کتنی بھاری قیمت ادا کی ہے۔ دوسری جنگِ عظیم کو جھیلا۔ ہیروشیما اور ناگاساکی تو میرے سانس لیتے لیتے بے سانس ہوگئے تھے۔ میرے ہوش سنبھالتے ہی دنیا نے ایٹم بم بنالیا تھا، اور میرے ہوش اُڑتے ہی ملک تقسیم ہوگیا تھا۔ مجھے اس صدی میں جینے کی پریکٹس ہوگئی ہے۔ میں اکیسویں صدی میں جا کر کیا کروں گا۔ اسی لیے آج میں آپ سب حضرات کی موجودگی میں اپنے تینوں دوستوں مخمور سعیدی، امیر قزلباش اور کمار پاشی کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ آج سے میں ۲۰۰۰ء کی آخری رات کو جامع مسجد کی سیڑھیوں پر ملنے کے معاہدہ کا فریق نہیں ہوں۔ دو چار منٹ کی دیر سویر ہوجائے تو انتظار کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دو چار برس بھی انتظار کرو تو میں نہیں آؤں گا۔ تم تینوں ملنا چاہتے ہو تو ضرور ملو مگر مجھے تلاش نہ کرو۔ اپنی جھولیوں کو ٹٹولو اور دیکھو کہ بیسویں صدی نے تمہیں کیا دیا ہے؟ ہوسکتا ہے کہ میں بھی وہیں کہیں تمہیں پڑا ہوا مل جاؤں۔ میں اس مضمون کو کمار پاشی کی ہی ایک نظم کے بند پر ختم کرتا ہوں:

ساحلوں سے کہو میں نہیں آؤں گا !
اَب کسی شہر کی رات میرے لیے جگمگائے نہیں
دھوپ بوڑھے مکانوں کی اونچی چھتوں پر
میرا نام لے کر بلائے نہیں
میں نہیں آؤں گا
میں نہیں آؤں گا

(الغرض ۔ ۱۹۸۷)

ڈائرکٹر کا کتّا

وہ ڈائرکٹر کا کتا تھا۔ ڈائرکٹر کی طرح ہی خونخوار اور رعب داب والا، کیوں نہ ہو آخر کو وہ ڈائرکٹر کی صحبت میں جو رہتا تھا۔ اس کا نام کیا تھا، یہ کوئی بھی نہیں جانتا تھا۔ لوگوں کو بس اس کا عہدہ معلوم تھا یعنی ڈائرکٹر کا کتا۔ ایک تو کتا اور اُوپر سے ڈائرکٹر کا کتا، گویا کریلا اور وہ بھی نیم چڑھا۔ بقول پطرس بخاری ''بہت ہی کتا تھا''۔ ڈائرکٹر جب اپنی کار میں دفتر آتا تو یہ اس کی پچھلی نشست پر بیٹھا دفتر کی خاتون کلرکوں کو دیکھ دیکھ کر رال ٹپکایا کرتا تھا۔ کار ڈائرکٹر کو چھوڑتی اور کتے کو لے کر واپس چلی جاتی تھی۔ ڈائرکٹر اپنے ساتھ کتے کو کیوں لاتا تھا اس کی وجہ کسی کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ ڈائرکٹر اپنی شخصیت میں کتے کی ملاوٹ کر کے اپنے رعب اور دبدبہ میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ وَاللہُ اَعْلَم بِالصَّواب۔

مگر ہمارا خیال اس معاملہ میں بالکل دوسرا تھا۔ ہم یہ کہتے تھے کہ اس کتے میں بذاتِ خود کچھ بھی نہیں ہے۔ اگر اس کی شخصیت میں سے ڈائرکٹر کو نکال دیا جائے تو اس کتے میں صرف دُم باقی رہ جائے گی۔ جو ہم جیسے ایروں غیروں کے آگے بھی ہلتی رہے گی۔ اس کتے میں دُم کے بعد جو کچھ ہے وہ صرف ''ڈائرکٹر شپ'' ہے۔ اس استدلال کو ثابت کرنے کے لیے ہم ڈائرکٹر کے پرسنل اسسٹنٹ کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ کبھی کبھی تو وہ ہمیں نہ صرف اس کتے سے بھی زیادہ خونخوار نظر آتا ہے بلکہ غور سے دیکھا جائے تو اُس

کے نکیلے دانت اور ضرر رساں پنجوں کے علاوہ اس کی دم بھی دکھائی دینے لگتی ہے۔ پھر ہم اس دعویٰ کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکنے کی غرض سے خود اپنے کتے کا حوالہ دیا کرتے تھے کہ ایسا آلسیشن کتا ہے جس کی ولدیت میں ذرا بھی شبہ نہیں کیا جاسکتا لیکن چونکہ ایک معمولی عہدہ دار کا کتا ہے اس لیے محلّہ کے چھوٹے چھوٹے بچے تک سارا سارا دن اس کی دُم سے لٹکتے رہتے ہیں۔ کتا پالنے کے معاملہ میں صرف کتے کی نسل ہی نہیں دیکھی جانی چاہیے بلکہ جو آدمی کتا پالتا ہے اس کے سلسلۂ حسب نسب کی بھی چھان بین ضروری ہے۔ دنیا میں ہر شے اضافی ہے۔ اگر ہمارا یہی کتا کسی نجیب الطرفین عہدیدار کا کتا ہوتا تو آپ دیکھتے کہ اس کی کیسی عزت وتوقیر ہوتی۔ انسانوں کی اُونچ نیچ بعد میں کتوں کی اُونچ نیچ کا سبب بن جاتی ہے۔

بات اصل میں ڈائرکٹر کے کتے کی ہو رہی تھی اور ہم دوسرے کتوں پر بھونکنے لگے۔ ایک دن یوں ہوا کہ ڈائرکٹر جب اپنی کار سے اُتر کر اپنے آفس میں چلا گیا تو یہ کتا کسی طرح کار سے باہر نکل آیا۔ ڈرائیور جوزف نے واپس آکر دیکھا تو کتا غائب تھا۔ ڈرائیور کے پسینے چھوٹ گئے۔ اگر کتا غائب ہوگیا تو اس کی نوکری بھی غائب ہوجائے گی۔ اتفاق سے ورما جی اسی وقت دفتر میں داخل ہو رہے تھے۔ اس نے پکار کر کہا ''بھئی ڈائرکٹر صاحب کا کتا چھوٹ گیا ہے۔ اُسے پکڑنے کی کوشش کرو۔''

ورما جی ادھیڑ عمر کے آدمی۔ کم۔ کلرک تھے۔ دس برسوں سے انہیں کوئی پرموشن نہیں ملی تھی۔ اس میں قصور اُن کی کانفیڈنشیل رپورٹ کا تھا۔ ہر عہدہ دار نے یہی لکھا تھا کہ یہ کوئی کام کرنا نہیں جانتے۔ بڑی پیروی اور کوشش کے بعد اب انہوں نے اپنی ترقی کے سلسلہ میں اپنی فائل ڈائرکٹر کے پاس بھجوائی تھی اور اب یہ فائل اس کی میز پر زیرِ تصفیہ تھی۔ جیسے ہی انہیں ڈائرکٹر کے کتے کے غائب ہوجانے کی اطلاع ملی، اُن کے کان کھڑے ہوگئے۔ انہوں نے سوچا اپنی ترقی کے معاملہ کو پکا کرنے کا اس سے بہتر کوئی اور موقع نہیں ہے۔ بھلے ہی ہر عہدہ دار نے یہ لکھا ہو کہ وہ کوئی کام کرنا نہیں جانتے، لیکن وہ ڈائرکٹر کے کتے کو پکڑ کر یہ ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ ایک کام تو کر سکتے ہیں۔ یکلخت انہوں نے سوچا یہ سب کچھ خدا کی طرف سے ہو رہا ہے۔ کتے کا کار سے بھاگنا، ترقی کی فائل کا ڈائرکٹر کے

پاس پہنچنا اور عین وقت پر اُن کا دفتر میں داخل ہونا یہ سب کچھ اس بات کی دلیل ہے کہ اُن کی ترقی کے مشورے آسمانوں میں ہو رہے ہیں۔

ڈائرکٹر کے ڈرائیور نے پھر ایک بار پکار کر کہا ''بھائیو! ڈائرکٹر صاحب کا کتا بھاگ گیا ہے۔ تم لوگ اسے پکڑنے کی کوشش کرو ورنہ میری نوکری خطرہ میں پڑ جائے گی۔''

ورما جی نے جواباً پکار کر کہا ''جوزف! اب اس بات کا زیادہ اعلان کرنے کی کوشش نہ کرو۔ میں اکیلا ہی اس کتے کو پکڑوں گا۔ سوال تمہاری نوکری کا ہی نہیں، میری پرموشن کا بھی ہے۔'' مگر اس وقت تک جوزف کی آواز نٹراجن کے کانوں میں بھی پڑ چکی تھی۔ نٹراجن دفتر کا اکاؤنٹنٹ تھا اور بعض حسابی دھاندلیوں کے سلسلہ میں اس کے خلاف تحقیقات چل رہی تھیں اور فائل اس وقت ڈائرکٹر کی میز پر زیرِ تصفیہ تھی۔

نٹراجن نے پکار کر کہا ''جوزف تم فکر نہ کرو، میں اس کتے کو پکڑوں گا۔ ڈائرکٹر صاحب کے کتے کے لیے میں اپنی جان کی بازی لگا دوں گا۔ میں اس کے لیے اپنا آخری قطرۂ خون بھی بہا سکتا ہوں، جہاں جہاں اس کا پسینہ گرے گا وہاں وہاں میں اپنا خون بہا دوں گا۔'' اس نے اپنا تھیلا نیچے رکھا اور کمپاؤنڈ میں بھاگنے لگا۔

ورما جی نے پکار کر کہا ''نٹراجن! حساب میں دھاندلی کرتے ہو تو ضرور کرو مگر کتے کو پکڑنے کے معاملے میں دھاندلی نہ کرو۔ جوزف نے پہلے مجھ سے اس کتے کو پکڑنے کے لیے کہا تھا، تم بیچ میں کیوں آتے ہو؟''

نٹراجن نے کہا: ''میں جانتا ہوں کہ تمہاری ترقی کی فائل ڈائرکٹر کی میز پر ہے، لیکن تمہیں یہ بھی جاننا چاہیے کہ میرے خلاف جو تحقیقات چل رہی ہیں اس کی فائل بھی ڈائرکٹر کی میز پر ہے۔ اس کتے کو پکڑنے کا مجھے بھی اتنا ہی حق پہنچتا ہے جتنا کہ تمہیں۔ پھر کیا تم نے کتوں کو پکڑنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟''

اور پھر تینوں کمپاؤنڈ میں بھاگنے لگے۔ کتا کہیں نظر نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد کمپاؤنڈ کے ایک گوشہ میں انہیں کتا نظر آ گیا۔ کتے کی حرکتوں اور بے چینی سے پتہ چلتا تھا کہ اُسے ایک کھمبے کی تلاش ہے۔

ورما جی جوزف سے بولے'' لگتا ہے بے چارہ کتا پیشاب کرنا چاہتا ہے اور اسے کوئی کھمبا نہیں مل رہا ہے۔ تم اور نٹراجن یہیں ٹھہرے رہو، میں اپنی ٹانگ کھمبے کے طور پر اس کے سامنے رکھ دوں گا۔''

نٹراجن بولا'' نہیں! یہ نہیں ہوسکتا، میں اسے پیشاب کرنے کا موقع دیئے بغیر پکڑوں گا۔''

ورما جی بولے'' تم تو قصائیوں سے زیادہ بے رحم نکلے۔ قصائی تک کسی جانور کو ذبح کرنے سے پہلے اُسے پانی پلا دیتا ہے۔ اگر تم نے اسے پیشاب نہیں کرنے دیا تو میں ڈائرکٹر صاحب سے شکایت کردوں گا۔ یہ کہہ کر ورما جی اپنی ٹانگ، کتے کے آگے رکھنے چلے۔ نٹراجن نے پیچھے سے اُن کی کمر میں ہاتھ ڈال دیئے اور اُنہیں اپنی طرف کھینچنے لگا۔ کتا اُن کی حرکتوں سے چوکنا ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ تینوں کتے کے پیچھے بھاگے۔ اس دوڑ میں ایک مرحلہ ایسا بھی آیا جب نٹراجن اس کتے کو آسانی سے پکڑ سکتا تھا۔ اس کا ہاتھ اس کے گلے میں پڑے ہوئے پٹے تک پہنچنے ہی والا تھا کہ ورما جی نے نٹراجن کی ٹانگ میں اپنی ٹانگ کچھ اس طرح پھنسا دی کہ وہ منہ کے بل گر پڑا۔

ورما جی طالب علمی کے زمانے میں فٹ بال کے بہترین کھلاڑی رہ چکے تھے۔ بچپن کا تجربہ کبھی رائیگاں نہیں جاتا۔ نٹراجن کے منہ سے اچانک خون نکلنے لگا۔ اس نے پکار کر کہا'' ورما جی! آپ کتے کو پکڑ رہے ہیں یا فٹ بال کھیل رہے ہیں۔ پھر فٹ بال کھیلتے ہوئے آپ فاؤل ضرور کریں لیکن کتے کو پکڑنے کے معاملہ میں فاؤل بالکل نہیں چلے گی۔''

نٹراجن کے منہ سے نکلتے ہوئے خون کو دیکھ کر ورما جی نے کہا'' نٹراجن! تم نے تو کہا تھا کہ تم اس کتے کو پکڑنے کے لیے آخری قطرۂ خون بھی بہا سکتے ہو لیکن لگتا ہے تم پہلے ہی قطرۂ خون پر ٹپٹا گئے ہو۔''

نٹراجن بولا: '' ورما جی میں یوں آسانی سے ہمت ہارنے والا نہیں ہوں۔ میرے آباؤ اجداد نے سری رنگا پٹنم کی لڑائی میں انگریزوں کے خلاف اپنی جان کی بازی لگائی تھی۔ میری رگوں میں خالص خون دوڑ رہا ہے، میں اس کتے کو پکڑ کر ہی دم لوں گا۔''

اس اثناء میں سارے دفتر میں یہ خبر آگ کی طرح پھیل گئی کہ ڈائرکٹر کا کتا چھوٹ گیا ہے۔ سارے عہدہ دار اور کلرک اپنے اپنے کمروں سے باہر نکل آئے اور اپنی اپنی مجبوری کے مطابق اسے پکڑنے کے لیے بھاگنے لگے۔ لیکن اس جستجو میں ورما جی سب سے پیش پیش تھے۔ لگتا تھا وہ ترقی کے موقع کو کسی بھی قیمت پر ہاتھ سے جانے نہیں دیں گے۔ انہوں نے ایک لمبی جست لگا کر اُسے پکڑنے کی کوشش کی، مگر کتا بڑا چالاک تھا۔ اس نے اچانک اُن کی پتلون کا سیدھا پائنچہ اپنے دانتوں میں پکڑ لیا۔ کتا خونخوار تو تھا ہی اس نے ایک ہی جھٹکے میں ورما جی کی پتلون کے سالم پائنچہ کا رشتہ بقیہ پتلون سے توڑ دیا۔ مگر ورما جی تب بھی ہراساں یا نادم نہیں ہوئے۔ بولے: ''ذرا اس کتے کی ہوشیاری تو دیکھو کیسا سمجھدار کتا ہے۔ اس نے میری پتلون کا وہی پائنچہ کھینچا ہے جس میں چار پانچ پیوند لگ چکے تھے۔ ہائے کیا ذہین کتا ہے۔ میں تو قربان جاؤں اس کی ذہانت کے۔'' اور ورما جی نے واقعی اُس کتے کی فرضی بلائیں لیں۔

کتے کے جی میں نہ جانے کیا آئی کہ وہ اچانک کمپاؤنڈ سے بھاگ کر ریسپشنسٹ کے کمرے میں چلا گیا۔ دفتر کی ریسپشنسٹ بڑی خوبصورت تھی۔ وہ سارا دن اپنے چہرے کا میک اپ بنانے میں لگی رہتی تھی۔ جب بھی کوئی اس کے کاؤنٹر پر آتا تو اچانک ٹوتھ پیسٹ بنانے والی کمپنیوں کا جیتا جاگتا اشتہار بن جاتی تھی۔ وہ جب ہنس کر کسی کا استقبال کرتی تھی تو لوگ یہ تک بھول جاتے تھے کہ وہ آخر کس کام سے دفتر میں آئے تھے۔ دفتر اور اہلِ غرض کے درمیان ریسپشنسٹ کی مسکراہٹ ایک دیوار کی طرح حائل تھی۔ بہت سے کیس تو وہ اپنی مسکراہٹ سے ہی نپٹا دیا کرتی تھی۔ دفتر کے باب الداخلہ پر اس کی مسکراہٹ یوں تھی جیسے گولکنڈہ کے قلعہ کے دروازہ پر عبدالرزاق لاری۔ اس مسکراہٹ کو عبور کرنا بڑا دشوار کام تھا۔ جب کتا اس کے کاؤنٹر پر پہنچا تو وہ حسبِ دستور اپنی ابروؤں کو مزید سیاہ بنانے کے بعد لپ اسٹک کی مدد سے اپنے ہونٹوں کو مزید سرخ کرنے میں مصروف تھی۔ کتے کو دیکھتے ہی اس کی تاریخی مسکراہٹ اچانک غائب ہوگئی اور آنکھیں دھیرے دھیرے باہر کو نکلنے لگیں۔ وہ گھبرا کر کاؤنٹر پر چڑھ گئی۔ کتے کے پیچھے پیچھے دفتر کے دوسرے لوگ بھی کاؤنٹر پر پہنچے۔ ریسپشنسٹ کی گھبراہٹ کو دیکھ کر سیکشن آفیسر

جمال الدین نے کہا: ''میڈم! گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ ڈائرکٹر صاحب کا کتا ہے۔تم اپنی مسکراہٹ کا آغاز کروتا کہ یہ کتا مسحور ہوجائے اور ہمیں اس کو پکڑنے میں آسانی ہو۔'' مگر وہ مسکراہٹ جو فی البدیہہ شعر کی طرح اس کے ہونٹوں پر آتی تھی کہیں غائب ہوگئی۔

مگر کتا شاید عورتوں کے لیے ''نرم گوشہ'' رکھتا تھا یا پھر شاید اس خیال سے کہ اُن دنوں عورتوں کا بین الاقوامی سال منایا جارہا تھا، وہ وہاں سے اچانک بھاگ کھڑا ہوا اور کھڑکی کو پھلانگتے ہوئے ایڈمنسٹریشن سیکشن کے کمرے میں پہنچ گیا۔سیکشن آفیسر کلکرنی کو ڈائرکٹر صاحب کے کتے کے بھاگنے کی اطلاع تو مل چکی تھی مگر وہ اسے پکڑنے میں عملاً حصہ لینے سے مجبور تھے کیوں کہ انہیں ایک ضروری فائل ٹھیک بارہ بجے ڈائرکٹر کے پاس پیش کرنی تھی اور بارہ بجنے میں صرف آدھا گھنٹہ باقی رہ گیا تھا۔کتا کلکرنی کے کمرے میں آیا تو وہ تعظیماً اُٹھ کھڑے ہوئے۔کتے نے پہلے تو میز پر چھلانگ لگائی اور پھر اُن کی میز پر پڑی ہوئی وہ فائل اپنے دانتوں سے اُٹھائی جس پر " Top Priority " لکھا ہوا تھا۔ کمرہ کے باہر اور اندر جمع لوگ کتے کی اس حرکت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔لوگوں نے کہا: ''دیکھو، کیسا ہوشیار کتا ہے، دفتر کے اصولوں سے کتنا واقف ہے اس نے صرف وہی فائل اُٹھالی جس پر " Top Priority " لکھا ہوا تھا۔'' کلکرنی نے چیخ کر کہا'' ارے! یہ کیا۔ مجھے تو یہ فائل ٹھیک بارہ بجے ڈائرکٹر کے پاس پیش کرنی ہے۔کتے کو پکڑو یا نہ پکڑو اس فائل کو تو اس کے منہ سے چھینو۔'' کتے نے اس بار پھر ذہانت کا ثبوت دیا۔ڈائرکٹر کا نام سنتے ہی کتے نے فائل اپنے منہ سے چھوڑ دی اور سینارٹی کلرک سبھاش بگائی کا ٹفن باکس لے کر بھاگ گیا۔سبھاش بگائی کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔اس نے چیخ کر کہا'' دوستو! یہ ٹفن باکس اس کے منہ سے چھینو، یہ میری عزت کا سوال ہے۔اگر کتے نے اس ٹفن باکس کو کھول لیا تو میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہوں گا۔آج تک دفتر میں کسی کو یہ پتہ نہیں ہے کہ میں سالن کے بغیر ہی ایک چپاتی ٹفن باکس میں ڈال کر لاتا ہوں۔پھر یہ اکلوتی چپاتی بھی اس قابل نہیں ہے کہ اسے ڈائرکٹر صاحب کا کتا کھا سکے۔''

اتنے میں کتا بھاگ کر محافظ خانہ میں پہنچا۔محافظ خانہ کا انچارج رحمت علی سارا

دن سونے میں مصروف رہتا تھا، اس وقت بھی وہ سونے میں مصروف تھا۔ لوگوں نے پکار کر کہا: ’’ بھئی ڈائرکٹر صاحب کا کتا تمہارے محافظ خانہ میں آ گیا ہے، کم از کم اب تو جاگو۔‘‘

رحمت علی نے ایک جماہی لیتے ہوئے کہا۔ ’’کتا محافظ خانہ میں آ گیا ہے تو تم کیوں گلہ کرتے ہو۔ وہ یہاں محفوظ رہے گا۔ بھلا آج تک محافظ خانے سے کوئی چیز غائب ہوئی ہے۔؟‘‘

ورما جی نے کہا۔ ’’یار تم اس کتے کو پکڑنے میں ہماری مدد کرو۔‘‘

رحمت علی نے کہا ’’اب بہت دیر ہو چکی، میں ڈائرکٹر کے کتے کو نہیں پکڑوں گا، کیوں کہ میں تو کل سے ریٹائر ہو رہا ہوں۔ میری قسمت اب اس کتے سے بہت آگے نکل گئی ہے ___ !‘‘

ورما جی نے اپنی پرموشن کے لیے آخری کوشش کرنا چاہی مگر نٹراجن نے پھر انہیں پیچھے سے کھینچ لیا۔

دفتر میں شور وغل سُن کر ڈائرکٹر باہر نکل آیا۔ اس نے دیکھا کہ سارا دفتر اس کے کتے کو پکڑنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔ اس نے اپنے کتے کو پیار سے پکارا۔ کتے نے ڈائرکٹر کو دیکھ کر فوراً اپنی دُم ہلانی شروع کر دی اور اس کے قدموں میں لوٹنے لگا۔ ڈائرکٹر نے بڑی بے نیازی کے ساتھ اپنے کتے کو پکڑا اور اسے گاڑی میں بٹھا دیا۔ ہم نے دیکھا اس وقت دفتر کے سارے عہدیداروں کی دُمیں ہل رہی تھیں۔ ڈائرکٹر چپ چاپ اپنے کمرے میں واپس ہو گیا۔

ورما جی اپنی پھٹی ہوئی پتلون کو سنبھال کر اپنی سیٹ پر پہنچے تو اُن کے ساتھی نے انہیں بتایا کہ اُن کی پرموشن کے سلسلے میں جو فائل ڈائرکٹر کی میز پر زیرِ تصفیہ تھی اب واپس آ گئی ہے۔

انہوں نے پوچھا ’’کیا تصفیہ ہوا؟‘‘

ساتھی نے جواب دیا۔ ’’اب تمہیں اپنی پرانی تنخواہ میں ہی نئی پتلون سلوانی ہوگی۔‘‘

اُدھر نٹراجن جب اپنی میز پر پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ اس کے خلاف الزامات ثابت ہو چکے ہیں اور نٹراجن کو یوں لگا جیسے سری رنگا پٹنم کی لڑائی میں اُس کا آخری قطرۂ خون اب ٹپکنے ہی والا ہے۔

دوپہر میں دفتر کی کینٹین میں ورما جی اور نٹراجن ملے تو دونوں گلے سے لگ گئے، اس لیے کہ اب ڈائرکٹر کا کتا ان دونوں کے بیچ سے غائب تھا۔

(بالآخر۔ ۱۹۸۲)

قصّہ داڑھ کے درد کا

اَور ایک دن اچانک ہماری داڑھ میں یوں درد شروع ہوگیا جیسے آسمان پر یکا یک قوسِ قزح نکل آتی ہے اور قوسِ قزح کا نکل آنا تھا کہ ساتوں طبق روشن ہو گئے۔ یوں تو ہم انواع و اقسام کے ''دردوں'' سے گزر چکے تھے۔ پیٹ کا درد، سر کا درد، دل کا درد، قوم کا درد اور اولاد کے درد سے لے کر خواجہ میر درد تک، ہم سبھی دردوں سے آشنا تھے لیکن داڑھ کا درد ہمارے لیے بالکل نیا تھا۔ اُردو شاعری میں جگہ جگہ ایسے مصرعے پڑھتے آئے تھے۔

ع آج کچھ درد میرے دل میں سوا ہوتا ہے
ع درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

لیکن ہمیں ان مصرعوں کی صداقت پر کبھی یقین نہیں آیا تھا کیوں کہ ہم نے آج تک کبھی درد کو حد سے گزرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مگر صاحب داڑھ کا درد ہی ہمیں وہ واحد درد نظر آیا جو حد سے گزر جانے کی بڑی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر سیدھے جبڑے کی داڑھ میں درد ہو رہا ہو تو وہ صرف داڑھ تک محدود نہیں رہے گا بلکہ یہ حد سے گزر کر آپ کے گال کو آپ کے جبڑے سے کم از کم چار پانچ انچ دور کر دے گا اور جبڑے اور داڑھ کے درمیان ایک ''غیر جانبدار علاقہ'' پیدا کر دے گا۔ آپ کو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ کا گال آپ کے جسم سے کافی فاصلہ پر واقع ہے۔ آپ

سڑک پر چلنے لگیں تو یوں محسوس ہوگا جیسے آپ کا گال آپ سے آگے چل رہا ہو اور آپ صرف اُسے پکڑنے کے لیے بھاگے جا رہے ہوں۔ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے، جیسے وہ گال جو آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے آپ کا نہیں کسی اور کا ہے۔ جبڑے اور گال کے درمیان یہ جو ''ہجر کی کیفیت'' پیدا ہو جاتی ہے وہ بڑی کربناک ہوتی ہے اور یہی داڑھ کے درد کا نصب العین بھی ہے اگر یہ نہ ہو تو داڑھ کے درد میں مزہ ہی کیا باقی رہ جائے گا!

جب داڑھ کا درد اپنی حدوں کو پھلانگ کر کائنات کی وسعتوں میں پھیلنے کی کوشش کرنے لگتا ہے تو آدمی اس درد کی وسعت کے آگے ایک ادنی سا ذرّہ معلوم ہونے لگتا ہے۔ جب پہلے پہل ہمارے سیدھے جبڑے والی داڑھ کا درد حد سے سوا ہو گیا اور ہم سیدھی جانب زیادہ جھکاؤ محسوس کرنے لگے تو اس عدم توازن کے احساس نے ہم میں بڑی بے چینی پیدا کر دی۔ آئینہ میں صورت دیکھی تو پتہ چلا کہ آئینہ میں ہماری جگہ ایک بھوت کھڑا ہے۔ ہم گھبرا کر فوراً دانتوں کے ایک ڈاکٹر کے پاس بھاگے۔ وہ ہمیں پہلے سے جانتے تھے لیکن داڑھ کے درد کے ساتھ انہوں نے ہمیں پہچاننے سے انکار کر دیا۔ ہم نے اس بات کی شکایت کی تو بولے ''بھائی صاحب! داڑھ کے درد کے بعد آدمی کی پہچان مشکل ہو جاتی ہے۔ مجھے تو اپنے سارے ہی مریض ''ہم شکل'' نظر آتے ہیں۔ کس کس کو کہاں تک پہچانوں؟۔ یوں بھی آپ کے سامنے اگر بہت ساری ڈبل روٹیاں ایک ساتھ رکھ دی جائیں تو آپ ان ڈبل روٹیوں کو کیسے پہچانیں گے کہ یہ ڈبل روٹی زید ہے اور وہ ڈبل روٹی بکر ہے۔ داڑھ کے درد کی خوبی یہی ہوتی ہے کہ آدمی کے چہرے کو دیکھئے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ چہرہ ڈبل روٹی بنانے کی مشین میں سے ڈھل کر نکلا ہے۔''

ڈاکٹر صاحب کی اس طویل اور دلچسپ گفتگو کے بعد جب ہم نے اپنی غرض و غایت بتانی چاہی تو وہ بولے ''غرض و غایت بتانے کی ضرورت نہیں ہے کیوں کہ آپ کا گال خود اس غرض و غایت کی غمازی کر رہا ہے۔'' یہ کہہ کر انہوں نے ہمارا منہ کھولنا چاہا تو یوں لگا جیسے منہ پر تالا لگ گیا ہو۔ بڑی مشکل سے انہوں نے ایک ایسا زاویہ بنایا کہ ہماری وہ داڑھ انہیں نظر آ گئی جو ہمارے سارے وجود کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے ہمارا منہ غڑاپ سے بند کرتے ہوئے کہا ''اس وقت تو میں اس داڑھ کو نہیں نکال سکتا

چند روز اور اس داڑھ کے ساتھ نباہ کیجئے۔'' ہم نے کہا'' ڈاکٹر صاحب مجھے اس داڑھ کے ساتھ نباہ کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے لیکن یہ جو میری گردن پر ڈیڑھ چہرہ اُبھر آیا ہے۔ کم از کم اسے تو ٹھیک کر دیجئے۔ یہ عدم توازن مجھ سے اور بالخصوص میری بیوی سے بالکل نہ دیکھا جائے گا۔''

وہ بولے'' بھیا! ڈیڑھ چہرے میں توازن و تناسب پیدا کرنے کا ایک ہی علاج ہے۔''

ہم نے پوچھا'' وہ کیا؟''

بولے'' کسی طرح آپ کے بائیں جبڑے والی داڑھ میں بھی درد کو داخل کرنا ہوگا۔ پھر یہ درد بھی پھیل کر آپ کے بائیں جبڑے کی حدوں کو پھلانگتا ہوا کائنات کی وسعتوں میں پھیل جائے گا اور اُس کے بعد آپ کے دونوں جبڑے'' جیومیٹری'' کے اصولوں کے مطابق مساوی ہو جائیں گے، کہیے تو آپ کے بائیں جبڑے کی داڑھ میں درد کا افتتاح فرما دوں۔''

ہم نے کہا'' ڈاکٹر صاحب، چاہے کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو، میں چاہتا ہوں کہ آپ میری داڑھ کو نکال پھینکیں۔ میں یوں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ذلّت کی موت مرنا نہیں چاہتا۔ ٹیپو سلطان نے کیا خوب کہا تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سال کی زندگی سے بہتر ہوتی ہے۔''

ڈاکٹر صاحب بولے'' قبلہ، خبردار! داڑھ کا درد اب فلسفہ بکنے لگا ہے۔ یہ بڑی خطرناک اسٹیج ہے۔ اپنے آپ پر قابو پایئے ورنہ تاریخ میں ٹیپو سلطان کا تو کچھ بھی نہیں بگڑے گا لیکن آپ کا رہا سہا جغرافیہ بھی برباد ہو جائے گا۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر میں ہر مریض کی داڑھ فوراً نکال دیا کروں تو میرا کاروبار کیسے چلے گا؟۔ ایک داڑھ پر مجھے کم از کم سو روپے تو ملنے ہی چاہئیں۔ آپ اپنی داڑھ کا پہلے سو روپے کی حد تک علاج کرائیں، اس کے بعد میں بلا چوں و چرا آپ کی داڑھ نکال دوں گا۔ یہ باتیں کہتے ہوئے اچانک ڈاکٹر صاحب کی مصنوعی بتیسی اُن کے منہ سے باہر نکل آئی اور وہ اپنے پوپلے منہ سے بولے'' اَب آپ میری فیس مشورہ دیجئے اور چلتے بنئے۔''

ہم نے کہا ”حضور! آپ نے مشورہ ہی کون سا دیا ہے جو میں آپ کو اس کی فیس ادا کروں؟“

وہ بولے ”میں نے تو تمہیں ایک زرّین مشورہ دیا ہے کہ داڑھ کے درد کو فلسفہ سے دور رکھو ورنہ آدمی نہ رہو گے، فلسفی بن جاؤ گے۔“

ہم غصّے کے مارے ڈاکٹر صاحب کے کلینک سے باہر نکل آئے چند قدم ہی چل پائے تھے کہ داڑھ مذکور میں اچانک بجلی سی کوندگئی۔ برق کی ایک رو تھی جو داڑھ سے نکل کر سارے بدن میں لہراگئی۔ ایک تجلّی تھی جو آنکھوں کو چکاچوند کرگئی۔ یوں لگا جیسے ہماری داڑھ میں اچانک ایک ہرن نے کلیلیں بھرنا شروع کر دیا ہو، جیسے کسی نے ہماری داڑھ میں توپ داغ دی ہو یا ایک ٹرین چلتے چلتے ہماری داڑھ میں پٹری سی اُتر گئی ہو یا جیسے ہماری داڑھ میں فوجی انقلاب آیا ہو۔ کیفیات کا اتنا ہجوم تھا کہ ہمارے لیے یہ پتہ چلانا مشکل تھا کہ ہماری داڑھ میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں؟۔ یوں لگتا تھا جیسے ہم سراپا داڑھ بن گئے ہیں۔

ہم درد کے اس اچانک حملے سے سنبھلنے کے لیے ایک الیکٹرک پول کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے اور ہماری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ یوں لگا جیسے ساری کائنات ایک بہت بڑی داڑھ ہے۔ داڑھ ہی کائنات ہے۔ داڑھ کے سوا اس دنیا میں کچھ بھی نہیں۔ ہر شے داڑھ سے شروع ہوتی ہے اور داڑھ پر ختم ہو جاتی ہے۔ عدم سے پہلے بھی داڑھ تھی اور ہستی سے پرے بھی داڑھ ہے، ازل داڑھ اور ابد داڑھ ___ یکلخت ہمیں یوں محسوس ہوا جیسے سورج ہمارے منہ میں آ گیا ہو اور ہم اُسے چبا چبا کر کھا رہے ہوں۔ جی چاہتا تھا کہ سورج کو چبا کر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے جائیں۔ پھر سورج کے اِن ٹکڑوں کو لوگوں میں بانٹ دیں کہ بھئی اپنے اپنے گھروں میں اُجالا کرو۔ ہر شخص کا اپنا سورج الگ ہونا چاہیے۔ ہر شخص کی صبح الگ ہونی چاہیے۔ اتنی بڑی کائنات کو ایک سورج کے تابع کر دینا مناسب نہیں ہے۔ آؤ ہم سب مل کر سورج کو تقسیم کریں اور اس کے ٹکڑوں کو اپنی جیب میں رکھ لیں تا کہ سند رہے اور وقتِ ضرورت کام آئے۔

داڑھ کے درد کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ درد بالاقساط ہوتا ہے یعنی درد کی ایک لہر

جاتی ہے اور دوسری آتی ہے۔ جب درد کی پہلی لہر جا چکی تو ہم پر یہ عظیم انکشاف ہوا کہ درد کی ہر لہر کے ساتھ ہم میں "جدید شاعر" بننے کی زبردست صلاحیتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایسے پیغمبرانہ انکشافات صرف داڑھ کے درد میں ہی ممکن ہیں۔ اچانک ہم پر یہ راز کھلا کہ "جدید شاعری" اصل میں "داڑھ کے درد" کی شاعری ہے، جس میں آدمی کا سارا کرب سمٹ آتا ہے اور وہ سورج کو چبا کر کھا جانے کی منزل میں پہنچ جاتا ہے۔ ہم اب تک حیران تھے کہ ہمارے اکثر جدید شاعر ایسے تکلیف دہ اور کرب انگیز خیالات کو آخر کس طرح اتنی آسانی اور روانی سے اپنی شاعری میں پیش کر دیتے ہیں۔ اب داڑھ کے درد سے سابقہ پڑا تو احساس ہوا کہ یہ تو بڑی آسان سی بات ہے۔ جدید شاعر بننا ہو تو پہلے اپنی داڑھ میں درد پیدا کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح

ع ـــ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں

آپ یقین کریں کہ درد کی پہلی لہر کے ساتھ ہی ہم نے شاعر بن جانے کی ٹھان لی تھی اور سوچا تھا کہ دوسری لہر میں ڈوب کر ایک شاہکار نظم نکال لائیں گے لیکن درد کی پہلی لہر اور دوسری لہر کے درمیان جو وقفہ ہوتا ہے وہ آدمی کو پھر خیال کی رفعتوں سے پستیوں میں لے آتا ہے۔ ہم نے سوچا کہ جب ہمارے پاس کوئی تخلص ہی نہیں ہے تو پھر نظم کہنے کا کیا فائدہ؟

خیر صاحب ہم اسی طرح درد کی لہروں سے گزرتے ہوئے اپنے گھر پہنچ گئے۔ نہ جانے کیا بات تھی کہ اس دن گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا۔ جو بیٹا ہمیں دیکھتے ہی لپٹ جایا کرتا تھا وہ ہمیں دیکھ کر اُلٹے پاؤں بھاگ گیا۔ وہ بیوی جو ہمارے گھر میں قدم رکھتے ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ ہمارے سامنے رکھ دیتی تھی، وہ ہمیں دیکھ کر چپ چاپ رسوئی گھر میں چلی گئی۔ ہم گھر کی اس بدلی بدلی فضا کو بھانپ نہ سکے۔ جب بڑی دیر تک کسی نے ہمارا حال نہ پوچھا تو ہم نے غصے سے کہا: "آخر اس گھر میں سب کو سانپ کیوں سونگھ گیا ہے؟ آخر معاملہ کیا ہے؟"

ہمارے اس سوال کو سُن کر بیوی نے کہا "مجھے آپ سے ہمیشہ یہی شکایت رہی کہ دفتر میں اپنے عہدیدار کی ڈانٹ سُن کر آتے ہیں اور غصہ ہم لوگوں پر نکالتے ہیں۔

میں تو آپ کے گھر میں داخل ہوتے ہی سمجھ گئی تھی کہ آج آپ کا ''موڈ'' اچھا نہیں ہے۔ جبھی تو آپ گال پُھلائے اور منہ بسورے گھر میں داخل ہو رہے ہیں۔ اب کوئی آپ کا حال پوچھے تو کیسے؟ آپ تو ایسی حالت میں کاٹ کھانے کو دوڑتے ہیں۔ میں سمجھتی ہوں کہ آج آپ کے عہدیدار نے کچھ زیادہ ہی ڈانٹ پلائی ہے۔ ذرا دیکھئے تو آپ کا گال کتنا پھول گیا ہے۔ اتنی ڈانٹ تو آپ نے پہلے کبھی نہیں کھائی تھی ــــــــــ ہم نے درد سے کراہتے ہوئے کہا'' اری نیک بخت تجھے ہمیشہ فضول حجت کرنے کی عادت پڑی ہوئی ہے۔ میں داڑھ کے درد کی وجہ سے مرا جا رہا ہوں اور تجھے اس میں میرے عہدیدار کی ڈانٹ دکھائی دے رہی ہے۔''

ہمارے اس انکشاف کو سنتے ہی سارے افرادِ خاندان کی باچھیں کِھل اُٹھیں۔ بچے دوڑ کر ہم سے لپٹ گئے اور بولے'' اگر سچ مچ آپ کی داڑھ میں درد ہے تو ہمیں اس بات کی بڑی خوشی ہے ورنہ ہم تو یہ سمجھ رہے تھے کہ آج بھی آپ دفتر سے ڈانٹ سُن کر آئے ہیں اور اب تھوڑی دیر میں ہماری پٹائی ہونے والی ہے۔''

داڑھ کے درد کے بعد آدمی خواہ مخواہ ہی مغرور آنے لگتا ہے۔ سیدھے جبڑے والی داڑھ کے درد کے زمانے میں ہی ہمارے آدھے دوست صرف اس لیے ہم سے کنارہ کش ہو گئے تھے کہ ہم صورتاً انہیں مغرور نظر آنے لگے تھے۔ جگہ جگہ ہمارے غرور کے چرچے ہونے لگے کہ صاحب ادھر جب سے دفتر میں اسے ترقی ملی ہے بس ہمیشہ منہ پُھلائے رہتا ہے۔ کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا بلکہ یوں کہیئے کہ ٹیلی گرام کی زبان میں بات کرتا ہے۔ سیدھے جبڑے میں اتنا غرور آ گیا ہے کہ یہ ہمیشہ دو تین انچ پھولا رہتا ہے۔''

اب یہ محض اتفاق تھا کہ ہماری ترقی اور داڑھ کا درد دونوں ایک ساتھ شروع ہوئے تھے ورنہ کہاں غرور اور کہاں ہم! بعد میں جب بائیں جبڑے والی داڑھ میں بھی درد شروع ہو گیا تو ہمارے بقیہ آدھے دوستوں نے بھی ہم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ نہ داڑھیں رہیں اور نہ ہی دوست۔ اب کِسے کِسے سمجھاتے پھریں کہ بھائی صاحب سارا قصور داڑھ کے درد کا ہے۔ ہم تو ازل سے معصوم آدمی ٹھہرے۔ زندگی میں ایک ہی بار ہم

نے غرور کا مظاہرہ کیا تھا جب ہم اپنی شادی کے موقعہ پر گھوڑی پر سوار ہو کر اپنی سابقہ دُلہن یعنی موجودہ بیوی کے گھر گئے تھے اور اس غرور کا جو نتیجہ برآمد ہوا ہے وہ ہمارے چھ بچّوں کی صورت میں دنیا پر ظاہر ہے۔ اس غرور کا کفر اس طرح ٹوٹا ہے کہ ہمیں خود 'غرور' کے معنی معلوم کرنے کے لیے ڈکشنری دیکھنے کی ضرورت پیش آتی ہے مگر کیا کریں کہ اس داڑھ کے درد کی وجہ سے ہم دنیا والوں میں ایک مغرور آدمی کی حیثیت سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔

ہمارے ساتھ ایک اور ستم بھی ہوا تھا یعنی نہ صرف ہم داڑھ کے درد میں مبتلا تھے بلکہ قدرت نے ہمارے عہدیدار کو بھی اس نعمتِ غیر مترقبہ سے نوازا تھا اور آپ تو جانتے ہیں کہ داڑھ کا درد رکھنے والے دو اشخاص کسی بات پر متفق نہیں ہوتے کیوں کہ داڑھ کے درد کے بعد آدمی ''داخلیت پسندی'' کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنی ذات کی تنہائی میں بند ہو کر اپنی بساط کے مطابق داڑھ کے درد کو قبول کرتا ہے۔ نتیجہ میں ''ترسیل کا المیہ'' پیدا ہو جاتا ہے۔ اکثر یوں ہوتا کہ ہم کوئی تجویز لکھ کر اُس کے پاس بھیج دیتے اور وہ اُسے مسترد کر دیتا۔ وہ کوئی آرڈر لکھ کر ہمارے پاس بھیجتا اور ہم اس میں نئی پیچیدگیاں پیدا کر دیتے۔ ''ترسیل کا المیہ'' اس نوبت کو پہنچ گیا تھا جہاں ہم دونوں میں دفتری آداب کے خلاف ''تو تو میں میں'' کا آغاز ہو گیا تھا۔ یہ غلط فہمی اور بھی بڑھتی مگر ایک دن جو ہم عہدے دار کے کمرے میں اچانک چلے گئے تو دیکھا کہ وہ اپنا گال پکڑے بیٹھا ہے۔ ہم نے پوچھا ''کیا آپ کی داڑھ میں کچھ ہو رہا ہے؟''

وہ بولا ''ہاں بہت درد ہے۔''

اس پر ہم نے اپنا گال پکڑتے ہوئے کہا ''ادھر بھی وہی حال ہے۔''

تب ہم نے اسے سمجھایا کہ ہم دونوں کے اختلافات کی اصل وجہ ہم دونوں کی داڑھیں ہیں۔ ہم دونوں کی داڑھوں میں جب ایک ساتھ درد ہوتا ہے تو اس کا لازمی انجام اختلافِ رائے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ آسان بات ہمارے عہدیدار کی سمجھ میں آ گئی۔

بعد میں ہم دونوں نے متفقہ طور پر ایک معاہدہ کیا۔ جب ہم کسی فائل میں کوئی

تجویز پیش کرتے تو اس تجویز کے نیچے دستخط کرنے کے بعد چھوٹے حروف میں ''داڑھ کا درد'' بھی لکھ دیتے۔ وہ فائل دیکھ کر سمجھ جاتا کہ یہ تجویز داڑھ کے درد کے دوران میں لکھی گئی ہے۔ اگر وہ اس تجویز کو مسترد کر دیتا تو وہ بھی دستخط کرنے کے بعد نیچے چھوٹے حروف میں ''داڑھ کا درد'' لکھ دیتا۔ کچھ دن بعد اس نے یہ طریقہ اپنا لیا تھا کہ جب بھی کوئی فائل اس کے سامنے پیش ہوتی تو وہ اس پر لکھ دیتا ''داڑھ کے درد کے بعد پیش کی جائے۔'' اس طرح دفتر میں دو اقسام کی فائلیں بن گئی تھیں یعنی داڑھ کے درد سے پہلے کی فائلیں اور داڑھ کے درد کے بعد کی فائلیں۔

فائلوں کی بات تو چھوڑیئے، ہم نے اپنی پوری زندگی کو اسی طرح دو حصوں میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ایک زندگی وہ جو داڑھ کے درد سے پہلے تھی اور دوسری زندگی وہ جو داڑھ کے درد کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ اب تو ہماری ساری داڑھیں اُکھڑ چکی ہیں ـــــ گویا ہم بھی اب دانتوں کے ڈاکٹر بن گئے ہیں۔ بلکہ یوں کہیے کہ اب تو ہماری مصنوعی بتیسی کے دانتوں کے گرنے کی بھی باری آ گئی ہے۔ مصنوعی بتیسی کے دانت نہ ٹوٹیں گے تو اور کیا ہوگا۔ کیونکہ جب ہم اپنی مصنوعی بتیسی نکال کر سو جاتے ہیں تو بچے اس بتیسی کو کھلونے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ گھنٹوں یہ اپنے ڈیڈی کے دانتوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ہم پوپلی شکایت کرتے ہیں تو بیوی کہتی ہے ''ایسی بھی کیا جلدی ہے، کھانا تو دس بجے کھاتے ہو، گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ اگر بچے آپ کی مصنوعی بتیسی سے کھیل لیتے ہیں تو ایسی کون سی آفت آ جاتی ہے۔ کبھی تمہیں اتنی تو توفیق نہیں ہوتی کہ بچوں کے لیے کھلونے ہی لے آؤ۔ اب بچوں نے تمہاری بتیسی کی شکل میں اپنے لیے ایک کھلونا ایجاد کر لیا ہے تو اس میں ناراض ہونے کی کیا بات ہے۔ یوں بھی تم گھر میں ہمیشہ منہ پُھلائے رہتے ہو۔ حسرت رہ گئی کہ بچے تمہارے ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ دیکھیں جو دانتوں کا دیدار کرادے۔ اب اگر بچے تمہاری مسکراہٹ کے بغیر دانت دیکھ کر خوش ہو لیتے ہیں تو انہیں خوش ہو لینے دو کہ یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔''

اور ادھر جب سے ہمارے بچپن کے دوست مانگے رام جی ہمارے پڑوسی بن کر آئے ہیں ہماری مصنوعی بتیسی بے گھر ہو گئی ہے۔ مانگے رام جی کو جب بھی کچھ کھانے

کی ضرورت پیش آتی ہے تو پکار کر کہتے ہیں ''بھیا اگر تمہاری بتیسی خالی ہو تو تھوڑی دیر کے لیے بھیج دینا۔ میں مونگ پھلی کھا کر اور سماج کے خلاف ذرا دانت پیس کر تمہاری بتیسی واپس کر دوں گا۔'' مانگے رام جی ہمارے ہم پیالہ و ہم نوالہ تو تھے ہی اب ''ہم دانت'' بھی ہو گئے ہیں۔

مگر صاحب کبھی کبھی ہمیں اُس زندگی کی یاد آتی ہے جو داڑھ کے درد سے پہلے تھی۔ کیسی ہنس مکھ اور تر و تازہ زندگی تھی۔ ہمارے گال کتنے سڈول تھے۔ ہمارا چہرہ کتنا متناسب تھا۔ نہ جانے ہمارا وہ چہرہ کہاں کھو گیا۔ اب تو صرف چہرے کی تہمت اپنی گردن پر اُٹھائے پھرتے ہیں۔

ع خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

(بہرحال۔ 1972)

صاحب باتھ روم میں ہیں

ایک دِن میں نے اپنے علاقہ کے نیتا بدری نارائن جی سے بات کرنے کے لئے فون کیا تو اُن کے پرائیویٹ سکریٹری نے کہا'' صاحب باتھ روم میں ہیں۔ تھوڑی دیر بعد فون کریں۔''

میں نے سوچا جب بدری نارائن جی باتھ روم میں ہیں تو کیوں نہ میں بھی باتھ روم ہو آؤں۔ جیسا راجہ ویسی پرجا۔ کچھ دیر بعد اپنے باتھ روم سے نکل کر میں نے انہیں پھر فون ملایا تو جواب آیا'' صاحب باتھ روم میں ہیں''۔

میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔'' صاحب باتھ روم سے کب تک باہر آجائیں گے؟''۔

سکریٹری بولا'' عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ موت اور آدمی کے باتھ روم سے نکلنے کا بھی بھلا کوئی وقت مقرر ہوتا ہے۔ وہ باتھ روم میں گئے ہیں تو کبھی نہ کبھی نکل ہی آئیں گے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟''۔

اور میں اُن اچھے دنوں کو یاد کرنے لگا جب نہ تو بدری نارائن جی کے گھر میں باتھ روم ہوا کرتا تھا اور نہ ہی میرے گھر میں۔ کتنے اچھے دن تھے وہ جب کسی پرائیویٹ سکریٹری اور ٹیلی فون کی مدد کے بغیر کھلے میدان میں اُن سے صبح و شام ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ بلکہ ہم لوگ تو ایک دوسرے سے کچھ دُور بیٹھ کر کام کی باتیں بھی کرلیا کرتے

تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بیچ بیچ میں کبھی ''ہیلو، ہیلو'' بھی کہنا پڑتا تھا۔

میں نے سوچا اتنی دیر میں کیوں نہ اُس افسر سے بات کرلی جائے جس کے پاس بدری نارائن جی سے سفارش کرانی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ اس افسر کا بھی ایک پرائیویٹ سکریٹری ہے اور کمبخت کے گھر میں وہ محفوظ جگہ بھی ہے جسے باتھ روم کہتے ہیں۔ چنانچہ سیدھا سا جواب آیا ''صاحب باتھ روم میں ہیں۔'' میں نے سوچا کہ کیوں نہ میں بھی پھر باتھ روم ہو آؤں۔ مگر اپنے خیال پر ہنسی بھی آئی کہ عام اور معمولی آدمی کی قسمت میں اتنی دیر تک باتھ روم میں رہنا کہاں لکھا ہوتا ہے۔ وہ بے چارہ تو دن بھر میں بڑی مشکل سے ایک بار ہی باتھ روم میں جانے کی ہمت کرسکتا ہے۔ اپنی پھوٹی قسمت کی وجہ سے اسے تو ڈرائنگ رُوم یا بیڈروم میں ہی رہنا پڑتا ہے۔ اب بھلا بتایئے کہ گھر میں رہنے کی یہ بھی کوئی جگہیں ہیں۔ خیر یہ ایک اعتبار سے اچھا بھی ہے کیوں کہ عام آدمی بھی اگر باتھ روم میں رہنے لگ جائے تو ملک کیسے ترقی کرے گا۔ اور مشکل یہ ہے کہ ملک کوتو باتھ روم میں بھیجا نہیں جا سکتا۔

خیر ایک گھنٹہ بعد میں نے بدری نارائن جی کو پھر فون ملایا۔ اس سے پہلے کہ اُن کا پرائیویٹ سکریٹری اُنہیں پھر باتھ روم میں بھیج دیتا میں نے خود ہی پوچھ لیا ''ہیلو! کہیں بدری نارائن جی باتھ ردم میں تونہیں ہیں؟''۔

سکریٹری حیرت سے بولا ''تمہارے سونگھنے کی طاقت بڑی زبردست لگتی ہے۔ اتنی دور سے پتہ چلا لیا کہ صاحب باتھ روم میں ہیں۔''

میں نے کہا ''بھیا! ایسی بات نہیں ہے۔ ایک گھنٹہ پہلے جب میں نے فون کیا تھا تو پتہ چلا تھا کہ وہ باتھ روم میں ہیں، میں نے سوچا اب تک واپس آگئے ہوں تو بات کرلوں''۔

سکریٹری بولا ''ایک گھنٹہ پہلے دوسرے پرائیویٹ سکریٹری نے اُنہیں وہاں بھیجا تھا۔ اب میری ڈیوٹی ہے۔''

میں نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ اب اُنہیں باتھ روم میں بھیجنے کی ذمہ داری تمہاری ہے۔''

سکریٹری بولا ''میری ڈیوٹی اس وقت شروع ہوگی جب وہ باتھ روم سے باہر آجائیں گے۔ ابھی تو وہ وہیں ہیں۔''

یہ سنتے ہی میرے ہاتھ سے ٹیلی فون کا ریسیور گر گیا۔ جب یہ نیچے گر گیا تو اس میں سے قہقہہ بھری آوازیں آنے لگیں ''رانگ نمبر۔ رانگ نمبر''۔

میں سوچنے لگا ہمارا ٹیلی فون سسٹم بھی عجیب ہے۔ ساری بات کرنے کے بعد پتہ چلتا ہے کہ آپ نے رانگ نمبر ملایا تھا۔ اس دن بھی میں نے بدری نارائن جی کا فون نمبر تو صحیح ملایا تھا لیکن وہ غلط جگہ مل گیا تھا۔ کیوں کہ ہم نے بدری نارائن جی کو ایک عالیشان کوٹھی میں بھیجا تھا اور وہ باتھ روم میں جا کر بیٹھ گئے۔ اس میں ہمارا یا ٹیلی فون سسٹم کا کیا قصور۔

شاید ہی کوئی دن ایسا جاتا ہو جب میں کسی بڑے آدمی کو فون کروں اور مجھے یہ اطلاع نہ ملے کہ وہ باتھ رُوم میں ہے۔ ادھر جب سے بڑے آدمیوں نے زیادہ سے زیادہ باتھ رُوم میں رہنے کی عادت ڈال لی ہے تب سے آدمی اور گھر دونوں کا تصور ہی بدل گیا ہے۔ پرسوں کی بات ہے۔ میں ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ فون کی گھنٹی بجی تو میری بیوی نے یہ کہہ کر فون رکھ دیا۔ ''جی! وہ تو باتھ رُوم میں ہیں؟''۔ میں نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھ کر پوچھا ''کیا گھر میں کوئی مہمان آیا ہے؟۔ میں تو تمہارے سامنے بیٹھا ہوں۔ پھر باتھ روم میں کون ہے؟''

وہ بولی ''تم ہو تم۔ اور کون ہوگا؟''۔

میں نے غصہ سے کہا ''مگر میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔''

وہ بولی ''وہ تو میں بھی جانتی ہوں کہ تم یہاں بیٹھے ہو۔ لیکن میری خواہش ہے کہ تم بھی بڑا آدمی بنو۔ تمہیں بھی بڑا آدمی بننے کا حق حاصل ہے۔ میں نے تو یہ دیکھا ہے کہ تم جب بھی کسی بڑے آدمی کو فون ملاتے ہو تو وہ ہمیشہ باتھ روم میں ہوتا ہے اور تم ہو کہ سارا دن ڈرائنگ رُوم میں بیٹھے مکھیاں مارتے رہتے ہو۔ آخر میں بھی تو بڑے آدمی کی بیوی بننا چاہتی ہوں۔ آج سے تم باتھ رُوم میں رہنے کی کوشش کرو۔ اگر نہیں رہتے تو میں وہاں رہنے لگ جاؤں گی، میں تو صرف ''پہلے آپ پہلے آپ'' کے چکر میں ماری جاری ہوں۔''

ایک زمانہ تھا جب گھر کے نقشہ میں باتھ رُوم ایسا ہی ہوتا تھا جیسے دُنیا کے نقشہ میں آسٹریلیا۔ بالکل الگ تھلگ۔ مگر اب باتھ رُوم ہی اصل گھر نظر آنے لگا ہے۔ پچھلے دنوں میں نے ایک اخبار میں اشتہار پڑھا تھا جس میں لکھا تھا ''ضرورت ہے ایک خوش نما بڑے باتھ رُوم کی، اس کے ساتھ اگر ایک اٹیچڈ بیڈ رُوم ہوتو ٹھیک رہے گا۔ نہ ہوتو بھی چلے گا۔'' میں نے سوچا تھا اشتہار دینے والا یقیناً پیٹ کی کسی بیماری کا مریض ہوگا مگر اب پتہ چلا کہ بڑا آدمی تھا۔ پیٹ بڑا بدکار ہے۔ پیچش کے مریض اور بڑے آدمی دونوں کو ایک ہی صف میں کھڑا کردیتا ہے۔ ایک بار ہمیں ایک بڑے آدمی کے باتھ رُوم میں جانے کا موقعہ ملا تھا۔ ہم تو اسے دیکھ کر ہی دنگ رہ گئے تھے۔ اتنا بڑا باتھ رُوم تھا کہ اِس میں ہمارا سارا گھر آنگن سمیت سما سکتا تھا۔ کیا خوش نما ٹائلیں تھیں۔ کیا بھڑ کیلے آئینے تھے۔ ہم تو اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر اتنا دنگ رہ گئے کہ اسے استعمال کئے بغیر ہی واپس آگئے اور بڑے آدمی سے ڈرتے ڈرتے کہا'' ہم آپ کی ہمت کو مان گئے کہ ایسی پیاری جگہ کو آپ باتھ رُوم کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہم میں یہ حوصلہ نہیں ہے۔ اگر اجازت ہوتو ہم آپ کے بیڈرُوم کو باتھ رُوم کے طور پر استعمال کرلیں۔'' اور اس کے بعد اس بڑے آدمی نے ہمیں کبھی اپنے گھر میں آنے نہیں دیا۔

دوستو! ہماری باتوں کا یہ مطلب نہ لیا جائے کہ ہم سرے سے باتھ رُوم کے ہی خلاف ہیں۔ ہم تو صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر آج کے بڑے آدمی نے اپنے رہن سہن کے طریقے بدل لئے ہیں اور وہ باتھ رُوم میں زیادہ رہنے لگا ہے تو پھر ٹیلی فون کا آلہ اپنے ڈرائنگ رُوم میں کیوں لگواتا ہے۔ باتھ رُوم میں ہی لگوالے بلکہ ڈائننگ ٹیبل بھی وہیں لگوالے تو کیا حرج ہے۔ کئی بار تو عوام پانچ پانچ برسوں تک بڑے آدمی کو ڈرائنگ رُوم اور اس کے دفتر میں ڈھونڈتے رہتے ہیں اور وہ باتھ رُوم میں بیٹھا رہتا ہے۔

(آخرکار۔ 1997)

اُردو کا آخری قاری

پھر یوں ہوا کہ ۲۰۰۰ عیسوی گزر گئی تو لوگوں نے بیسوی صدی سے صاف بچ کر نکل جانے اور اکیسویں صدی میں داخل ہونے کی خوشی بہت دُھوم دھام سے منائی۔ اُردو کے شاعر اور ادیب بھلا اس خوشی میں کیسے شریک نہ ہوتے، وہ تو خوشی منانے کے معاملہ میں ہمیشہ پیش پیش رہتے ہیں۔ دوسرے کی بھی شادی ہو تو ایک عدد سہرا لکھ کر اس کی خوشی میں شامل ہو جاتے ہیں۔ ہم نے اُردو زبان کے سوائے کسی اور زبان کے شاعر کو دوسرے کی شادی پر اس قدر والہانہ انداز میں خوش ہوتے نہیں دیکھا۔ ہمارا ایمان ہے کہ شادیوں میں اتنی آمد نہیں ہوتی جتنی کہ سہروں میں ہوتی ہے۔ شادیاں اتنی فی البدیہہ نہیں ہوتیں جتنے کہ سہرے فی البدیہہ ہوتے ہیں۔ شادی تو خیر پھر بھی شادی ہے، آدمی میں ظرف ہو تو وہ دوسرے کی شادی پر بھی خوش ہو سکتا ہے مگر ہم نے بعض باکمال شاعروں کو دوسروں کے بچوں کی بسم اللہ پر شعر و سخن کے دریا بہاتے دیکھا ہے۔ ادب کا ایسا بے جا مصرف کسی اور زبان میں دیکھنے کو نہیں ملا۔ غرض اُردو کے شاعروں اور ادیبوں نے بھی اکیسویں صدی کے خیر مقدم کے لیے بے پناہ نظمیں کہیں اور ایک دوسرے کو لہک لہک کر سُنائیں۔ مگر ایک منچلے شاعر نے اُردو ادیبوں اور شاعروں کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ اکیسویں صدی کی آمد کی خوشی ہمیں اپنے قارئین کے سامنے منانی چاہیے۔ بات معقول تھی مگر نہایت نامعقول وقت پر کہی گئی تھی۔ اُردو کے شاعر اور ادیب پہلے تو بغلیں جھانکنے

لگے کیوں کہ اُردو محاورے کے مطابق جھانکنے کے لیے بغل سے بہتر کوئی موزوں جگہ نہیں ہوتی، بغلوں میں قاری نہ ملا تو بولے'' یہ کون سی بڑی بات ہے، ہم جب اُردو میں ادبِ عالیہ کی تخلیق کررہے ہیں تو ہمارا کوئی قاری بھی ہوگا، کہیں نہ کہیں کوئی ہمارا کلام بھی پڑھتا ہوگا، ہم اپنے قاری کو جلد ہی تلاش کرلیں گے۔''

پھر ہر ادیب و شاعر نے اپنے اپنے علاقے میں قاری کی تلاش شروع کردی۔

ایک راہ گیر سے پوچھا: '' کیوں بھئی! کیا آپ اُردو کے قاری ہیں؟''

راہ گیر بولا: '' یہ قاری کیا چیز ہوتی ہے جی؟''

'' بھئی پاٹھک، پاٹھک کو قاری کہتے ہیں یعنی پڑھنے والا۔''

راہ گیر بولا '' اوہ، آئی سی۔ آپ کون سی صدی کی بات کررہے ہیں، سنتے ہیں کہ بیسویں صدی میں اُردو نام کی کوئی زبان بھی تھی، میرے دادا اُس زبان کے شاعر تھے۔ اپنا غیر مطبوعہ کلام میرے والد کو سونپ گئے تھے کہ بیٹا اس کلام کو محفوظ رکھنا، میں نے اس میں اپنا کلیجہ نکال کررکھ دیا ہے۔ یہ کلیجہ پچھلے برس تک میرے پاس تھا، پھر میری بیوی نے اسے ردّی والے کے ہاتھوں فروخت کردیا اور اس طرح میرے دادا جان مرحوم کے کلام کی رائلٹی وصول کرلی، چند دن اور گزر جاتے تو اُسے دیمک چاٹ جاتی اور یہ رائلٹی بھی نہ ملتی۔''

پھر ایک چور سے پوچھا، '' کیوں بھئی! کیا تم اُردو پڑھتے ہو؟''

چور بولا '' اُردو شریفوں کی زبان رہی ہے، اس سے ہمارا کیا تعلق۔ یوں بھی اُردو کے ذریعۂ تالے توڑے جاسکتے ہیں اور نہ ہی نقب لگایا جاسکتا ہے۔''

ایک تاجر سے پوچھا: '' لالہ جی کیا آپ اُردو پڑھتے ہیں؟''

تاجر بولا۔ '' دیکھو جی! ہم بزنس مین ہیں، کبھی گھاٹے کا سودا نہیں کرتے، ہم تو صرف منافع کی زبان جانتے ہیں۔ اُردو پڑھنے سے اگر ہمیں چار پیسے کا منافع بھی ہوتا تو ہم اسے ضرور پڑھتے۔''

ایک اور شخص سے پوچھا: '' کیوں جناب! کیا آپ اُردو جانتے ہیں؟''

وہ بولا '' میں تو نہیں جانتا البتہ میرے گھر میں ایک طوطا ہے جو بہت اچھی اُردو

جانتا ہے۔ آپ میرے گھر آئیں تو کہے گا'' مہربانی، آداب عرض ہے، تشریف لائیے، زہے نصیب ۔

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

'' اچھا تو آپ کا طوطا سخن فہم بھی ہے، کیا یہ شعر اسے آپ نے سکھایا ہے؟''

وہ شخص بولا:'' میں کیا جانوں کہ شعر کیا ہوتا ہے۔ اصل میں میرے دادا کے پاس ایک طوطا تھا جسے مذکورہ بالا اُردو آتی تھی۔ اس کے بعد ہمارے گھر میں جتنے طوطے آئے وہ اُردو سیکھتے گئے، طوطوں کے پاس یہ اُردو نسلاً بعد نسلٍ آئی ہے۔''

'' آپ نے اُردو کیوں نہیں سیکھی؟''

'' میں پرندوں کی بولیاں سیکھنے کو ضروری نہیں سمجھتا۔''

ایک اور شخص سے پوچھا'' کیا آپ اُردو جانتے ہیں؟''

وہ بولا'' میں اُردو سیکھنا تو چاہتا تھا مگر مجھے معلوم ہوا کہ اُردو بڑی میٹھی زبان ہے اور مجھے شوگر کی بیماری ہے۔ ڈاکٹروں نے میٹھی چیزوں سے پرہیز بتایا ہے نا اس لیے اُردو سے دور رہتا ہوں۔''

عام لوگوں سے مایوس ہوکر اُردو کے شاعر اور ادیب اُردو کے ایک مرحوم نقاد کے بیٹے کے پاس گئے اور کہنے لگے:

'' بھئی تمہارے والد بزرگوار تو اُردو کے پروفیسر اور نقاد تھے، وہ اُردو کی بقا کے لیے ایک انجمن بھی چلاتے تھے، تم اُردو ضرور جانتے ہوگے۔''

نقاد کے بیٹے نے کہا'' بھیا! کیوں میرے والد کی رُوح کو تکلیف پہنچاتے ہو۔ وہ اُردو کے نقاد تھے ضرور مگر صرف اس لیے اُردو کے نقاد تھے کہ اُنہیں کوئی دوسری زبان نہیں آتی تھی ورنہ کون اس زبان میں تنقید لکھتا۔ رہی اُردو کی بقاء کے لیے انجمن چلانے کی بات تو بھیا پیٹ بڑا بدکار ہے، شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے آدمی کو بہت سے دھندے کرنے پڑتے ہیں۔ میرے والد نے صرف انجمن چلائی تھی کسی کی جیب تو نہیں

کاٹی تھی۔ اگر وہ انجمن نہ چلاتے تو میری تین بہنوں کی شادیاں اس قدر دُھوم دَھام سے کون کرتا۔"

نقاد کے بیٹے سے پوچھا گیا "کیا تمہارے والد مرحوم نے تمہیں اُردو نہیں سکھائی تھی ____؟"

جواب ملا "میرے والد دوسروں کے لڑکوں کو اُردو ضرور پڑھایا کرتے تھے لیکن ذرا سوچیے وہ خود اپنی اولاد کے ساتھ ایسی زیادتی کیسے کر سکتے تھے۔ اُسی اُردو سے بچنے کے لیے تو انہوں نے مجھے انگلینڈ بھیجا تھا۔ میرے والد بڑے دُور اندیش آدمی تھے۔ اُردو کی خدمت اس ڈھنگ سے کرتے تھے کہ بھلے ہی اُردو تباہ ہو جائے لیکن خاندان پر کوئی آنچ نہ آئے۔ نتیجہ میں آج ہمارا خاندان دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے، اور اُردو کا حشر دیکھیے کیا ہو چکا ہے۔"

چراغ تلے اندھیرے کو دیکھ کر ادیب پریشان ہو گئے۔ انہوں نے فوراً ایک میٹنگ بُلائی تا کہ اس نازک صورتِ حال پر غور کیا جائے۔ جلسے کے صدر نے گلوگیر آواز میں کہا: "بھائیو! آج ہم ایک عجیب وغریب صورتِ حال سے دوچار ہیں، ہمارے پاس ساز تو ہے پر آواز نہیں، آگ تو ہے مگر دُھواں نہیں، پُھول تو ہے مگر خوشبو نہیں، ہوا تو ہے مگر طوفان نہیں، سمندر تو ہے مگر قطرہ نہیں، دل تو ہے مگر دھڑکن نہیں، غم تو ہے مگر آہ نہیں....."

اس پر کسی نے پکار کر کہا "قبلہ، یہ شاعری تو ہے مگر تقریر نہیں، صاف صاف بتایئے کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں؟"

صدرِ جلسہ نے کہا "بھائیو! میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم برسوں سے شعر کہہ رہے ہیں اور آج ہمیں پتہ چل رہا ہے کہ ہمارے کلامِ بلاغت نظام کو پڑھنے والا کوئی نہیں۔ ہم برسوں سے ایک دوسرے کو کلام سُنا کر خوش ہو رہے ہیں، ہمیں وہ قاری چاہیے جو خود شاعر یا ادیب نہ ہو، ہندوستان کی چھوٹی چھوٹی زبانوں کے پاس قاری موجود ہیں لیکن قاری نہیں ہے تو صرف اُردو کے پاس۔ ہمیں فوراً اپنے قاری کو تلاش کرنا چاہیے۔"

اس پر ایک ادیب نے تجویز پیش کی "ہمیں فوراً حکومت سے مطالبہ کرنا چاہیے

کہ وہ ہمارے شعراور افسانے پڑھنے کے لیے چند اُردو قاریوں کا تقرر کردے، ان قاریوں پر یہ ذمہ داری عائد کی جائے کہ وہ روزانہ پابندی سے دفتر آئیں اور آٹھ گھنٹے ہماری شاعری اور افسانوں کا مطالعہ کریں۔ یوں بھی اِدھر کئی برسوں سے ہم اُردو کے معاملہ میں حکومت کی طرف دیکھنے کے عادی ہوگئے ہیں، اُردو اکیڈمیوں کی امداد سے ہم کتابیں چھاپتے رہے ہیں، ان کتابوں پر انعام لیتے رہے ہیں۔ جب حکومت نے ان کتابوں کی اشاعت کا بندوبست کیا ہے تو حکومت کا یہ فرض بن جاتا ہے کہ وہ ان کتابوں کو پڑھنے کے لیے قاریوں کا انتظام بھی کرے۔ اگر حکومت ہمارے مطالبہ کو تسلیم نہیں کرتی تو ہم اس کے خلاف نظمیں کہیں گے، افسانے لکھیں گے اور حکومت کی اینٹ سے اینٹ بجادیں گے۔''

ایک شاعر نے کہا: ''بھائیو! اب ہماری اینٹ صرف محاورے میں ہی بج سکتی ہے۔ لہٰذا ہمیں اپنے طور پر قاری کو تلاش کرنا چاہیے۔ سرکاری قاری ہمارے ادب کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔ وہ ہمارے ادب کو بھی دفتر کی فائل بنادے گا۔''

بہت غور وفکر کے بعد یہ طے ہوا کہ اُردو قاری کی تلاش کے لیے ہندی اور انگریزی اخباروں میں اشتہار دیے جائیں۔ اُردو جریدوں میں اشتہار دینے کا سوال اس لیے پیدا نہیں ہوتا تھا کہ اُن کو صرف شاعر اور ادیب ہی پڑھتے تھے۔ چنانچہ دوسرے دن ہی اخباروں میں اشتہار چھپا:

اُردو کے قاری تم کہاں ہو؟

ہم اُردو کے شاعر اور ادیب اس بات سے بہت دُکھی ہیں کہ تم ہم سے رُوٹھ کر چلے گئے ہو، اگرچہ ہمیں پتہ نہیں کہ تم کب رُوٹھ کر چلے گئے، ہم شعروشاعری میں اس قدر مصروف رہے کہ تمہارے جانے کا احساس بھی نہیں ہوا، بھلے آدمی کوئی اس طرح روٹھ کر چلا جاتا ہے، جانے سے پہلے بتا تو دیا ہوتا، یوں چوروں کی طرح جانے کی کیا ضرورت تھی، چاہے کچھ بھی ہو ہم تمہارے جانے سے بہت دُکھی ہیں۔ کھانا تو ہم پہلے بھی نہیں کھاتے تھے۔ تمہارے غم میں ادھر ایک ہفتہ سے کسی شاعر نے ایک شعر بھی نہیں کہا ہے۔ تم اس اشتہار کو دیکھتے ہی فوراً چلے آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے۔ تمہیں کچھ بھی نہیں کہا جائے

گا۔ اگر واپسی کا کرایہ نہ ہو تو ہمیں لکھ بھیجو، ہم اُردو اکیڈمی کی طرف سے تمہارے لیے واپسی کا کرایہ بھیج دیں گے، پیسے کی فکر نہ کرو۔ اکیڈمی کے بجٹ کی بڑی رقم ہر سال لپس (LAPSE) ہو جاتی ہے۔ تم اُردو ادب کی آبرو ہو، تم اُردو کی آخری شمع ہو، تم اُردو کی مانگ کا سیندور ہو۔

نوٹ:۔ ''اگر کوئی شخص اُردو قاری کا پتہ بتائے تو اسے اُردو اکیڈمی کی طرف سے منہ مانگا انعام دیا جائے گا اور اُردو ادب کی اس عظیم خدمت کے صلے میں اس کا نام اُردو ادب کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔ یوں بھی اُردو ادب کی تاریخ لکھنے کے لیے ہمارے پاس سنہری روشنائی کا ہی استعمال کیا جاتا ہے۔''

اشتہار چھپنے کے بعد کئی دِنوں تک نہ قاری آیا اور نہ ہی کوئی اطلاع آئی، البتہ پندرہ دن بعد ایک مخبر کا خط انڈمان سے آیا کہ اُردو کا ایک قاری یہاں موجود ہے، خبردار کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے پائے، اس بات کو راز میں رکھا جائے۔ اگر اسے پہلے سے معلوم ہو جائے کہ آپ حضرات اسے لینے کے لیے آرہے ہیں تو وہ بھاگ جائے گا، اب وہ بڑی خوشحال زندگی گزار رہا ہے۔ کیوں کہ اب وہ اُردو نہیں پڑھتا، میں اس پر نظر رکھتا ہوں اور ہاں آتے ہوئے میرا وہ انعام بھی لیتے آیئے جو آپ کے اشتہار کے مطابق منہ مانگا ہوگا۔ پہلے آپ اپنے قاری کو دیکھ لیں اور اس کے بعد مجھے انعام دیں۔

اس اطلاع کا ملنا تھا کہ اُردو ادیبوں اور شاعروں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی، خوشی کی لہر کیسے نہ دوڑتی، آخر انہیں اُن کا قاری جو مل گیا تھا۔ شاعروں نے اپنی غزلوں کو مانجھنا اور افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں کو چمکانا شروع کر دیا۔

طے یہ کیا گیا کہ اُردو شاعروں اور ادیبوں کا ایک وفد چپکے سے انڈمان جائے اور اپنے قاری کو سمجھا بجھا کر لے آئے۔ چنانچہ ایک رات اُردو کے کچھ ادیب و شاعر اپنی پیٹھوں پر اُردو کے عصری ادب کو لادے جزیرۂ انڈمان کی دھرتی پر اُتر گئے۔ مخبر پہلے سے اُن کا انتظار کر رہا تھا۔ رات کے اندھیرے میں وفد کے ارکان دبے پاؤں اُردو کے آخری قاری کے گھر پہنچے۔ وہ اپنے گھر میں میٹھی نیند سو رہا تھا۔

مخبر نے کہا: ''بھائیو! اس مکان کو چاروں طرف سے گھیرے میں لے لو۔ آپ کا قاری اور میرا انعام بچ کر نہ جانے پائے۔''

شاعروں اور ادیبوں نے قاری کے گھر کے دروازے کے آگے عصری ادب کو اس طرح رکھ دیا کہ قاری اپنے گھر سے باہر نہ نکلنے پائے۔ صبح ہوئی تو قاری نے دیکھا کہ وہ اُردو ادیبوں اور اُردو ادب کے نرغے میں آچکا ہے۔

اس نے اندر سے پُکار کر کہا ''تم لوگ کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟''

وفد کے لیڈر نے کہا ''اے اُردو کے آخری قاری! ہم اُردو کے ادیب اور شاعر ہیں۔ ہم بڑی دُور سے تمہاری چوکھٹ پر آئے ہیں۔''

قاری نے پُکار کر کہا: ''اُردو کے شاعرو اور ادیبو! مجھے معلوم تھا کہ ایک دن تم میرے پاس ضرور آؤ گے مگر پہلے میرے دروازے کے سامنے سے اُردو ادب کو تو ہٹاؤ تاکہ میں باہر آسکوں۔''

اُردو ادب کو ہٹایا گیا تو قاری دروازہ کھول کر باہر آ گیا۔ اس کے آنے کی دیر تھی کہ ایک شاعر نے لپک کر سلام عرض کیا اور کہا ''حضور توجہ چاہتا ہوں، مطلع عرض کیا ہے...''

قاری پھر گھر کے اندر بھاگ گیا اور بولا ''بھائیو! میں ادب کے اس اچانک حملے کو برداشت نہیں کرسکوں گا۔ عرصہ ہوا کہ اُردو شعر سننے کی پریکٹس چھوٹ چکی ہے زبان کو مکرّر اور سُبحان اللہ کہنے کی عادت نہیں رہی۔''

اس پر وفد کے لیڈر نے کہا ''پیارے قاری! ہم وعدہ کرتے ہیں کہ ہم تمہیں غفلت میں شعر نہیں سنائیں گے۔ ہم تم سے ملنا چاہتے ہیں۔''

قاری ڈرتا اور سہمتا ہوا پھر باہر آ گیا۔ وفد کے لیڈر نے اسے سینے سے لگا کر کہا: ''پیارے قاری تم ہم سے روٹھ کر کیوں چلے آئے۔ تمہیں کیا پتہ کہ ہم تمہارے لیے کتنے بے چین ہیں، تمہیں ہمارے ساتھ واپس چلنا ہوگا، ہم تمہیں آرام سے رکھیں گے۔ ہم جنوں کی حکایت لکھتے رہیں گے تم اسے پڑھتے رہو۔''

قاری بولا۔ ''بھائیو! میں برسوں تمہارے جنوں کی حکایت پڑھتا رہا مگر بعد میں

اس حکایت سے شکایت ہونے لگی کہ یہ میری سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ میں نے دو ایک شاعروں سے شکایت بھی کی کہ تمہاری حکایت اتنی خونچکاں ہو چکی ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آرہی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ اب ادب میں ذات کے کرب کا اظہار ضروری ہو گیا ہے۔ میں نے شعر پڑھنا چاہا تو مجھے عجیب وغریب علامتیں دی گئیں۔ میں نے افسانہ پڑھنا چاہا تو نفسیات میرے آگے بڑھا دی گئی۔ نظم پڑھنی چاہی تو تنہائی کا زہر میری ذات میں گھولا جانے لگا۔ ادب میں اتنے تجربے کیے گئے کہ ادب لیبارٹری میں تبدیل ہو گیا۔ ہر ادیب نے ادب کو ایک نیا موڑ دینا چاہا۔ چنانچہ ہمارا ادب اتنا مُڑا تُڑا ہو گیا کہ اسے دیکھتا تو احساس ہوتا کہ برسوں بعد کسی گھڑے میں سے نکالی ہوئی شیروانی کو دیکھ رہا ہوں۔ جب افسانے میں سے کہانی اور غزل میں سے شاعری غائب ہونے لگی تو میں نے دبی زبان میں آپ حضرات سے پھر شکایت کی۔ آپ نے فرمایا کہ اب ہم اپنے لئے شعر کہتے ہیں۔ قاری کے لیے نہیں کہتے۔ سو پندرہ سال پہلے ایک دن میں چپ چاپ اُردو شعر و ادب کو چھوڑ کر یہاں چلا آیا۔ اب میں دوسری زبانیں سیکھ گیا ہوں۔ خدا کے فضل سے اچھا ہوں۔ آپ لوگوں کی آمد سے پتہ چلا کہ ہندوستان میں اب بھی اُردو میں شعر کہے جا رہے ہیں اور افسانے لکھے جا رہے ہیں، بڑے بے شرم لوگ ہیں آپ بھی۔''

وفد کے لیڈر نے آہ بھر کر کہا کہ ''پیارے قاری، شعر اور افسانے لکھے تو جا رہے ہیں مگر انہیں پڑھنے والا کوئی نہیں۔ جبھی تو ہم تمہیں لینے آئے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو، اور وہ اُردو ادب پڑھو جسے ہم نے پچھلے پندرہ بیس برسوں میں لکھا ہے۔''

ایک افسانہ نگار نے کہا: ''پہلے میرے افسانے پڑھو، صرف چھ مجموعے ہیں۔''

ایک شاعر نے کہا: ''نہیں پہلے میرا کلام پڑھو، صرف دس مجموعے ہیں۔''

اس پر دوسرے شاعر نے کہا: ''پہلے میری نظمیں پڑھو کیوں کہ یہ اب تک نہیں چھپی ہیں۔''

پہلے شاعر نے کہا: ''نہیں تمہیں پہلے میرا کلام پڑھنا ہوگا۔''

دونوں شاعروں میں اس پر ہاتھا پائی کی نوبت آگئی۔ اس افراتفری سے فائدہ اُٹھا کر اُردو کا آخری قاری بھاگ کھڑا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

پھر پتہ نہ چلا کہ اُردو کا یہ آخری قاری کہاں چلا گیا۔لوگ کہتے ہیں کہ یہ مرا نہیں زندہ ہے اور سبھاش چندر بوس کے ساتھ ایک دن پھر ہمارے درمیان آئے گا۔اُردو کے شاعر اور ادیب اب بھی اس کی واپسی کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور شعر کہے چلے جارہے ہیں۔

(بالآخر۔1982)

چار مینار اور چار سو برس

پچھلے دنوں میں حیدرآباد آیا تو میرے ساتھ ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا۔ رات کا پچھلا پہر تھا اور میں چار مینار کے پاس سے گزر رہا تھا۔ چاروں طرف سناٹا تھا اور خاموشی تھی۔ ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ چار مینار کے اطراف سناٹا ہو مگر اس رات تھا۔ میں دبے پاؤں چل رہا تھا کہ اچانک میری نظر چار مینار پر پڑی اور میرے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ کیا دیکھتا ہوں کہ چار مینار کا ایک مینار اکڑوں بیٹھا ہوا ہے۔ میں نے آنکھیں مل کر چار مینار کے دوسرے مینار کو دیکھا۔ یہاں تو معاملہ کچھ اور ہی تھا۔ یہ مینار تو باقاعدہ آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوا تھا اور اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے تیسرے مینار کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر یہ نظر نہیں آیا۔ میں نے تاڑ لیا کہ یہ ضرور لیٹا ہوا ہوگا۔ یوں بھی دور سے ایسے خراٹے سنائی دے رہے تھے جو انسان کے خراٹوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ زندگی میں پہلی بار مینار کے خراٹے سنے جو ہماری کلاسیکی موسیقی سے مشابہ تھے۔ میں نے گھبراہٹ میں جلتا ہوا چار مینار سگریٹ ہتھیلی پر رکھا تاکہ یہ اطمینان کرلوں کہ میں جاگ رہا ہوں یا خواب دیکھ رہا ہوں۔ میں سچ مچ جاگ رہا تھا۔ میں نے چار مینار سگریٹ کی ڈبیا پر نظر ڈالی۔ وہاں چار مینار کے چاروں مینار صحیح و سالم کھڑے تھے۔ یوں بھی ان دنوں صرف کاغذ پر ہی ہر چیز محفوظ نظر آتی ہے۔ چاہے وہ عمارت ہو یا ہمارا کردار۔ فلسفہ ہو یا ہماری تہذیب۔ میں ایک کونہ میں دبک گیا تاکہ

میناروں کی حرکات وسکنات میں مخل نہ ہوں۔ اب کی بار اُکڑوں بیٹھے ہوئے مینار نے انگڑائی لے کر کہا۔ ''باپ رے کئی برسوں بعد ذرا ستانے کا موقع ملا ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی نیچے سے گزرتا رہتا ہے۔ چار سو برس بیت گئے یہاں کھڑے کھڑے۔ کوئی پلٹ کر یہ نہیں پوچھتا کہ میاں یہاں کیوں کھڑے ہو؟ کب تک کھڑے رہو گے؟''

اس پر بیٹھے ہوئے مینار نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''کیا بیوقوفوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ ہمیں تو کھڑے رہنے کے لئے ہی یہاں کھڑا کیا گیا ہے۔ کھڑے رہنا ہی ہماری زندگی کا نصب العین ہے۔'' پہلے مینار نے کہا۔ ''نصب العین ! گویا نصب العین اب ہمارے پاس ہی رہ گیا ہے۔ یہ لوگ جو ہمارے زیرِ سایہ رہتے ہیں اور حیدرآبادی کہلاتے ہیں اُن کا بھی تو کوئی نصب العین ہونا چاہئے۔'' دوسرے مینار نے کہا کہ ''بھیا! انسانوں کے نصب العین بدلتے رہتے ہیں۔ عمارتوں کے نہیں۔۔۔ تمہیں یاد ہے چار سو برس پہلے جب سلطان قلی قطب شاہ نے ہمیں یہاں کھڑا کیا تھا تو کتنے اعلیٰ نصب العین تھے اس زمانے کے لوگوں کے۔''

اچانک ایک آواز آئی ''اس زمانہ کے لوگوں کے نصب العین اس لئے اعلیٰ تھے کہ اُنہیں دودھ کے پیکٹ کے لئے لائن میں لگنے کی مصیبت جھیلنی نہیں پڑتی تھی۔ راشن کی دکان پر دھکے نہیں کھانے پڑتے تھے۔ تمہارے سلطان قلی قطب شاہ کو اگر ایک بار آج کی بسوں میں سفر کرنے کا موقع ملتا تو پہلے ہی دھکے میں اُن کا سارا نصب العین نیچے آجاتا۔ بس کے ڈنڈے سے لٹک کر سفر کرنے والے آدمی کا کوئی نصب العین نہیں ہوتا۔ وہ دن لد گئے جب معزز آدمی کے آنے سے پہلے اعلان کیا جاتا تھا۔ ''باادب باملاحظہ ہوشیار۔''

دونوں میناروں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ یہ تیسرے مینار کی آواز تھی جو لیٹا ہوا تھا۔ پہلے مینار نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''نافرمانبردار! ناہنجار! تم ہمیشہ ایسی ہی باتیں کرتے ہو۔ جب سے تم اس عمارت میں جڑے ہو تب سے تمہاری یہی حالت ہے۔ تمہاری باتوں سے شرارت اور بغاوت کی بُو آتی ہے۔ ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔ باضابطہ لیٹے ہوئے ہو۔ خراٹے تک لے رہے ہو۔ کیا یہی آداب ہیں۔ یہی سلیقہ ہے کسی عمارت سے

جڑے رہنے کا۔۔۔"

تیسرے مینار نے کروٹ بدلتے ہوئے بلکہ جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "میاں! آداب، سلیقہ، تہذیب اور تمدن کی بات اپنے پاس ہی رکھو۔ چار صدیوں میں، میں نے یہاں کھڑے کھڑے کئی تہذیبوں کو بنتے بگڑتے اور اُجڑتے ہوئے دیکھا ہے۔ تم کون سی تہذیب کی بات کرتے ہو۔"

دوسرے مینار نے کہا۔ "حیدرآبادی تہذیب کی بات کرتے ہیں اور کیا۔ ہم نے تو کوئی تہذیب دیکھی ہی نہیں۔ یہی تہذیب دیکھی ہے۔"

تیسرے مینار نے کہا۔ "اور مجھے یاد ہے اسی تہذیب نے تو اورنگ زیب کی فوجوں کے لئے گولکنڈہ کے قلعہ کا دروازہ دھوکہ سے کھلوادیا تھا۔"

پہلے مینار نے کہا۔ "اور تمہیں یاد ہے اسی تہذیب نے گولکنڈہ کے قلعہ کے دروازہ پر ایک عبدالرزاق لاری کو بھی کھڑا کردیا تھا جو آخر وقت تک دُشمنوں سے لڑتا رہا۔ وہ آخر کس تہذیب کا پروردہ تھا؟" تیسرے مینار نے کہا "بہت خوب! اس تہذیب نے ایک جاں نثار پیدا کیا تھا اور اس جاں نثار کو اسی تہذیب کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادیا۔ اب کون جانتا ہے عبدالرزاق لاری کو اور اس کی قربانی کو؟"

پہلے مینار نے تیسرے مینار کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یار! اب خدا کے لئے مذاق بند کرو، ہر بات کو مذاق میں ٹال دیتے ہو یا جلی کٹی سناتے رہتے ہو۔ یہ رویہ تم نے کہاں سے اپنایا؟" تیسرے مینار نے کہا "ہر تہذیب پر ایک ایسا وقت آتا ہے جب ہر سانحہ کے جواب میں قہقہہ لگانا ضروری ہوجاتا ہے۔ چوٹ جتنی گہری ہو قہقہہ اتنا ہی بلند بانگ ہونا چاہئے۔" دوسرے مینار نے کہا "یار ذرا سوچو تو کیسے کیسے انسانوں کے دیدار کئے۔ یاد ہے وہ دن جب سلطان قلی قطب شاہ اپنے لاؤلشکر کے ساتھ اس عمارت کا سنگِ بنیاد رکھنے آیا تھا۔" پہلے مینار نے کہا۔ "وہ گھوڑے، وہ ہاتھی، وہ پالکیاں، وہ امراء اور شرفا نہ جانے کہاں گئے وہ لوگ۔"

تیسرے مینار نے کہا "یوں لگتا ہے جیسے یہ سب وقت کے فینسی ڈریس شو میں حصہ لینے آئے تھے اور چلے گئے۔ اب وہ لباس بھی کہیں دکھائی نہیں دیتے۔ ابھی چالیس

پچاس برس پہلے تک یہاں کے لوگوں کے سروں پر وہ لمبی لمبی ٹوپیاں دکھائی دیتی تھیں جنہیں ترکی ٹوپی کہتے تھے۔ بڑی آرام دہ ٹوپی تھی۔ سر کو محفوظ رکھنے کے علاوہ آدمی اس میں ناجائز کمائی بھی محفوظ رکھ لیتا تھا۔ اس ٹوپی کی کرامت کے باعث لوگ سودا سلف تک اپنے سروں پر رکھ کر لے جاتے تھے۔'' پہلے مینار نے کہا۔ '' مگر اس ٹوپی نے ہم میناروں کی انفرادیت ضرور مجروح کردی تھی۔ لگتا تھا ہر آدمی اپنے سر پر ایک مینار اُٹھائے ہوئے گھوم رہا ہے۔''

دوسرے مینار نے کہا۔ '' وہ دن ہی ایسے تھے جب آدمی کپڑے کی ساری دکان پہن لیتا تھا۔ کئی کئی گز کے چغے اور انگرکھے بنتے تھے۔ پچھلے لوگوں کے ایک رومال میں جتنا کپڑا ہوتا تھا اس میں آج سارے خاندان کے کپڑے بن جاتے ہیں بلکہ کچھ کپڑا تو بچ بھی جاتا ہوگا۔ عورتوں کے بدن کے ہر عضو کے لئے اتنے سارے زیور ہوتے تھے کہ اگر کوئی عورت پوری ایمانداری اور فراخ دلی کے ساتھ یہ زیورات پہن لیتی تو پھر اس کے بعد اس کے لباس پہننے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی تھی۔ اب عورتیں تولے اور ماشے کے حساب سے زیور پہنتی ہیں۔ پہلے منوں اور ٹنوں کے حساب سے پہنتی تھیں۔ ڈاکو عورتوں کو زیور سمیت اُٹھانے سے ہمیشہ گریز کرتے تھے۔ اسی لئے تو اغواء کے واقعات کم ہوتے تھے۔ اب ڈاکو بڑی محنت سے کسی عورت کا اغوا کرتے ہیں تو بڑی مشکل سے دو تین تولے سونا ہاتھ لگتا ہے۔ اور اکثر صورتوں میں یہ بھی خالص نہیں ہوتا۔''

پہلے مینار نے کہا۔ '' تم عورتوں کی بات کرتے ہو۔ لوگ تو اپنے گھوڑوں تک کو زیور پہناتے تھے۔ یاد ہے کہ سلطان محمد قلی قطب شاہ کا گھوڑا کتنے زیورات سے آراستہ ہوتا تھا۔ بھاگ متی سے ملنے کے لئے جب قلی قطب شاہ نے چڑھتی ہوئی موسیٰ ندی میں گھوڑا ڈال دیا تھا تو اس کی وجہ سے ندی کا پانی چڑھ گیا تھا۔''

تیسرے مینار نے پوچھا۔ '' گھوڑے کے وزن سے یا زیورات کے وزن سے؟'' پہلے مینار نے کہا '' مذاق بند کرو۔ ندی کا پانی تو قلی قطب شاہ کے دل میں محبت کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی وجہ سے چڑھ گیا تھا۔ آج کوئی ایسی محبت کر کے دکھادے۔'' تیسرے مینار نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔ '' سارا کارنامہ تو گھوڑے کا

تھا۔ لگتا ہے گھوڑا قلی قطب شاہ سے کہیں زیادہ بھاگ متی کا وفادار تھا اور اسے بھاگ متی کے پاس جانے کی جلدی تھی۔''

دوسرے مینار نے کہا۔ ''بدتمیز اپنے منہ میں لگام دو۔ تم بہت گستاخ ہوتے جارہے ہو۔'' پہلے مینار نے کہا۔ ''تم اس کی باتوں پر دھیان مت دو۔ یہ تو ہے ہی زبان دراز، کوئی دوسری بات کرو۔ آج نہ جانے اس شہر کے لوگوں کو کیا ہوگیا ہے۔ گھنٹہ بھر سے کسی آدم ذات کا ادھر سے گزر نہیں ہوا۔''

دوسرے مینار نے کہا'' آج تو ایسا سناٹا ہے کہ جی چاہتا ہے ہم اوپر سے نیچے اتر جائیں اور شہر کی سڑکوں پر چہل قدمی کریں۔''

تیسرے مینار نے کہا'' بھیا! یہ غلطی کبھی نہ کرنا کیوں کہ اس شہر کی سڑکیں اب چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہیں۔ پہلے ہی قدم پر تمہیں ٹھوکر لگ جائے گی اور تم کسی کھڈ میں گر پڑو گے۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ یہاں کے لوگ ان سڑکوں پر کس طرح چل پھر لیتے ہیں۔ اپنی محبوبہ سے ملنے کے لئے گھوڑے پر بیٹھ کر طغیانی پر آئی ہوئی موسیٰ ندی کو عبور کرنا پہلے بھی آسان تھا اور آج بھی آسان ہے لیکن اس سوکھی ندی پر بنے ہوئے پلوں کو عبور کرنا مشکل ترین کام ہے۔ یہاں کی سڑکوں پر چلنے کے لئے اس شہر کے باسی اب ایسے ایسے کرتب دکھاتے ہیں کہ لگتا ہے کہ سارا شہر سرکس میں کام کررہا ہے۔''

پہلے مینار نے کہا۔ ''یاد ہے جب یہ شہر آباد ہوا تھا تو یہ سڑکیں کیسی پختہ اور شاندار تھیں۔'' تیسرے مینار نے کہا'' اس لئے کہ اس زمانہ میں اس شہر میں کوئی بلدیہ نہیں تھی۔ آدمی سڑک پر چلتا تھا تو اسے اپنی ملکیت تصور کرتا تھا۔ آج یہ سڑکیں کسی کی ملکیت نہیں ہیں۔ یہی وہ لاوارث سڑکیں ہیں جن پر حیدرآبادی تہذیب ٹھوکریں کھا کھا کر لہولہان ہورہی ہے۔ جس کسی کا جی کچھ کھودنے کو چاہے تو وہ یہاں کی سڑکوں پر طبع آزمائی کرتا ہے۔ پھر سرکار نے سڑکوں کو کھودنے کے لئے کئی محکمے بنا رکھے ہیں۔ ٹیلی فون والے کسی سڑک کو کھود کر چلے جاتے ہیں تو اُن کے پیچھے بجلی والے آجاتے ہیں۔ بجلی والے چلے جاتے ہیں تو بچی کھچی سڑک کو ڈرینیج والے کھود کر چلے جاتے ہیں۔'' دوسرے مینار نے کہا۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ کیا شہر تھا یہ۔ اور اب کیا ہوگیا ہے۔ وہ تہذیب بھی اب نہ جانے

کہاں چلی گئی۔''

تیسرے مینار نے کہا'' اب حیدرآبادی تہذیب صرف پکوان میں اٹک کر رہ گئی ہے۔ جس تہذیب کا رشتہ پیٹ سے زیادہ اور دل و دماغ سے کم ہو جائے تو اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ پہلے حیدرآبادی تہذیب آدمی کے کردار سے جھلکتی تھی اب اس کی ڈکار سے جھلکتی ہے۔ حیدرآبادیوں کے کردار اب خالی برتن کی طرح ہو گئے ہیں۔ وہ تو اچھا ہے کہ ہم اس شہر کے اوپر ایک عمارت میں الگ تھلگ کھڑے ہیں۔ اگر ہمیں اس شہر کی زندگی میں شامل ہونا پڑتا تو نہ جانے ہمارا کیا حشر ہوتا۔ ہم تو صرف خاموش تماشائی ہیں۔'' پہلے مینار نے کہا'' مگر کب تک ہم خاموش تماشائی بنے رہیں۔ اب تو جی چاہتا ہے کہ اس شہر کو چھوڑ کر کہیں چلے جائیں۔'' دوسرے مینار نے پوچھا'' مگر جاؤ گے کہاں؟''

تیسرا مینار بولا'' دوبئی چلے جاؤ۔ بڑی اچھی جگہ ہے اور واپسی میں اپنے گلے میں کیمرے اور ٹرانزسٹر لٹکا کر آ جاؤ۔ میں تو ہر روز ایسے حیدرآبادی نمونے نیچے دیکھتا رہتا ہوں۔ اب زیادہ تر حیدرآبادی خلیجی ممالک کو ہی بھاگنے لگے ہیں۔ تم بھی بھاگ جاؤ۔'' یہ کہہ کر تیسرے مینار نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر اچانک ایک چیخ سنائی دی۔ یہ چار مینار کے چوتھے مینار کی چیخ تھی جو شاید اتنی دیر سے گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ چوتھے مینار نے چیخ کر کہا'' یہ کیا تم لوگوں نے بکواس لگا رکھی ہے۔ کئی دنوں بعد تو سونے کا موقعہ ملا تھا۔ یہ ضرور تیسرے مینار کی شرارت ہے۔ میں اس کا خون پی جاؤں گا۔'' یہ کہہ کر چوتھا مینار خالص حیدرآبادی گالیاں دیتا ہوا تیسرے مینار پر جھپٹ پڑا اور اپنے کلس کو تیسرے مینار کے پیٹ میں بھونکنے کی کوشش کرنے لگا۔ چاروں میناروں میں اچانک حرکت اور ہل چل سی پیدا ہو گئی۔ بالآخر پہلے مینار نے بیچ بچاؤ کر کے اُن میناروں کو لڑنے سے روکا۔ پھر اس نے اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور کہا'' دوستو! اب ہمیں سچ مچ یہاں سے چلے جانا چاہئے۔ اس شہر کے موجودہ رہنے والوں کے کردار کا اثر اب ہم پر بھی پڑنے لگا ہے۔ اور ہم بھی آپس میں لڑنے لگے ہیں۔ کیا سلطان قلی قطب شاہ نے اسی دن کے لئے ہمیں اس عمارت کا حصہ بنایا تھا۔ کیا اب ہم اس عمارت سے جڑے نہیں رہ سکتے؟۔ اس شہر کو جس

تہذیب نے آباد کیا تھا ہم اس کے امین ہیں۔ ہم میں اور اس شہر کے باشندوں میں کچھ تو فرق ہونا چاہئے۔ ہم نے یہاں کھڑے کھڑے کیسے کیسے باکردار، مہذب اور جلیل القدر انسان دیکھے تھے۔ آدمی کا حافظہ کمزور ہو سکتا ہے لیکن پتھر کا نہیں۔ اتنی آسان سی بات تم لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی۔''

اسی اثنا میں دور سے ایک موٹر کار آتی ہوئی دکھائی دی تو پہلے مینار نے کہا۔ ''خبردار! اب سب ٹھیک سے کھڑے ہو جاؤ۔'' سارے مینار اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہونے کے لئے دوڑ پڑے۔ تیسرے مینار نے دُوسرے مینار کو پیچھے ڈھکیلتے ہوئے کہا ''تم آج سے میری جگہ کھڑے ہو جاؤ۔ میرا رُخ صدیوں سے پرانے شہر کی طرف ہے۔ اِدھر کچھ عرصہ سے اس علاقہ میں غربت اور افلاس کا ایک ہی منظر دیکھتے دیکھتے میں تنگ آ گیا ہوں۔ ذرا دیکھوں تو سہی کہ نئے شہر اور بنجارہ ہلز کے امیروں کے کیا چونچلے ہیں۔''

پہلے مینار نے کہا۔ ''نہیں بھیا۔ اپنی جگہ نہ بدلو ورنہ مینار اور آج کے سیاسی لیڈر میں کوئی فرق باقی نہ رہ جائے گا۔ یوں بھی یہ منظر ہمارے مقدر کا حصہ بن چکا ہے۔'' اس پر تیسرا مینار اپنی پرانی جگہ پر جا کر کھڑا ہو گیا۔

جب سارے مینار اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک سے کھڑے ہو گئے تو میں بھی اس جگہ سے باہر نکل آیا جہاں چھپا بیٹھا تھا۔ موٹر کار گزر گئی تو پھر سناٹا چھا گیا۔ میں چار مینار کے سامنے جا کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا۔ ''چار مینار کے مینارو! مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔ میں نے تمہاری ساری باتیں سُن لی ہیں۔ میں بھی تمہارے اختلاف سے اتفاق کرتا ہوں۔ تمہیں کہیں جانا ہو تو ضرور چلے جانا مگر جاتے جاتے اس شہر کے چار سو برسوں میں سے میرے پچاس برس مجھے واپس کرتے جاؤ۔ باقی کے ساڑھے تین سو برس بھلے ہی اپنے پاس رکھ لینا۔ میں بھی اس شہر سے اپنے پچاس برس لے کر کہیں اور چلا جانا چاہتا ہوں۔ کیوں کہ آنے والے برسوں میں میرے ان پچاس برسوں کے محفوظ رہنے کے کوئی آثار نہیں دکھائی دیتے۔''

میری باتوں کے جواب میں چار مینار کے چاروں مینار چپ چاپ کھڑے کے

کھڑے رہ گئے۔ کسی میں کوئی ہلکی سی جُنبش بھی نہیں ہوئی۔ البتہ اوپر سے ایک آنسو میرے دامن میں ضرور آگرا۔ پتہ نہیں کون سے مینار کا تھا۔ ضرور تیسرے مینار کا ہوگا جو ابھی کچھ دیر پہلے تک قہقہے لگا رہا تھا۔ جو بہت زیادہ ہنستا ہے اس کی آنکھوں میں آنسو بھی تو جلدی آجاتے ہیں۔

سِند باد جَہازی کا سَفر نامہ

حضرات! میں سند باد ہوں۔ وہی سند باد جہازی جو سفر کم کرتا تھا اور سفرنامے زیادہ لکھا کرتا تھا۔ بلکہ اکثر سفرنامے تو سفر کئے بغیر ہی لکھ دیتا تھا۔ میرے سفرنامے اتنے مقبول ہوئے کہ پبلشروں نے مجھے کوئی رائلٹی دیئے بغیر ہی اُن کے کئی کئی ایڈیشن شائع کر لئے اور میرے کان پر جوں تک نہ رینگنے دی۔ ادھر عرصہ سے پبلشروں کا تقاضا تھا کہ میں کوئی ایسا سفرنامہ لکھوں جسے زیورِ طبع سے آراستہ کر کے وہ اپنی بیویوں کو زیورِ طلائی سے پیراستہ کر سکیں اور میں بدستور اپنی لنگوٹی میں مگن رہوں۔ پبلشروں کو لاکھ سمجھایا کہ اب پیرانہ سالی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ہاتھ میں لکڑی پکڑتا ہوں تو سمجھ میں نہیں آتا کہ میں نے لکڑی کو پکڑ رکھا ہے یا لکڑی نے مجھے۔ پھر یہ عذر بھی پیش کیا کہ عرصہ سے بلا ٹکٹ سفر کرنے کی پریکٹس چھوٹ چکی ہے۔ ٹکٹ خرید کر سفر کروں گا تو اپنی کج کلاہی پر آنچ آئے گی اور فقیرانہ شان الگ متاثر ہوگی۔ لہٰذا اجازت ہو تو حسبِ عملدر آمد قدیم سفر کئے بغیر ہی سفرنامہ لکھ ڈالوں۔ لیکن پبلشروں کا استدلال یہ تھا کہ جب میں نے اتنے سارے فرضی سفرنامے لکھ ڈالے ہیں تو اب تجربہ کے طور پر عملاً ایک آدھ سفر کر لینے میں کیا قباحت ہے۔ سوچتا رہا کہ جب سفر کرنا ہی ٹھہرا تو کیوں نہ اس مقصد کے لئے کسی اچھے ملک کا انتخاب کیا جائے۔ اسی اثناء میں ملک ہندوستان سے یہ اطلاعیں دھڑا دھڑ ملنے لگیں کہ وہاں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات کا سلسلہ جاری ہے اور ہر سال فسادات کے بیج بو کر

انسانی سروں کی فصلیں کاٹی جا رہی ہیں۔ ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں اخبارات میں بہت کچھ پڑھ رکھا تھا اور دل بے چین تھا کہ اپنی چشمِ گنہ گار سے ان فسادات کو دیکھوں اور اپنی نظر کو سرور عطا کروں۔

اپنے بے روزگار دوستوں سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تو ایک نے رائے دی ''اگر فسادات کو دیکھنا ہی آپ کی منزلِ مقصود ہے تو امریکہ چلے جایئے، وہاں بھی نسلی فسادات کا دور دورہ ہے (بلکہ دَور کم اور دَورہ زیادہ ہے)۔'' مگر دوسرے دوست نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ''لیکن اگر آپ خالص فسادات دیکھنا چاہتے ہیں تو پھر ہندوستان ہی جایئے۔ یہاں کے فسادات اتنے خالص ہوتے ہیں کہ اُن میں کہیں بھی انسانیت کی ملاوٹ نہیں ہوتی۔ اس صفائی سے انسانوں کے سر کاٹے جاتے ہیں اور اُن کے جسموں میں چھرے بھونک دیئے جاتے ہیں کہ عقل حیران اور نظر دنگ رہ جاتی ہے۔'' مجھے بتایا گیا کہ فرقہ وارانہ فساد ہندوستان کا بڑا قدیم کھیل ہے۔ اگر اس کھیل کو نہ دیکھا تو اس دُنیا میں پیدا ہونے کا مقصد ہی کیا ہوا۔'' ایک اور دوست نے کہا ''ویسے ہندوستان میں تاج محل، ایلورہ اور اجنتا بھی دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں لیکن فرقہ وارانہ فسادات کی تو بات ہی جداگانہ ہے۔''

اس خیال کے آتے ہی میں نے دوستوں سے سامانِ سفر مانگنا شروع کر دیا اور اسے باندھ کر ہندوستان کی سیاحت پر روانہ ہو گیا۔ خشکی کے سفر کی بے شمار صعوبتیں جھیل کر اور راستہ بھر ٹی آئی کی نظروں سے بچ کر میں بخیر و عافیت ہندوستان پہنچ گیا۔ مگر دوستوں نے کہہ رکھا تھا کہ ہندوستان کو بخیر و عافیت پہنچنا تو بہت آسان ہے لیکن وہاں سے بخیر و عافیت واپس آنا بہت مشکل ہے۔ لہٰذا ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھتے ہی مجھے واپسی کی فکر لاحق ہو گئی۔ چنانچہ میں نے اپنا سامانِ سفر بدستور باندھے رکھا کہ خطرہ کی گھنٹی بجتے ہی میں اسے اُٹھا کر واپس بھاگ کھڑا ہو جاؤں۔

میرے قیام و طعام کا یہاں کوئی مستقل بندوبست نہیں تھا لیکن بعد میں لوگوں نے بتایا کہ ہندوستان میں خود اہلِ ہند کے قیام و طعام کا کوئی مستقل بندوبست نہیں ہے۔ وہ تو بس سارے ملک کو ایک سرائے کے طور پر استعمال کرتے ہیں اور آخر میں سرائے کا

کرایہ بقائے میں رکھ کراس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف روانہ ہوجاتے ہیں۔
لہٰذا میں نے ایک ریلوے پُل کے نیچے ایک وسیع اور پُر فضا جگہ اپنے قیام کے لئے منتخب کرلی۔ وہاں میری طرح اور بھی چار مقامی سیاح رہتے تھے جو دن بھر بھیک مانگا کرتے اور رات کو اپنے سفرنامے ایک دوسرے کو سُنایا کرتے تھے۔ ہندوستان میں سیاحوں کو درویش کہا جاتا ہے۔ میں بھی ان درویشوں میں یوں شامل ہوگیا جیسے دودھ میں چینی شامل ہوتی ہے۔ ہم سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے تھے لیکن مقامی درویشوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ میں بیرونی سَیاح ہوں اور میرا نام سند باد جہازی ہے تو ان سب نے مل کر قہقہہ لگایا اور مجھ سے کہا" ابتداء میں یہاں آنے والا ہر سَیاح اپنے آپ کو سند باد جہازی ہی کہتا ہے۔ تم آٹھویں سند باد ہو۔ چند دن اس ملک میں ٹھیر جاؤ گے تو خود بخود تمہارا نشہ ہرن ہوجائے گا۔ میں ان درویشوں کی غلط فہمی کو دُور نہیں کرنا چاہتا تھا، اس لئے کہ میرے پھٹے پرانے کپڑوں میں بھاری رقم موجود تھی۔ وہ مجھے اپنی ہی طرح درویش سمجھتے رہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ میں بھی اُن کے ساتھ ہر روز بھیک مانگنے چلوں گا۔ تفریح بھی ہوجائے گی اور پیٹ بھی بھر جائے گا۔ مگر درویشوں نے کہا میں بیرونی دُرویش ہوں اور اس اعتبار سے اُن کا مہمان ہوں۔ اہلِ ہند مہمان نوازی کے لئے بدنامی کی حد تک شہرت رکھتے ہیں۔ وہ کبھی مہمان کو بھیک نہیں مانگنے دیتے بلکہ خود بھیک مانگ کر مہمان کا پیٹ بھرتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو یہ بڑی آسان قسم کی مہمان نوازی ہے۔ کیوں کہ اس میں میزبان کو ہینگ لگتی ہے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آجاتا ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ طریقۂ عمل یہاں اُوپر سے نیچے تک رائج ہے۔ اگر عوام کبھی حکومت سے کسی مسئلہ پر مدد طلب کرتے ہیں تو حکومت جواباً بیرونی ملکوں سے مدد طلب کرتی ہے اور سارا حساب بے باق ہوجاتا ہے۔ گویا اس طرح اہلِ ہند کے کاروبار بالا بالا ہی طے پاجاتے ہیں۔ میں عرصہ تک ان درویشوں کی صحبت سے لطف اندوز اور بھنگ، چرس اور گانجہ جیسی مفرّح اور مقوّی اشیا کے استعمال میں یدِ طولیٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا۔
میں نے اُن درویشوں کو اپنے ہندوستان آنے کا کوئی مقصد نہیں بتایا تھا، کیوں کہ اہلِ ہند کسی مقصد کے بغیر زندگی گزارنے میں بڑی مہارت رکھتے ہیں۔ لہٰذا وہ نہ تو

اپنی زندگی میں کوئی مقصد تلاش کرتے ہیں اور نہ ہی کسی کے مقصد کے بارے میں استفسار کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں۔

ایک دن میں نے موقع کو غنیمت جان کر ان درویشوں سے کہا ''بھائیو! میں اصل میں آپ کے عظیم الشان ملک کے عظیم الشان فسادات کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ اسی لئے کوئی ایسی ترکیب کیجئے کہ میں فسادات کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل کرسکوں۔''

فساد کا نام سنتے ہی درویشوں کے کان کھڑے ہوگئے۔ ایک درویش نے کہا: ''اے سند باد! تم کوئی بیرونی ایجنٹ نظر آتے ہو۔ ہمیں تمہاری نیت پر شبہ ہونے لگا ہے۔ خبردار جو تم نے ہم درویشوں کے سامنے پھر کبھی فسادات کا ذکر کیا۔ انہی فسادات کی وجہ سے تو ہم درویش بن گئے ہیں اور اس ریلوے پل کے نیچے اپنی بقیہ زندگی کا بقیہ حصہ گزار رہے ہیں۔ یہاں آنے سے پہلے ہم بھی ہندو اور مسلمان تھے۔ ہم اتفاق سے پڑوسی تھے اور خود ہم نے فسادات میں ایک دوسرے کے گھر جلائے تھے اور ایک دوسرے پر لاٹھیوں سے حملہ کیا تھا۔ لیکن جب ہمارا سب کچھ لُٹ گیا اور ہمارے افرادِ خاندان فسادات میں مارے گئے تو ہمیں محسوس ہوا کہ ہم ہندو اور مسلمان باقی نہیں رہے ہیں کیوں کہ نہ تو ہمارے پاس زروجواہر تھے اور نہ ہی کوئی مال ومتاع۔ ہمارے پاس کچھ تھا ہی نہیں کہ جس کی بنیاد پر ایک دوسرے سے نفرت کی جاسکے۔ گویا وہ شاخ ہی نہ رہی جس پر نفرت کا آشیانہ تھا۔ لہٰذا ہم چاروں درویشوں نے ایک دوسرے کو غربت کے رشتہ میں باندھ لیا۔ اب ہم اس پل کے نیچے رہتے ہیں، یہیں آکر ہم اس لئے اچھے پڑوسی بن سکے کہ ہمارے مکان نہیں ہیں۔ ہم اچھے دوست اس لئے بن سکے کہ نفرت کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی اُونچ نیچ نہیں ہے۔ لہٰذا سند باد تم فسادات کا ذکر نہ کرو۔ ہم اپنی غربت میں مالا مال ہیں اور ایک دوسرے کو سمجھنے کے قابل ہوگئے ہیں۔''

دوسرے دُرویش نے کہا: ''سند باد تمہارا اب ہمارے درمیان رہنا مناسب نہیں ہے ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں ہم خود تمہارے خلاف فساد نہ کر بیٹھیں۔ تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ تم یہاں سے اسی وقت چلے جاؤ اور اس پُل کا تخلیہ کردو ورنہ ہم سے بُرا کوئی

نہ ہوگا۔ دوسرے دُرویش کی سختی کو محسوس کر کے میں خوف زدہ ہو گیا اور اپنا سامان اُٹھا کر بھاگ کھڑا ہوا۔ کئی دنوں تک پیدل چلنے کے بعد میں ایک شہر میں پہنچا، جو ویرانی اور تباہی کا جیتا جاگتا نمونہ تھا۔ لوگ سہمے ہوئے اور خوفزدہ سے تھے، میں نے ایک شخص سے پوچھا ''بھائی آپ کے شہر پر یہ نحوست کیوں برس رہی ہے؟'' اس شخص نے کہا ''ابھی دو دن پہلے اس شہر پر فساد نازل ہوا تھا۔''

فساد کا نام سنتے ہی میری باچھیں کھل اُٹھیں۔ میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا ''کہاں ہو رہا ہے فساد! مجھے وہاں لے چلئے، میں ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے یہاں اسی لئے تو آیا ہوں، مجھے فوراً فساد کے پاس لے چلئے۔''

اس شخص نے حیران نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ بھلا فساد بھی کوئی ملنے والی چیز ہے۔ وہ بس آندھی کی طرح آتا ہے اور بگولہ کی طرح نکل جاتا ہے۔'' میں نے پوچھا ''پھر کب آئے گا فساد اس شہر میں؟''

وہ بولا ''ابھی ابھی تو فساد نے سارے شہر میں جھاڑو سی پھرا دی ہے۔ جب تک یہ شہر از سرِ نو ترقی نہیں کر لے گا اور یہاں کے لوگ خوش حال نہ ہو جائیں گے اس وقت تک یہاں فساد کے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لہٰذا آپ فساد کو تلاش کرنے کے لئے کسی خوش حال اور آباد شہر کی طرف چلے جائیں۔ اس وقت تو فساد نے اس شہر کو لیموں کی طرح نچوڑ لیا ہے اور انسانی سروں کی فصل کٹ چکی ہے۔ پھر فسادات کے ماہرین بھی اس شہر کو چھوڑ کر دوسرے آباد شہروں کی طرف چلے گئے ہیں۔''

میں بہت مایوس ہوا اور دوسرے شہر کی طرف نکل کھڑا ہوا۔ فسادات کے اور میرے درمیان اچھی خاصی آنکھ مچولی جاری تھی۔ میں ہر روز اخبارات کا مطالعہ کرتا اطلاعیں ملتیں کہ فلاں شہر میں فساد ہو گیا، فلاں گاؤں میں اتنے مکانات جل گئے، فلاں شہر میں کئی سو افراد نے بیک وقت داعئ اجل کو لبیک کہا اور داعئ اجل کا کام بڑھا دیا۔ مگر افسوس کہ میرے پہنچنے تک فسادات کی تباہی ختم ہو چکی ہوتی اور امن کمیٹیوں کی تباہیوں کا آغاز ہو چکا ہوتا۔ میں ایک ایک شخص سے فسادات کا پتہ پوچھتا رہا۔ یہاں تک کہ میں تقریباً مایوس ہو گیا۔ مجھے اپنا وطن بے ساختہ یاد آنے لگا اور میں اپنے وطن واپس جانا چاہتا

تھا کہ ایک دن اچانک میری ملاقات ایک شخص سے ہوگئی جسے لوگ اپنا لیڈر سمجھتے تھے اور سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اس لیڈر سے جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ مگر بعد میں لوگوں نے بتایا کہ اس کی خوشی صرف ایک سیاسی چال تھی۔ اس لیڈر کی غذا یہ تھی کہ وہ صبح میں اپنے نام کے ساتھ ''زندہ باد۔ زندہ باد'' کے نعرے سنتا۔ دوپہر میں اپنے حواریوں کی چاپلوسی سے لطف اندوز ہوتا اور رات میں وہ سارے کام کرتا جن کے کرنے کے لئے قدرت نے رات بنائی ہے۔ جب اسے معلوم ہوا کہ میں سند باد جہازی ہوں تو اس نے دوسرے کمرہ میں جاکر اپنے سکریٹری سے سند باد جہازی کے بارے میں معلومات حاصل کیں اور کمرہ سے نکل کر میرے سفرناموں کی تعریف کرنے لگا۔ جب میں نے پوچھا کہ آپ کو میرا کونسا سفرنامہ زیادہ پسند آیا تو وہ پھر اپنے سکریٹری کے کمرے کی طرف چلا گیا اور واپس آکر کہنے لگا:

''میرے سکریٹری کو اب یہ یاد نہیں رہا کہ مجھے آپ کا کون سا سفرنامہ پسند آیا تھا۔ تاہم میں نے سکریٹری سے کہہ رکھا ہے کہ وہ شام تک کوئی سفرنامہ پسند کر کے آپ کو اس کی اطلاع دے دے۔''

اس لیڈر سے میری گفتگو نہ صرف دلچسپ بلکہ مضحکہ خیز بھی رہی۔ باتوں باتوں میں، میں نے اس لیڈر سے اپنے ہندوستان آنے کا مقصد بیان کیا اور شکایت کی کہ آپ لوگ اپنے شہرۂ آفاق فسادات کسی طے شدہ پروگرام کے مطابق کیوں نہیں برپا کرتے، تاکہ سیاحوں کو فسادات کے انعقاد کی پہلے سے اطلاع مل جائے تو وہ وقتِ مقررہ پر پہنچ کر اُن سے لطف اندوز ہوسکیں۔ پھر میں نے کہا کہ میں فسادات کا نظارہ کرنے کی غرض سے ہندوستان آیا تھا لیکن فسادات ہمیشہ ایسے شہروں میں ہوتے رہے جو مجھ سے دُور واقع تھے۔ اب یہ حسرت اپنے دِل میں لے کر ہی اس ملک سے جارہا ہوں۔

میرے اس بیان کو سُن کر لیڈر نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا: ''مسٹر سند باد! آپ تو بڑے معصوم آدمی نظر آتے ہیں۔ اجی فسادات کو دیکھنا کون سا مشکل کام ہے۔ اگر آپ کی خواہش ہے تو میں کل ہی اس شہر میں ایک فساد کروا دیتا ہوں۔ ہم ہندوستانی اپنے مہمانوں کا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ میں اتنا بڑا لیڈر رہوں، کیا میں آپ کی اتنی چھوٹی سی آرزو

بھی پوری نہیں کر سکتا۔"

لیڈر کی اس تقریر دل پذیر کو سُن کر میں گیند کی طرح اُچھل پڑا اور بولا:
"لیڈر صاحب میں آپ کا یہ احسان عمر بھر نہ بھلا سکوں گا۔ آپ نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب میں اطمینان سے آپ کے ملک کے فسادات کو دیکھ کر اپنے وطن واپس جاؤں گا اور بقیہ زندگی سفر نامہ لکھنے میں گنوا دوں گا۔"

اس پر لیڈر نے میری بات کو کاٹتے ہوئے کہا "مسٹر سند باد! مگر یہ بتایئے کہ آپ کس قسم کا فساد دیکھنا پسند کریں گے۔" میں نے پوچھا "آپ کے پاس فساد کی کتنی قسمیں ہیں۔" وہ بولا "اے کلاس سے لے کر زیڈ کلاس تک فسادات کی کئی قسمیں ہیں۔ افواہی فساد، تباہی فساد، خواہی نخواہی فساد، واہی تباہی فساد۔ ایک قسم ہو تو گناؤں بھی۔ یہ بتایئے کہ آپ سیدھا سادا فساد دیکھنا پسند کریں گے یا ایک دم ہنگامہ خیز۔" میں نے پوچھا "ان دونوں فسادات میں کیا فرق ہے؟"

وہ بولا "سیدھا سادا فساد اصل میں ہنگامہ خیز فساد کا ٹریلر ہوتا ہے۔ اس میں صرف دکانات اور مکانات جلائے جاتے ہیں۔ باشندوں کی تھوڑی سی ہڈیاں اور پسلیاں توڑی جاتی ہیں اور اگلے فساد کی تمہید باندھی جاتی ہے۔ ہنگامہ خیز فساد ایک دم ٹاپ کلاس ہوتا ہے۔ اس میں دکانات اور مکانات جلانے کے علاوہ انسانوں کا خون بھی بہایا جاتا ہے۔ ان کے پیٹوں میں چُھرے بھونکے جاتے ہیں، بچّوں کو ذبح کیا جاتا ہے، عورتوں کی عصمتیں بڑے اہتمام سے لوٹی جاتی ہیں۔ یہ فساد Only For Adults ہوتا ہے۔ الغرض بڑا ہی لطف آتا ہے۔"

میں نے کہا "جب اتنی دُور سے آیا ہوں تو اے کلاس فساد کو دیکھنا ہی پسند کروں گا۔ بار بار ایسا موقع پھر کہاں ملے گا۔"

لیڈر نے کہا "تو گویا بات پکّی ہوگئی سمجھئے۔ آپ کو اس فساد کے انعقاد کے لئے تیس ہزار روپے دینے ہوں گے تاکہ میں فسادیوں کو تیار کر سکوں۔ آپ اطمینان رکھیں کہ اگر آج آپ فساد کا آرڈر ہمارے پاس بُک کرائیں تو کل شام تک فساد تیار ہو جائے گا۔"

میں نے خوشی خوشی تیس ہزار روپے نکال کر لیڈر کو دے دیئے۔ اس نے فوراً

اپنے آدمیوں کو بلوایا اور اُن کے ہاتھوں میں کرنسی نوٹ رکھتے ہوئے بولا ''میرے دوست سند باد ایک دم اے کلاس فساد دیکھنا چاہتے ہیں، تم لوگ کل شام تک فساد کے انتظامات مکمل کر لینا۔ کل شام میں ٹھیک چھ بجے مسٹر سند باد شہر کے چوک میں فساد کو دیکھنے آئیں گے۔ وہ ہمارے مہمان ہیں اُن کا خیال رکھنا۔'' جب اس کے آدمی چلے گئے تو میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور فسادات کے بارے میں اس سے مختلف استفسارات کرنے لگا۔

میں نے پوچھا '' آپ ہندوستانی اس قدر آسانی سے کس طرح فساد برپا کر لیتے ہیں؟ بھئی کمال ہے۔'' وہ بولا '' فساد برپا کرنا ہم ہندوستانیوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ برسوں کے ریاض کے بعد اب ہم نے اس فن میں وہ مہارت حاصل کر لی ہے کہ کسی وجہ کے بغیر ہی فساد برپا کر دیتے ہیں۔ فساد کے لئے ایک ہندو اور ایک مسلمان کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ان دونوں کے اتحاد کے بغیر فساد کا ہونا ناممکن ہے۔ اگر ایک ہندو نے کسی مسلمان کی طرف گھور کر دیکھا تو یہ بات خود ایک ہنگامہ خیز فساد کے لئے بہت کافی ہے۔ ہندو اور مسلمان کی بات تو چھوڑیئے اگر کسی مسلمان کے کتے نے کسی ہندو کے کتے پر بھونکنا شروع کیا تو سمجھ لیجئے کہ فساد کی بنیادیں تعمیر ہو رہی ہیں۔ جب کتے ایک دوسرے پر بھونکنا ختم کر دیں گے تو ان کے مالک ایک دوسرے پر بھونکنے لگ جائیں گے اور بھونکنے کی یہ وبا اتنی عام ہو جائے گی کہ فضا میں شور وغل مچ جائے گا اور اگر ایسے میں کسی منچلے نے مذاق مذاق میں اپنا چاقو کسی کے پیٹ میں اُتار دیا تو سمجھ لیجئے کہ فسادات کا باضابطہ افتتاح ہو گیا ہے۔''

میں بڑی دیر تک اس لیڈر سے فسادات کے بارے میں تفصیلات حاصل کرتا رہا اور اپنے سفرنامے کے اہم نوٹس لیتا رہا۔ مجھ سے کہا گیا کہ میں دوسرے دن ٹھیک چھ بجے شہر کے چوک میں موجود رہوں اور حسبِ استطاعت فسادات کا نظارہ کروں۔ میں نے لیڈر سے رخصت ہو کر رات ایک کباڑ خانے میں گزاری اور دوسرے دن صبح ہی سے ہندوستان کے شہرۂ آفاق فسادات کا دیدار کرنے کی تیاریاں کرنے لگا۔

شام کو چھ بجے مقررہ وقت سے کچھ منٹ پہلے جب میں چوک میں پہنچا تو خوب چہل پہل تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے فساد کا دُور دُور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔ مجھے شبہ ہونے

لگا کہ کہیں مجھے لیڈر نے دھوکہ نہ دیا ہو۔ دُور دُور تک اُس کے آدمی نظر نہیں آرہے تھے۔ زندگی بڑی حسین نظر آرہی تھی۔ میں چوک کے کلاک ٹاور پر چڑھ گیا تاکہ محفوظ مقام سے فسادات کا نظارہ کرسکوں۔ چھ بجنے میں ابھی ایک منٹ باقی تھا کہ اچانک سڑک پر ایک اسکوٹر کی ٹکر دوسری اسکوٹر سے ہوگئی۔ کسی نے چیخ کر کہا ''جس اسکوٹر نے ٹکر دی ہے وہ مسلمان اسکوٹر ہے۔'' کسی نے کہا ''جی نہیں یہ ساری کارستانی ہندو اسکوٹر کی ہے۔ ہم اپنے مذہب پر اتنے بڑے حملے کو برداشت نہیں کرسکتے۔'' حالانکہ میں نے کلاک ٹاور پر سے دیکھا کہ دونوں اسکوٹروں پر لیڈر کے آدمی سوار تھے اور جو اصحاب شوروغل مچارہے تھے وہ بھی لیڈر کے آدمی ہی تھے۔ میں کلاک ٹاور پر سے چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ میں دھوکہ دہی کے ذریعہ ہونے والے فساد کو نہیں دیکھنا چاہتا کہ اسی اثناء میں ایک چاقو فضاء میں چمک اُٹھا، پھر آن کی آن میں کئی چاقو فضاء میں لہرانے لگے۔ برچھے اور بھالے بھی فضاء میں بلند ہوئے۔ ہندو چاقو مسلمان کی گردن تلاش کرنے لگا اور مسلمان چاقو ہندو کی گردن۔ زندگی میں پہلی بار مجھے ہندوستان کے مشہور و معروف فسادات کو دیکھنے کا شرف حاصل ہورہا تھا۔ آج دل کی مراد پوری ہورہی تھی۔ میں بہت خوش تھا۔ انسانوں کے سر اس قدر صفائی سے کٹ رہے تھے کہ میں عش عش کرنے لگا۔ ایک فسادی نے ایک کمسن بچہ کو اس کمال سے اپنے نیزے پر اُٹھالیا کہ میرے منہ سے بے ساختہ تعریف نکل گئی۔ میں نے اس کے فن پر یوں داد دی جیسے اس نے کوئی شعر کہہ دیا ہو۔ اس نے میری تعریف کے جواب میں مودبانہ سلام کیا تو میں نے چیخ کر کہا ''مکرّر ارشاد ہو''۔ اس پر اس نے جھپٹ کر ایک اور بچے کو نیزے پر اُٹھالیا۔ مجھے اس کا وار کچھ زیادہ پسند نہ آیا تو میں نے ہوٹنگ کے انداز میں اس سے کہا ''اب مقطع کی طرف آجایئے۔'' وہ آگ بگولہ ہوگیا اور کلاک ٹاور کی طرف بڑھنے لگا۔ اس وقت تک شہر کے چوک میں کشتوں کے پشتے لگ گئے تھے اور بازار میں صرف انسانوں کا خون بِک رہا تھا۔ میں ابھی اچھی طرح فسادات کا نظارہ کر بھی نہ پایا تھا کہ وہ فسادی کلاک ٹاور پر چڑھ گیا۔ وہ میرے سر پر آن کھڑا ہوا اور اپنا نیزہ بلند کرکے مقطع ارشاد کرنا ہی چاہتا تھا کہ میں نے گڑگڑا کر اس سے کہا ''میں بیرونی باشندہ ہوں۔ میں تو صرف فساد کو دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔ مجھے نہ مارو۔'' اس پر

اس نے پوچھا ''بتاؤ تم ہندو ہو یا مسلمان؟'' میں نے کہا: '' میں نہ ہندو ہوں نہ مسلمان۔ میں تو صرف ایک انسان ہوں۔'' اس پر وہ بولا '' جب تک آدمی ہندو یا مسلمان نہ بنے اس وقت تک وہ انسان کیسے بن سکتا ہے؟'' تب میں نے کہا: '' لیکن ہندو اور مسلمان بننے کے بعد تو انسان انسان کہاں باقی رہ جاتا ہے، گاجر اور مولی میں تبدیل ہو کر رہ جاتا ہے۔''

وہ میری گستاخی کا جواب نیزے سے دینا چاہتا تھا کہ میں نے اچانک اس لیڈر کا حوالہ دیا جسے میں نے فساد کے لئے بھاری رقم دی تھی۔ لیڈر کا نام سن کر اس نے نیزہ اپنے ہاتھ سے پھینک دیا۔ مگر اسی اثناء میں دوسرے فسادیوں نے مجھے نرغے میں لے لیا۔ میں نے گڑگڑا کر کہا کہ '' مجھے ایک بار لیڈر سے مل لینے دو، اس کے بعد میرے ساتھ جو چاہو سلوک کر لینا۔'' وہ سب مجھے دھکے دے کر اپنے لیڈر کے پاس لے گئے لیکن لیڈر اس وقت بہت مصروف تھا۔ کسی نے بتایا کہ وہ امن کمیٹی کا صدر نشین بن گیا ہے اور کمیٹی کے اجلاس کی صدارت کر رہا ہے۔ میں نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا، وہ فساد میں ہلاک ہونے والوں کی یاد میں اپنی آنکھوں سے خشک آنسو بہا رہا تھا۔ اس نے کہا '' فسادات ہمارے ملک کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ ہیں۔ ہمارا سر شرم سے جھک گیا ہے۔'' میں حیران نظروں سے اس لیڈر کو یوں دیکھتا رہا جیسے اسے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد لیڈر نے اعلان کیا کہ '' میں اس تباہی سے متاثر ہونے والوں کی امداد کے لئے اپنی طرف سے ریلیف فنڈ میں دس ہزار روپے کا عطیہ دیتا ہوں۔'' اس پر سارے ہال میں تالیاں گونج اٹھیں۔ لیڈر کی جے جے کار ہونے لگی اور میں تالیوں کی گونج میں پکارتا رہا '' حضور میں نے آپ کو تیس ہزار روپے دیئے تھے۔ آخر بقیہ بیس ہزار آپ نے صرف اپنے ریلیف کے لئے کیوں رکھ لئے؟''

لیکن میری آواز کا وہی حشر ہوا جو نقار خانے میں طوطی کی آواز کا ہوتا ہے۔ میں نے لیڈر سے اپنی دی ہوئی رقم کا حساب پوچھنے کا خیال ترک کر دیا کیوں کہ اس وقت میرے کانوں میں خطرہ کی گھنٹیاں بج رہی تھیں۔ میں فسادیوں کی نظر بچا کر بھاگ کھڑا ہوا اور کئی دنوں تک بھاگتا رہا۔ ایک دن بالآخر میں اپنے وطن پہنچ گیا۔ لیکن مجھے اب بھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں مسلسل بھاگ رہا ہوں اور فسادی میرا تعاقب کر رہے ہیں۔

اب ہندوستان کے تاج محل، ایلورہ اور اجنتا تو مجھے یاد نہیں رہے۔ ہاں صرف وہاں کے فسادات کی یاد تازہ ہے اور اس قدر تازہ ہے کہ میں اکثر نیند سے چونک کر اُٹھ بیٹھتا ہوں اور چیخنے لگتا ہوں۔

''مجھے لیڈر سے ایک بار مل لینے دو۔''

اور مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے میرا سارا وجود ایک ایسا نیزہ بن گیا ہے جس پر ایک معصوم بچے کا سر لٹکا ہوا ہے۔

(قطع کلام۔ 1969)

دُنیا کے غفُورو ایک ہو جاؤ

غفور جہاں گستری ہمارے چار روزہ دورۂ ازبکستان میں ہمارے مترجم، منتظم، میزبان، ترجمان اور نہ جانے کیا کیا تھے۔ ۲۸ رستمبر ۱۹۸۶ء کی خوش گوار صبح کو اُن سے ہماری ملاقات ہوٹل ازبکستان کی لابی میں یوں ہُوئی جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے۔ معلوم ہُوا کہ سوویت یونین کے سب سے بڑے اَدبی اِشاعتی مرکز ''رادوگا'' میں اُردو کے ایڈیٹر اور صدرِ شعبہ ہیں۔ تعارف کے بعد جب ہم نے اُن کا نام پوچھا تو بولے۔ ''یہ ہیچمدان اور کم ترین عوام الناس میں رخصت الائیو غفور جہاں گستری کے نام سے شناخت پذیر ہے۔'' سخن گستری سے چُوں کہ ہمارا پُرانا تعلق ہے، اس لیے جہاں گستری کی بات تو سمجھ میں آ گئی لیکن 'رخصت الائیو' کا معمّا ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ پوچھا۔ ''یہ رُخصت الائیو کیا ہے؟''

بولے: ''عِلم و دانش اور اُردو زبان و اَدب کا جو ادراک مبداءِ فیّاض سے اس ہیچمدان کو ودیعت ہُوا ہے اس کی مدد سے خاکسار نے بھی اس ''رُخصت الائیو'' کے سرچشمے کی تحقیق و تدقیق کرنے کی سعی و کاوش کی ہے لیکن ناکام و نامراد رہا۔ معلوم نہ ہو سکا کہ اس کا مشتق کیا ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''علم و دانش اور زبان و اَدب کا جو ادراک مبداءِ فیّاض سے ہمیں عطا ہُوا ہے اُس کے مطابق یہ ''رُخصت الائیو'' یا تو ''رُخصت اللہ'' ہے یا ''رُخصت

الٰہی'' ہے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ ازبک زبان میں رُخصت کے کیا معنی ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں رُخصت بہت اچھی چیز ہوتی ہے۔ جیسے رُخصتِ اتفاقی اور رُخصتِ خاص وغیرہ۔ ہمارے سرکاری ملازمین میں بہت مقبول ہے بلکہ اُن کا من بھاتا کھاجا ہے۔ عام فہم زبان میں اسے چھٹی کہتے ہیں، لیکن عام فہم زبان آپ کی سمجھ میں تو نہیں آئے گی۔ کیسے آپ کو سمجھائیں۔ ہماری دانست میں رُخصت اللہ یا رُخصت الٰہی کا عام سا مفہوم یہی ہے کہ یا تو اللہ نے آپ کو چھٹی دے رکھی ہے یا آپ نے اللہ کو ــــ ''

بولے: ''مہمانِ گرامی قدر! اس حقیر فقیر بندۂ پُرتقصیر کے نام کے اَسرار و رموز کو جاننے میں آپ اپنی حیاتِ جاوداں کی عزیز ساعتیں اور بیش بہا ذہانتیں کیوں ضائع کرتے ہیں۔ ناچیز کو صرف غفور کہیے۔ آپ کے ہاں بھی یہ چیز ہوتی ہوگی۔''

ہم نے کہا: ''غفور نہ صرف ہمارے ہاں ہوتے ہیں بلکہ ساری دُنیا میں پائے جاتے ہیں۔ ہمارے حیدرآباد دکن میں تو غفوروں کی ایک الگ قسم بھی پائی جاتی ہے، جسے ''ڈنڈ غفور'' کہتے ہیں۔ اس کی توضیح و تشریح ہم نہیں کریں گے کیوں کہ ہمیں نہ صرف آپ کی دوستی، بلکہ ہند رُوس دوستی بہت عزیز ہے۔ اس دُنیا میں کوئی ساٹھ غفور تو خود ہمارے دوست ہیں۔ آپ اِکسٹھویں غفور ہیں۔ یوروپ میں پانچ غفورے ہیں جو ہمارے دوست ہیں۔ امریکہ میں بھی دو غفور ہمارے دوست ہیں۔ باقی کے غفورے ہندوستان میں ہیں۔ وسط ایشیا میں کوئی غفور ہمارا دوست نہیں تھا، اب خدا نے آپ کو اس منصبِ جلیلہ پر فائز کیا ہے۔''

ہماری بات کو سُن کر غفور جہاں گستری نے خالص لکھنوی انداز میں سلام کرتے ہوئے کہا۔ '' آپ کی ذرّہ نوازی، غفور شناسی اور غفور پروری کا شکریہ۔ مگر ہم اصل موضوع سے رُوگردانی کرتے جارہے ہیں۔ مجھے سب سے پہلے آپ کا رسمی طور پر استقبال اور خیر مقدم کرنے کا زرّین اور نادر موقع عنایت کیجیے۔ آپ نے ازبکستان کی سرزمین پر قدم رنجہ فرماکر ہماری عزّت و توقیر میں جو اضافہ کیا ہے، اس کے لیے میں سالم و کامل صمیمِ قلب کے ساتھ آپ کی خدمتِ اقدس میں اپنے شخصی اور ازبک عوام کے عمومی جذباتِ تہنیت و تشکر و تبریک پیش کرتا ہوں۔

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف۔''

ہمارے ہندوستانی ہم سفر اشتیاقِ عابدی نے دبی زبان میں ہم سے پوچھا:

''مجتبیٰ بھائی! یہ غفور صاحب کیا کہہ رہے ہیں؟''

ہم نے کہا۔''بڑی تکلیف کے ساتھ کتابی اُردو میں ہمارا شکریہ ادا کرر ہے ہیں۔''

اس کے بعد یہ معمول سا بن گیا کہ اگر ازبکی زبان میں کوئی ہم سے بات کرتا، تو غفور جہاں گستری ''طلسم ہوش رُبا'' والی اُردو میں اس کا ترجمہ ہمارے لئے کرتے اور بعد میں ہم غفور جہاں گستری کی اُردو کا ترجمہ خود اپنی اُردو میں اشتیاقِ عابدی کے لئے کرتے تھے۔ پتا نہیں غفور جہاں گستری نے یہ اُردو کہاں سے سیکھی اور کیسے سیکھی۔ اُردو کے ایسے مشکل، ثقیل اور متروک الفاظ جنہیں تیس چالیس بَرس میں ہم نے نہ کہیں سُنا نہ پڑھا نہ لکھا، انہیں غفور جہاں گستری کی وساطت سے ازبکستان میں سننے اور برتنے کا موقع ملا۔ اُن سے مِل کر نہ صرف اُردو کا مستقبل روشن نظر آیا بلکہ اس کا ماضی تو اتنا روشن نظر آیا کہ ہماری بصارت اور بصیرت، دونوں چکاچوند ہو گئیں۔ معلوم ہوا کہ موصوف فیض احمد فیضؔ سے نہ صرف مل چکے ہیں بلکہ اُن سے گھنٹوں اپنی مخصوص اُردو میں تبادلۂ خیال بھی کیا ہے۔ ہم نے کہا کہ ''ہمیں پتا ہے کہ آپ فیض احمد فیضؔ سے مِل چکے ہیں۔''

گہرے تجسّس کے ساتھ پُوچھا۔''آپ پر یہ حقیقت کیسے منکشف ہوئی کہ خاکسار فیض احمد فیضؔ کی دِل نواز صُحبتِ خاص سے مستفیض و فیض یاب ہو چکا ہے۔''

ہم نے کہا۔''فیضؔ کی شاعری پر آپ کی اُردو کے اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ آخری عمر میں بڑی مشکل شاعری کرنے لگے تھے۔ آپ سے نہ ملتے تو اُن کی شاعری میں یہ موڑ کہاں سے آتا۔''

نظریں جھکا کر اور قدرے شرما کر بولے۔''آپ کی غفور نوازی کا شکریہ۔''

چار دن ازبکستان میں اُن کے اور اُن کی اُردو کے ساتھ ایسے گزرے کہ ذہن کے نہاں خانے میں ہمیشہ محفوظ رہیں گے۔ پہلے دن تاشقند کی سیر کرا کے رات کو وہ اپنے گھر چلے گئے تو اشتیاق عابدی نے ہم سے کہا۔''اب آپ اپنے بسترِ استراحت کو اپنے

قدوم میمنت لزوم سے سرفراز فرمائیں تا کہ نیند آپ کو اپنی پُرسکون آغوش میں سمولے اور آپ اس جہانِ فانی کے آلام و مصائب نیز افکار و حوادث سے عرصۂ مختصر کے لیے ہی سہی، رُست گاری حاصل کر سکیں۔"

ہم نے ہنس کر کہا۔" فیضؔ کی شاعری کے بعد اب آپ کی نثر بھی غفور جہاں گستری کی اُردو سے متاثر ہونے لگی ہے۔ عابدی صاحب! سچ تو ہے کہ غفور جہاں گستری سے مل کر ہمیں بے ساختہ بیل کی والدہ کی یاد آرہی ہے۔"

اشتیاق عابدی نے حیرت سے پوچھا:" بیل کی والدہ! یہ کیا قصہ ہے؟"

ہم نے کہا۔" یہ قصہ بیس بائیس برس پُرانا ہے۔ آندھرا پردیش ساہتیہ اکیڈمی نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ تلگو کے افسانوں کا اُردو ترجمہ کیا جائے۔ اس کام کے لیے ایک تلگو ادیب کا انتخاب کیا گیا جو دونوں زبانوں پر قُدرت رکھتے تھے۔ ایک المیہ افسانہ تھا جس میں ایک غریب کسان کی زندگی کو پیش کیا گیا تھا۔ اس کہانی میں کسان کا نوجوان بَیل مر جاتا ہے۔ منظر کچھ اس طرح کا تھا کہ نوجوان بَیل مر چکا ہے۔ ایک طرف بَیل کی نعش پڑی ہے، دوسری طرف کسان اُداس بیٹھا ہے اور تیسری طرف وہ گائے بھی اُداس کھڑی ہے جس نے اس بَیل کو جنم دیا تھا۔ افسانے کا یہ موڑ نہایت متاثر کُن تھا۔ لیکن مترجم نے فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے ہوئے اس منظر کو اپنی عالمانہ اُردو میں یوں بیان کیا تھا۔" ایک طرف تو نوجوان اور نوخیز بَیل کی نعش بے گور و کفن پڑی تھی، دوسری طرف رنجور و ملول کسان بیٹھا تھا، اور تیسری طرف بَیل کی وَالدہ کھڑی آنسو بہا رہی تھی۔"

دُوسرے دن مترجم موصُوف ترجمہ کے بارے میں ہماری رائے جاننے کے لیے آئے تو ہم نے کہا۔" ترجمہ تو نہایت فصیح و بلیغ ہے، ہمیں پسند آیا۔ لیکن ایک افسانہ میں بَیل کی والدہ کا ذکر ہے، اس طرزِ تخاطب پر ذرا نظرِ ثانی کر لیں تو مناسب ہے۔"

تیسرے دن وہ ترجمہ پر نظرِ ثانی کر کے ہمارے پاس آئے۔ ہم نے بَیل کی والدہ والا صفحہ کھولا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اب کی بار فاضل مترجم نے" بَیل کی والدہ" کو کاٹ کر" بَیل کی والدۂ محترمہ و معظمہ" بنا دیا تھا۔

یہ تو خیر ایک لطیفۂ معترضہ تھا۔ بات غفور جہاں گستری کی ہو رہی تھی۔ جتنی

مشکل اُردو وہ بولتے تھے اتنے ہی سادہ انسان وہ ہمیں نظر آئے جیسا کہ عام طور پر سارے غفور ہوتے ہیں۔ نہایت معصوم، مخلص، بے ریا، محنتی اور شریف۔ تاشقند جا کر ہی ہمیں پتا چلا کہ غفور چاہے ہندوستان میں رہیں یا یوروپ میں یا وسط ایشیا میں، سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اسی لیے تو ہم مذاق مذاق میں اُنہیں یہ نعرہ دے آئے ہیں کہ "دُنیا کے غفورو ایک ہو جاؤ۔"

اُن کی پابندیٔ وقت کا یہ عالم ہوتا تھا کہ صبح آٹھ بجے آنے کے لیے کہہ جاتے تھے تو ٹھیک سات بج کر اُنسٹھ منٹ پر دَروازے پر اُن کی دستک سُنائی دیتی تھی۔ چوں کہ اُنہیں معلوم تھا کہ ہم ادیب ہیں، اسی لیے ایسی جگہوں پر لے جاتے تھے جو ادیبوں کی دِل چسپی کا سبب بنیں۔

پہلے دن لینن چوک کی سَیر کرا چکے تو کہنے لگے۔ "اب مَیں آپ کو باغِ شعرا لے چلتا ہوں جو علی شیر نوائی تھیٹر کے آگے واقع ہے۔"

ہم نے کہا۔ "غفور صاحب! مانا کہ ہم ادیب ہیں لیکن شاعروں سے نہ صرف گھبراتے ہیں بلکہ اُن سے حتی الامکان بچنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ سوویت یونین کا دورہ بھی اس لیے کر رہے ہیں کہ کچھ دن کے لیے سہی، اُردو کے شاعروں سے ہماری جان چُھوٹے اور ہم 'مکرّر ارشاد' اور 'سُبحان اللہ' کہنے سے بچے رہیں۔ آپ تو یہاں بھی ہمیں "باغِ شعرا" میں لے جا رہے ہیں۔ کہیں کِسی شاعر نے ہمیں کلام سُنا دیا تو؟ ـــ اور اگر غلطی سے کوئی شعر سمجھ میں آ گیا تو؟"

غفور جہاں گستری بولے۔ "آپ خوف زدہ نہ ہوں۔ مَیں آپ کو اُن مُردہ شاعروں کے پاس لے جا رہا ہوں جو اَمر ہو چکے ہیں۔"

ہم نے پوچھا۔ "کیا مطلب؟"

بولے "باغِ شعرا میں آپ کو زندہ شاعر نہیں ملیں گے۔ اس باغ میں تو اُزبکستان کے سارے عظیم المرتبت شاعروں کے مجسمے آپ کو دیکھنے کو ملیں گے۔"

خیر تھوڑی دیر بعد ہم باغ شعرا میں تھے۔ ایسی خُوب صورت اور پُر فضا جگہ ہے کہ ہم جیسے شاعر دُشمن کا جی بھی شعر گوئی کی طرف مائل ہونے لگا۔ شاعروں کے کیسے باوقار اور پُرشکوہ

مجسمے ہیں۔ علی شیر نوائی، لطفی، نادرہ، مولانا مقیمی، ظہیر الدین فرقت، حکیم زادہ نیازی، عبداللہ قادری، حمید عالم جان، غفور غلام اور موسیٰ ایبک، اپنے اپنے ڈھنگ سے فکرِ شعر میں محو ہیں ایک گوشے میں بڑی سی پگڑی باندھے ایک مجسمہ کھڑا تھا۔ ہم نے پوچھا۔ ''آپ کی تعریف؟''

غفور جہاں گستری بولے۔ ''یہ بابور ہے بابور۔ ازبکستان کا مشہور عالم اور شاعر۔ اس کے ''بابور نامہ'' کا ذکر آپ نے سُنا ہوگا۔''

یہ سنتے ہی ہمارا سر تعظیماً جُھک گیا اور ہم نے غفور جہاں گستری سے کہا۔ ''غفور صاحب! خبردار۔ باادب، باملاحظہ ہوشیار۔ آپ جس بابور کا یوں سَرسَری ذکر کر رہے ہیں وہ ہمارے سلطان ابنِ سلطان، خاقان ابنِ خاقان، بانیِ سلطنتِ مغلیہ، گیتی پناہ، شہنشاہِ ہندوستان ظلِ سُبحانی اعلیٰ حضرت ظہیر الدین محمد بابر ہیں۔ کم از کم اُن کا نام تو احترام سے لیجیے۔ یہ ہمارے حکمران رہ چکے ہیں۔''

غفور جہاں گستری بولے ''ہوں گے آپ کے حکمران مگر یہاں تو بابور دلوں پر حکمرانی کرتا ہے۔ اس کے شعر کا سکّہ چلتا ہے اور اس کے علم کا ڈنکا بجتا ہے۔''

سوویت یونین میں ادیبوں اور فن کاروں کی جو عزّت ہے اسے دیکھ کر ہم کچھ اور بھی احساسِ کمتری میں مبتلا ہوگئے۔ شاہ راہیں اُن کے نام سے ہیں۔ پہاڑوں کی چوٹیاں فن کاروں کے ناموں سے منسوب ہیں۔ تاشقند کے کئی اسٹیشنوں کے نام شاعروں اور ادیبوں کے نام پر رکھے گئے ہیں۔ ہم نے غفور جہاں گستری سے پوچھا۔ ''اتنے دیوہیکل اور بھاری مجسموں کی تیاری پر کتنا خرچ آتا ہوگا۔''

بولے۔ ''ایک ایک مجسمہ پر کئی کئی ہزار روبل خرچ آتا ہے۔''

ہم نے کہا۔ ''اگر آپ ازراہِ اَدب نوازی ہمیں بھی روزانہ صرف دس روبل دیا کریں تو ہم خود بہ نفسِ نفیس بطورِ مجسمہ آپ کے باغِ شعرا میں کھڑے ہونے کو تیار ہیں۔ اتنا سستا مجسمہ آپ کو نہیں ملے گا۔''

ہمیں غفور جہاں گستری پر اس وقت غصہ آیا جب انہوں نے ہماری پیش کش کو ہنس کر ٹال دیا۔

فی الحال ہم اُن کی انسان دوستی اور فرض شناسی کا ایک واقعہ سُنا کر اُن کے ذکر کو ختم کرنا چاہیں گے۔

ازبکستان میں پہلے ہی دن سے وہ ہماری صحت کے بارے میں ضروری اور غیر ضروری ہدایتیں دیا کرتے تھے۔ ہمیں چھینک بھی آجاتی تو اُن کا دِل دھڑکنے لگتا تھا۔ کہتے تھے آپ کو ازبکستان سے ماسکو اور لینن گراڈ بھی جانا ہے۔ ماسکو پہنچنے تک آپ کی صحت کو ٹھیک رکھنے کی ذمہ داری میری ہے، اس لیے اپنی صحت کی حفاظت کیجیے۔ بخارا کی سَیر سے ہم دوبارہ تاشقند واپس آنے لگے تو اچانک بخارا کا موسم بے حد سَرد ہو گیا۔ لوگوں کا بیان تھا کہ پچھلے پچاس برس میں ایسا موسم دیکھنے کو نہیں ملا۔

ہم رات کو ایک چھوٹے سے طیارہ کے ذریعے بخارا سے تاشقند آئے۔ پون گھنٹے کی پرواز میں وہ بار بار ہمارا حال پوچھتے رہے کہ بخارا کے موسم سے کہیں آپ کو بخار تو نہیں آرہا ہے۔ آنکھوں میں کہیں جلن تو نہیں ہورہی ہے۔ اشتیاق عابدی نے طیارہ میں کھانسنا شروع کیا تو بے چین سے ہونے لگے۔ رات کو ہمیں ہوٹل پر چھوڑ کر جانے لگے تو بولے: ''بخارا کے سرد اور غیر متوقع موسم کے لیے مَیں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ میرے اختیار میں نہیں تھا کہ بخارا کو اس موسم سے اور اس موسم کو آپ سے بچاتا۔ کل تاشقند میں آپ کا بے حد مصروف آخری دن ہے۔ کئی جلسوں میں آپ کو شرکت کرنی ہے اور خطاب بھی کرنا ہے۔ اپنی صحت کو ٹھیک رکھیئے اور ہو سکے تو اپنی اپنی تقریروں کی بھی تیاری کر لیجیے۔ مَیں صبح آٹھ بجے کمرہ پر آجاؤں گا۔''

اس بار اشتیاق عابدی کو اور ہمیں ایک بڑے ڈبل بیڈ کمرہ میں ٹھہرایا گیا۔ ہم تو حسبِ عادت گھوڑے بیچ کر سو گئے۔ صبح پانچ بجے ہماری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ اشتیاق عابدی اپنے بستر میں پڑے ہند۔رُوس دوستی کے موضوع پر بہ آواز بلند تقریر کر رہے ہیں۔ ہم بھی کچھ کم چالاک نہیں ہیں۔ بڑی آہستگی کے ساتھ میز پر سے قلم اور کاغذ اُٹھایا اور لگے اُن کی تقریر کے اہم نکات کو نوٹ کرنے۔ اشتیاق عابدی کہے چلے جار ہے تھے ـــــ ''ہند رُوس دوستی کے بغیر عالمی امن کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ رُوس کی دوستی وقت کی کسوٹی پر پَرکھی ہوئی دوستی ہے۔ سوویت یونین نے کب کب، کہاں کہاں اور

کیسے کیسے کٹھن وقت میں ہماری مدد کی ہے۔ میری امّاں ـــــ میری امّاں (کراہنے کی آواز) سوویت یونین ہمارا سب سے گہرا دوست ہے۔ میری امّاں ـــــ میری امّاں ـــــ''

تقریر تو اُن کی بہت مدلّل اور اثر انگیز تھی، مگر یہ درمیان میں ''میری امّاں۔ میری امّاں'' کی تکرار سے ہمیں تشویش سی ہوئی۔ دبے پاؤں اُن کے قریب جا کر اُن کی پیشانی پر ہاتھ رکھا تو یوُں لگا جیسے ہم نے جلتے ہوئے توے پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ ہم نے اُنہیں جگانے کی کوشش کی تو ایک عجیب سی بحرانی کیفیت میں پوچھا۔ ''کون ہے؟''

ہم نے کہا۔ ''آپ کا دوست ہوں مجتبٰی۔''

کروٹ بدلتے ہوئے بولے۔ ''کوئی مجتبٰی میرا دوست نہیں ہے۔ سوویت یونین ہی میرا واحد دوست ہے۔ مجھے سوویت یونین کی دوستی پر فخر ہے میری امّاں۔ میری امّاں۔''

ہم نے تاڑ لیا کہ معاملہ سنگین ہو گیا ہے۔ دیارِ غیر میں کس سے مدد طلب کریں اور طلب کریں بھی تو کس زبان میں۔ ہم جس زبان میں اپنا مدعا یا مرض کی کیفیتیں بیان کرتے ہیں، اس کے جاننے والے تو غفور جہاں گستری ہی ہیں جو دو ڈھائی گھنٹوں کے بعد آئیں گے۔ ہندوستان سے ہم مختلف النوع امراض کی جو دوائیں اپنے ساتھ لے گئے تھے، وہ اشتیاق عابدی کو دے دیں۔ مگر اُن کی ہند۔رُوس دوستی میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ بلکہ آخیر میں تو امریکہ کو کھلم کھلا گالیاں تک دینے لگے۔ ٹھیک سات بج کر اُنسٹھ منٹ پر غفور جہاں گستری آئے تو ہم نے انہیں سارا ماجرا کہہ سُنایا۔ یہ سُنتے ہی غفور جہاں گستری پسینہ میں شرابور ہو گئے۔ چکرا کر گرنے ہی والے تھے کہ ہم نے اُنہیں تھام لیا اور کہا۔ ''ہمارے ہاں آدابِ تیمارداری ایسے نہیں ہوتے۔ تیماردار کو کٹھور دِل کا ہونا چاہیے۔'' غفور جہاں گستری نے ہماری کوئی بات نہیں سُنی اور اچانک کمرہ سے چلے گئے۔ پانچ منٹ بعد وہ دو عدد لیڈی ڈاکٹروں، تین عدد نرسوں اور ایک اسٹریچر کے ساتھ نمودار ہوئے۔ ڈاکٹروں نے اشتیاق عابدی کا معائنہ شروع کر دیا تو یہ پسینہ پونچھتے ہوئے بولے۔ ''مَیں نے سارے انتظامات کر لیے ہیں، نیچے ایمبولینس گاڑی بھی ایستادہ ہے۔''

ہم نے کہا۔" اور اس کے بعد کے انتظامات کے بارے میں بھی کہہ دیا ہوگا۔"

انہوں نے ہماری بات سُنی اَن سُنی کر دی۔ انہیں ہماری بات سننے کا ہوش ہی کہاں تھا۔ اشتیاق عابدی کے نہ نہ کرتے لیڈی ڈاکٹروں نے اُن کے دونوں کولہوں پر دو انجکشن داغ دیئے اور کہا۔" دو گھنٹوں کے اندر اندر اگر انہیں پسینہ آ گیا تو تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

پروگرام کے مطابق دس بجے ادارۂ شرقیات میں ہمارا خیر مقدم تھا۔ نرس کو اشتیاق عابدی کے پاس چھوڑ کر ہم اکیلے ہی سوئے مقتل چلے۔ اشتیاق عابدی سے کہا۔" آپ فکر نہ کریں، ہم سنبھال لیں گے۔ ہندوستان کی طرف سے اچھی سی تقریر بھی کر دیں گے۔ رات کو آپ کی تقریر تو ہم نے سُن ہی لی ہے۔ اس میں سے "میری اماں، میری اماں" کو نکال کر باقی تقریر کر دیں گے۔"

دو گھنٹے بعد ہم واپس آئے تو اشتیاق عابدی بدستور تقریر کیے جا رہے تھے اور پسینہ کا دُور دُور تک پتا نہیں تھا۔ اب غفور جہاں گستری کی پریشانی بے قابو ہو گئی تھی اور وہ پسینہ میں شرابور ہونے لگے۔ وحشت سے بولے" شومئی قسمت سے یہ بہت بُرا ہو رہا ہے۔ ہم تاشقند میں ہندوستانی مہمانوں کے تعلق سے بہت فکرمند رہتے ہیں۔ اگر عابدی صاحب کو فوراً پسینہ نہ آیا تو ہم انہیں ماسکو نہ جانے دیں گے۔ یہیں اسپتال میں داخل کروا دیں گے۔ آپ ماسکو چلے جایئے، اور یوں بھی اُن کا تاشقند سے ہندوستان واپس جانا زیادہ آسان ہے بہ نسبت ان کے ماسکو سے ہندوستان جانے کے۔"

اتنا سنتے ہی اشتیاق عبادی رضائی پھینک کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور اُن کے جسم سے پسینہ کا وہ سیلاب اُمڈا کہ اسی میں غسل فرمانے لگے۔ معصومیت میں لپٹی ہوئی غفور جہاں گستری کی سچ بات کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ اشتیاق عابدی کو پسینہ میں شرابور دیکھ کر غفور جہاں گستری کے چہرے پر سکون اور مسرت کے وہ آثار دکھائی دیئے جو عموماً ایک بچہ کو جنم دینے کے بعد ماں کے چہرے پر دکھائی دیتے ہیں۔

(سفرِ لخت لخت۔ 1987)

اُردو مشاعرے اور بیرونی سیّاح

بہت عرصہ پہلے سویڈن سے آئے ہوئے ہمارے ایک غیر ملکی دوست نے (جو اُردو بالکل نہیں جانتے) ہم سے خواہش ظاہر کی تھی کہ وہ کسی اُردو مشاعرہ میں شرکت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم نے انہیں اس وقت اُردو مشاعرہ سے دور رکھنے کی بساط بھر کوشش کی تھی لیکن وہ برابر مصر رہے کہ اُردو مشاعروں کا بڑا شہرہ سنا ہے۔ دیکھیں تو سہی یہ کیا ہوتا ہے اور کیسا ہوتا ہے۔ اُن کی خواہش کے احترام میں ہم اُنہیں ایک ایسے اُردو مشاعرہ میں لے گئے تھے جس میں کئی نامی گرامی شعراء نے شرکت کی تھی۔ شعر تو خیر ہماری سمجھ میں بھی نہیں آتے۔ لیکن مشاعرہ میں ایک مرحلہ پر داد کا جب بے پناہ شور بلند ہونے لگا اور لوگ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر داد دینے کی خاطر شاعر کی طرف بڑھنے لگے تو ہمارے غیر ملکی دوست نے ''آداب مشاعرہ'' سے عدم واقفیت کی بنا پر یہ سمجھ لیا کہ یہ لوگ شاعر پر حملہ کرنے کا ناپاک ارادہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا فوراً اسٹیج میں کود پڑے اور داد دینے والے سامعین سے مخاطب ہوکر انگریزی میں کہنے لگے ''یہ ایک نہایت انسانیت سوز حرکت ہے کہ آپ ایک نہتے اور اکیلے انسان کے ساتھ ایسا غیر انسانی برتاؤ کر رہے ہیں۔ آپ میں ہمت ہے تو ایک ایک کر کے اس کا مقابلہ کریں۔'' وہ تو اچھا ہوا کہ اکثر سامعین انگریزی نہیں جانتے تھے اور یہ اُردو نہیں جانتے تھے۔ لہٰذا معاملہ رفع دفع ہوگیا۔ دلچسپ بات تو یہ ہے کہ اُن کی اس بیجا مداخلت پر سب سے زیادہ اعتراض اس شاعر کو ہی تھا جس کی حمایت میں انہوں نے آواز

اُٹھائی تھی۔ اس پر ہمارے غیر ملکی دوست کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ کہنے لگے "صاحب! اُردو شاعر بھی عجیب و غریب مخلوق ہے۔ میں تو انسانی ہمدردی کے ناتے اس کی مدد کرنا چاہتا تھا اور وہ اُلٹا مجھ سے ناراض ہوا جاتا ہے۔" ہم نے اُنہیں سمجھایا کہ اُردو شاعری اور اُردو شاعر دونوں کبھی آپ کی سمجھ میں نہ آسکیں گے۔ دور کیوں جایئے، خود ہمیں دیکھ لیجئے کہ اُردو ماحول اور تہذیب میں پلے بڑھے ہیں لیکن آج تک صحیح معنوں میں شاعری ہماری سمجھ میں نہ آسکی۔ کبھی شاعری سمجھ میں آگئی تو شاعر سمجھ میں نہیں آیا اور اگر شاعر سمجھ میں آگیا تو اس کی شاعری ہمارے پلے نہیں پڑی۔ اسی لئے ایک عرصہ سے خود ہم نے مشاعروں میں جانا چھوڑ دیا ہے۔ کیوں کہ تضیع اوقات کے لئے ہم نے اس سے کہیں زیادہ بہتر بہانے تلاش کر لیے ہیں۔

لیکن پچھلے دِنوں ہمیں پھر ایک مشاعرہ میں شرکت کرنے کا موقع ملا اور اتفاق دیکھئے کہ اس بار بھی ہمیں ایک غیر ملکی کے ساتھ ہی مشاعرہ میں جانا پڑا۔ اب کے ہمارے ایک جاپانی دوست (جو اُردو بالکل نہیں جانتے) ہندوستان آئے تو کہنے لگے اُردو مشاعروں کا بڑا شہرہ سنا ہے، دیکھیں تو سہی یہ کیسا ہوتا ہے اور کیا ہوتا ہے۔ ہم نے اُنہیں بہتیرا سمجھایا کہ حضور آپ اُردو مشاعرہ کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکیں گے۔ اس سے بہتر تو یہ ہے کہ ہم چڑیا گھر دیکھ لیں۔ وہاں بھی بھانت بھانت کے جانور آپ کو دیکھنے کو مل جائیں گے۔ بولے "چڑیا گھر تو ہمارے ٹوکیو میں بھی ہے۔ مگر آپ جن "جانداروں" کا ذکر کررہے ہیں وہ ہمارے چڑیا گھر میں پائے نہیں جاتے۔" سچ تو یہ ہے کہ سویڈن والے دوست کے تلخ تجربہ کی روشنی میں ہم اپنے جاپانی دوست کو بہت ڈرتے ڈرتے مشاعرہ میں لے گئے تھے۔ مشاعرہ کے دوران ان پر کڑی نظر بھی رکھی کہ وہ کہیں انسانیت کے جذبہ سے مغلوب ہو کر ڈائس پر نہ پہنچ جائیں۔ یہ ضرور ہے کہ مشاعرہ میں جانے سے پہلے ہم نے اُنہیں "آداب مشاعرہ" کے بارے میں کچھ ضروری باتیں بتادی تھیں کہ داد کس طرح دی جاتی ہے، شاعر کس طرح سلام کرتا ہے، صدر مشاعرہ کس طرح اونگھتا رہتا ہے۔ خاتون شعراء کم عمر نظر آنے کے لئے کیا کیا حربے استعمال کرتی ہیں۔ ناظم مشاعرہ سے ان کی نوک جھونک کس طرح چلتی ہے۔ ہمیں کیا پتہ تھا کہ وہ اتنی جلدی "آداب مشاعرہ" کو

جان لیں گے۔ چنانچہ وہ مشاعرہ میں گئے تو یوں نظر آئے جیسے مشاعروں کے ''عادی سامع'' ہوں (عادی سامع اور عادی مجرم میں ہمیں بہت زیادہ فرق نظر نہیں آتا)۔ بات دراصل یہ ہوئی کہ انہوں نے سمجھا کہ مشاعرہ بھی اصل میں ایک ڈرامہ ہے جس میں ہر کردار (بشمول سامعین کے) پہلے سے طے شدہ ریہرسل کے مطابق کام کرتا ہے۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ہم مشاعرہ گاہ میں پہنچے تو ڈائس پر بیٹھے ہوئے بھانت بھانت کے شعراء کے مختلف النوع لباس اور حلیہ کو دیکھ کر انہوں نے پوچھا کہ ان شاعروں کے (Costumes) یعنی لباس منتظمین مشاعرہ فراہم کرتے ہیں یا اس کی ذمہ داری خود شاعروں کی ہوتی ہے۔ ہم نے کہا ''لباس تو اُن کا اپنا ہوتا ہے''۔ پوچھا ''اور جو یہ لوگ مشاعرہ میں کلام سناتے ہیں تو وہ بھی اُن ہی کا ہوتا ہے یا منتظمین مشاعرہ اپنی طرف سے کلام فراہم کرتے ہیں؟''۔ اس معصوم مگر مشکل سوال کا جواب خود ہمیں بھی نہیں معلوم تھا۔ بلکہ ہم نے اس بارے میں کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ لہٰذا ہم نے کہا ''آپ نے عجیب وغریب سوال پوچھا ہے۔ اس کا آسان جواب دینے کے ہم بھی اہل نہیں ہیں۔ سچ پوچھئے تو ہمیں بھی اکثر یہ شبہ ہوتا ہے کہ بیشتر شعراء کا کلام یا تو منتظمین مشاعرہ فراہم کرتے ہیں یا کوئی اور انہیں فراہم کرتا ہے۔ پھر بھی عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ شعرا کا کلام اُن کا اپنا ہوتا ہے۔ اب وہ کسی سے اصلاح لیتا ہے یا نظرِ ثانی کرواتا ہے تو یہ اس کا اور اصلاح دینے والے کا ذاتی معاملہ ہوتا ہے۔'' پھر انہوں نے پوچھا کہ ''اور یہ جو کلام پر سامعین کی طرف سے داد دی جاتی ہے تو کیا اس کی مقدار بھی پہلے سے طے شدہ ہوتی ہے کہ کس کے کلام پر کتنی داد دی جائے گی؟'' ہم نے کہا ''داد دینے کا معاملہ بھی مشکوک ہے۔ اکثر شعراء اپنے سامعین اپنے ساتھ لے آتے ہیں اور جن کے داد دینے کا انداز یہ ہوتا ہے کہ ابھی شاعر صرف ''عرض کیا ہے'' ہی کہتا ہے اور اُدھر اس کے سامعین ''مکرر ارشاد'' کا نعرہ بلند کر دیتے ہیں۔ بے ساختہ داد وہی ہوتی ہے جو بنا سوچے سمجھے دی جائے۔ پھر ہمارے جاپانی دوست نے ایک شاعر کے لمبے اور بکھرے ہوئے بالوں کی طرف اشارہ کر کے کہا ''یہ بال مصنوعی ہیں یا اصلی؟'' حیرت سے کہنے لگے ''ایسے بالوں کے ساتھ کسی کا نارمل حالت میں زندہ رہنا اور اوپر سے شعر کہنا واقعی کمال کی بات ہے۔

ایسے بال اگر میرے سر پر ہوں تو بلا شبہ میں اپنے کپڑے پھاڑ کر جنگل کی طرف نکل جاؤں۔ کیا ان بالوں کو دیکھ کر آپ میں وحشت کے آثار نہیں پیدا ہو رہے ہیں؟"۔ ہم نے کہا "ہمارے اکثر شاعر تو اب بال بھی بنوانے لگے ہیں اور جمعہ کے جمعہ نہا بھی لیتے ہیں۔ جو شیروانی سال میں ایک بار ڈھلتی تھی اب مہینہ میں ایک بار ڈھلنے لگی ہے۔ لیکن کچھ برس پہلے تک اُردو شاعروں کا مقبول و معروف حلیہ یہی رہا ہے۔"

اس پر ہمارے جاپانی دوست بڑی دیر تک اُردو شاعر کے حوصلے کی داد دیتے رہے۔

مشاعرہ میں جب ایک مرحلہ پر سامعین نے ایک شاعر پر انڈے اور ٹماٹر پھینکنے شروع کئے تو ہمارے جاپانی دوست نے ہم سے پوچھا "مجھے لگتا ہے اس شاعر کا کلام بہت اچھا ہے، تبھی تو سامعین اس پر کھانے پینے کی چیزیں پھینک رہے ہیں۔ دیگر شاعروں کو تو صرف رُوکھی سُوکھی زبانی داد دی گئی جب کہ اس شاعر کو کھانے پینے کی چیزوں اور نعمتوں سے نوازا جا رہا ہے۔" اب ہم اُنہیں کیا سمجھاتے کہ اُردو مشاعرہ ہماری وہ عظیم روایت ہے جس کے اسٹیج پر جہاں تہذیب کے نظارے دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں بدتہذیبی کے مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ جسے ہم ہوٹنگ کہتے ہیں اسے بھی وہ "داد" بلکہ "بے ساختہ داد" سمجھ بیٹھے تھے۔ ہم نے اُن کی غلط فہمی دور کرنی بھی نہیں چاہی کیوں کہ اُنہیں کون سا بار بار مشاعروں میں جانا تھا۔ مشاعرہ کو دیکھ کر (ظاہر ہے کہ مشاعرہ اُن کے لئے سننے کی چیز تو تھا ہی نہیں) وہ بہت خوش تھے۔ باہر نکلے تو کہنے لگے "مجھے صدر مشاعرہ کا کردار بہت اچھا لگا۔ لگاتار چار گھنٹوں تک وہ مسند صدارت پر بیٹھا رہا۔ ایک بار بھی اُس نے پہلو نہیں بدلا۔ ایک بار بھی وہ اسٹیج سے اُٹھ کر کہیں نہیں گیا جب کہ دیگر شعراء حضرات بار بار اُٹھ کر اسٹیج کے پیچھے جا رہے تھے۔ یہ اسٹیج کے پیچھے کیوں جا رہے تھے؟ کیا نئے شعر کہنے کے لئے جا رہے تھے؟"

یہ ایسے سوالات تھے جن کے صحیح جواب ہم دے دیتے تو اُردو مشاعرہ کی روایت کے بارے میں اُن کے ذہن میں کئی شکوک و شبہات پیدا ہو سکتے تھے۔ اسی لئے ہم نے موضوع کا رُخ موڑ دیا اور اُنہیں خاتون شعراء کے ترنم میں اُلجھا دیا۔

(آخر کار۔ 1997)

مشاعرے اور مُجرے کا فرق

دہلی کے ایک ہفتہ وار رسالہ نے اُردو مشاعروں کے زوال پر مختلف شاعروں اور دانشوروں کے بیانات کوشائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔اس کے تازہ شمارہ میں اُردو کے بزرگ شاعر حضرت خمار بارہ بنکوی کا ایک بیان شائع ہوا ہے جس میں اُنہوں نے مشاعرہ کے زوال کے دیگر اسباب پر روشنی ڈالتے ہوئے آج کے دور کی شاعرات کے بارے میں بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔اُن کا کہنا ہے کہ'' آج کی شاعرات نے مشاعرہ کو مُجرا بنادیا ہے۔ پہلے میں مشاعرہ میں جاتا تھا تو عمر بڑھتی تھی۔مگر اب مشاعروں میں جانے سے عمر گھٹنے لگی ہے۔''

حضرت خمار بارہ بنکوی ماشاءاللہ اب اسّی (۸۰) کے پیٹے میں ہیں۔اور پچھلے ساٹھ برسوں سے ملک کے مشاعروں میں حصہ لے رہے ہیں۔ یہ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ جتنے مشاعرے اُنہوں نے پڑھے ہیں، اتنی تو کتابیں بھی ہم نے نہ پڑھی ہونگیں۔ اپنی عمر، تجربہ اور علم کے اعتبار سے اُن کا شمار ہمارے بزرگوں میں ہوتا ہے اور وہ ہمارے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔لیکن کبھی کبھی حالات ایسے پیدا ہوجاتے ہیں کہ بزرگوں سے اختلاف کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔سر ظفر اللہ خاں نے ایک بار پطرس بخاری سے پوچھا''بتایئے کہ طنبورے اور تان پورے میں کیا فرق ہوتا ہے؟''اس پر پطرس بخاری نے سر ظفر اللہ خاں سے پوچھا۔''حضور! یہ بتایئے کہ اب آپ کی عمر کیا ہے؟''سر ظفر اللہ خاں بولے''پچھتر (۷۵) برس کا ہو چکا ہوں۔'' یہ سن کر پطرس بخاری نے نہایت اطمینان

سے کہا'' حضور! جب آپ نے اپنی زندگی کے پچھتر برس طنبورے اور تان پورے کا فرق جانے بغیر گذار دیئے تو پانچ دس برس اور صبر کر لیجئے۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔'' خمار بارہ بنکوی نے اب جو یہ کہا ہے کہ موجودہ دور کی شاعرات نے مشاعرے اور مُجرے کے فرق کو ختم کر دیا ہے اور یہ کہ مُشاعروں میں شرکت کرنے سے اب اُن کی عمر گھٹنے لگی ہے تو اس سلسلہ میں ہماری دست بستہ عرض یہ ہے کہ وہ ایسی غیر ضروری باتوں پر غور کر کے اپنی عمر کو مزید گھٹنے نہ دیں۔ یہ کیا ضروری ہے کہ وہ اپنی عمر کو بڑھانے کی آس میں مشاعروں میں شرکت کرتے رہیں۔ مانا کہ خمار بارہ بنکوی ہمارے بزرگ ہیں لیکن ہم اُن کے اس بیان سے اتفاق نہیں کرتے کہ آج کی شاعرات نے مشاعرے اور مجرے کے فرق کو ختم کر دیا ہے۔ کیوں کہ ہمارا خیال ہے کہ مشاعرے اور مجرے میں اب بھی ایک واضح فرق موجود ہے۔ وہ اس طرح کہ مجرے میں طوائفیں اس طرح بن سنور کر اور سج دھج کر پیش نہیں ہوتیں جیسی کہ ہماری بعض خاتون شعراء مشاعروں میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔

ماشاءاللہ ہم نے بھی دُنیا دیکھی ہے اور عمر کی اس منزل میں ہیں جہاں ہم اپنی عمر کے ہندسے کاغذ پر لکھتے ہیں تو یہ ہندسے تک ایک دوسرے سے منہ موڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہماری عمر اب خدا کے فضل سے ۶۲ برس کی ہو چکی ہے اور ذرا ملاحظہ فرمائیں کہ ۲ اور ۶ کے ہندسوں میں کیسی ان بن پیدا ہو چکی ہے کہ ایک کا منہ مغرب کی طرف ہے تو دوسرے کا مشرق کی طرف۔ عمر کی یہ وہ منزل ہوتی ہے جہاں آدمی نہ صرف اپنے گناہوں کی معافی مانگنے لگتا ہے بلکہ اپنے گناہوں کا اعتراف بھی کر لیتا ہے۔ خمار صاحب نے ہو سکتا ہے صرف مشاعروں میں شرکت کی ہو لیکن ہم نے اپنی زندگی میں (جو خمار صاحب کی عمر کے لحاظ سے مختصر ہی کہلائے گی) مشاعروں اور مجروں دونوں میں شرکت کی ہے بلکہ ایک مجرے والی کے گھر پر مشاعروں کی صدارت بھی کی ہے۔ جوانی میں آدمی کیا نہیں کرتا۔ یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں کہ اس مجرے والی کے ہاں، جو ادب کا بہت اچھا ذوق رکھتی تھی، مشاعرہ رات میں دس بجے مقرر ہوتا تھا تو ہم آٹھ بجے ہی مشاعرہ کی صدارت کرنے کے لئے پہنچ جاتے تھے۔ مشاعرہ تو رات میں بارہ بجے برخواست ہو جاتا تھا لیکن ہماری صدارت بسا

اوقات رات میں دو بجے تک جاری رہتی تھی۔ سامعین کے لئے شطرنجیاں بعد میں بچھتی تھیں، پہلے مسند صدارت بچھائی جاتی تھی جو سب سے آخر میں اُٹھائی جاتی تھی۔ آج کے مشہور شاعر اور ہمارے دوست صلاح الدین نیر بھی اُن مشاعروں میں بڑی پابندی سے شرکت کیا کرتے تھے۔ یقین نہ آئے تو اُن سے پوچھ لیں۔ خدا جھوٹ نہ بلوائے اُن مشاعروں میں بھی ہم نے ہمیشہ شعر ہی سنے۔ کبھی مجرا نہیں دیکھا۔ جب کہ آج کے مشاعروں میں ہم بعض خاتون شعراء کی عنایت سے مشاعرہ کم سنتے ہیں اور مجرا زیادہ دیکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ہم نے مجرے والیوں کو بھی اتنا بے باک (بلکہ بے باق) بے حیا، بے شرم مگر ساتھ ہی ساتھ ایسا بے پناہ نہیں پایا جیسا کہ مشاعروں میں ہماری بعض شاعرات نظر آتی ہیں۔ خدا کی قسم مجرے والیاں تو بے حد شریف، پاکباز اور حیادار ہوتی ہیں۔ ان بے چاری شریف بیبیوں کو تو اپنے گانے بجانے سے مطلب ہوتا ہے۔ جب کہ ہماری بعض شاعرات کی شاعری میں، شاعری کی اتنی اہمیت نہیں ہوتی جتنی کہ ''ماورائے شاعری'' کی ہوتی ہے۔ ان کا سارا دارومدار ''ماورائے شاعری'' پر ہی ہوتا ہے۔ ہمارے ایک ندیدے دوست ہیں جنہوں نے پانچ چھ برس پہلے ایک مشاعرہ میں ایسی ہی کسی ''ماورائے شاعری شاعرہ'' کو سننے کے بعد اپنی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہم سے کہا تھا ''بخدا کیا شعر کہتی ہے کہ بس دیکھتے رہ جایئے'' ہم نے کہا ''مگر شعر کا تعلق دیکھنے سے نہیں سننے سے ہوتا ہے۔'' بولے ''مگر اس شاعرہ کا یہی تو کمال ہے کہ اس کے شعر سننے کے نہیں دیکھنے کے ہوتے ہیں۔ بالکل ہاتھی کے دانتوں والا معاملہ ہے۔ بہرہ آدمی بھی اس کے کلام کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ شاعری ہو تو ایسی۔ بعضے شعر تو ایسے نکالتی ہے کہ بلا مبالغہ اُن شعروں سے لپٹ جانے اور اُنہیں اپنی بانہوں میں سمیٹ لینے کو جی چاہے۔ اُردو میں آج تک کسی نے ایسے شعر نہیں کہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس کے شعروں سے کما حقہ لطف اندوز ہونے کے لئے آنکھوں کا زیادہ سے زیادہ اور کانوں کا کم سے کم استعمال کرنا پڑتا ہے۔ اگر اس کی شاعری کانوں سے سنی جائے تو ہوسکتا ہے کہ بعض مصرعے بحر سے خارج نظر آئیں۔ وزن بھی کہیں کہیں گر رہا ہو۔ لیکن اگر آپ اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھیں تو واللہ وہ سراپا پابند بحر نظر آتی ہے۔ وزن میں ایسی جکڑی ہوئی اور تنی ہوئی کہ دیکھنے

والے کا وزن گر گر جائے اور سنبھالے نہ سنبھلے۔ وہ ترنم سے کلام نہیں سناتی بلکہ اپنے کلام سے ترنم سناتی ہے۔ صرف وہ ہی نہیں بولتی بلکہ اس کا انگ انگ بولتا ہے۔ شعر اس کے سالم بدن میں مچلنے، تھرکنے، ٹھمکنے اور ہمکنے لگتا ہے اور شعر کا مطلب اس کے پورے سیاق و سباق کے ساتھ اس کی خمار آلود آنکھوں میں یوں جھلکنے لگتا ہے کہ دیکھنے والا آنکھ مارے بنا نہ رہ سکے۔ ہائے ہائے ظالم شعر سناتی ہے تو لگتا ہے خود سراپا غزل بن گئی ہے۔''

الغرض ہمارے ندیدے دوست نے اس مشاعرہ کے بارے میں اور بھی بہت سی باتیں کہی تھیں۔ لیکن ہم اُنہیں یہاں مزید اس لئے بیان نہیں کریں گے کہ اُنہیں لکھنے ہی بیٹھے ہیں تو خود ہماری طبیعت کے مچلنے اور بہکنے کے آثار پیدا ہونے لگے ہیں۔ اس لئے اپنے ندیدے دوست کے بیان کو یہاں ختم کرتے ہیں۔

ابھی پچھلے مہینہ ہمارے دوست اور اُردو کے بہی خواہ پروفیسر ستیہ پال آنند نے ہمیں امریکہ سے خط لکھا تھا، جس میں ایک مشاعرہ کی روداد بیان کی گئی تھی۔ اُنہوں نے بتایا تھا کہ امریکہ کے ایک مشاعرہ میں ایسی ہی ایک شاعرہ جب کلام سنانے لگی تو ایک سامع کو جو حاضرین میں بیٹھا ہوا تھا، اس کا کوئی شعر اتنا پسند آیا کہ اس نے اظہار پسندیدگی کے طور پر محفل میں بیٹھے بیٹھے شاعرہ کو دور ہی سے دس ڈالر کا کرنسی نوٹ دکھایا۔ اس پر شاعرہ ڈائس سے اُتر کر خراماں خراماں دس ڈالر کے کرنسی نوٹ کے پاس گئی۔ اسے حاصل کیا اور کرنسی نوٹ کو سینہ کے عین اُوپر اور بلاؤز کے اندر رکھتے ہوئے پھر سے وہی شعر سنانا شروع کردیا۔ ذرا غور کیجئے کہ سامع نے ''مکرر ارشاد'' کا کیا خوبصورت نعم البدل دریافت کیا ہے۔ سچ ہے امریکی ڈالر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔

ہمیں اس وقت اپنی جوانی کے دنوں کے ایک صحافی دوست یاد آگئے جو ان دِنوں سعودی عرب میں نہایت کامیاب اور شریفانہ زندگی گذار رہے ہیں۔ بالکل اسمِ بامسمّٰی بن گئے ہیں۔ جوانی کے دِنوں میں اُنہیں ہمیشہ کوئی نہ کوئی نئی بات سوجھتی تھی۔ آج سے تیس پینتیس برس پہلے اُنہوں نے حیدرآباد کے رویندرا بھارتی تھیٹر میں ایک ایسا مشاعرہ منعقد کیا تھا جس میں صرف خاتون شعراء نے شرکت کی تھی اور جس میں اُن کے کہنے کے مطابق ملک بھر کی ممتاز خاتون شعراء شریک ہوئی تھیں۔ ہمیں اب بھی ان

خاتون شعراء کے کچھ نام یاد ہیں جیسے ناز کانپوری، پونم کلکتوی، سلطانہ بارہ بنکوی، زیبا مرادآبادی، نجمہ ناگپوری، چترا بھوپالی وغیرہ وغیرہ۔ مشاعرہ سے پہلے اخباروں میں بطور تشہیران شاعرات کی جان لیوا تصویریں (جن کے تراشے پچھلے سال تک ہمارے پاس محفوظ تھے) کچھ ایسے اہتمام سے شائع ہوئیں کہ کئی ثقہ اور سنجیدہ حضرات نے بھی اس مشاعرہ میں شرکت کو ضروری سمجھا۔ ایسے حضرات میں ہم بھی شامل تھے۔ مشاعرہ کچھ اتنا کامیاب رہا کہ رویندرا بھارتی کی چھتوں کا اُڑنا باقی رہ گیا تھا (چھتیں اس لئے بھی نہیں اُڑیں کہ ان دنوں یہ تھیٹر نیا نیا بنا تھا اور مضبوط بھی تھا) مشاعرہ کے بعد ہم کسی وجہ سے کچھ دیر رُک گئے اور جب باہر نکلے تو دیکھا کہ مشاعرہ گاہ کے باہر زیبا مرادآبادی، نجمہ ناگپوری اور پونم کلکتوی ایک رکشا والے سے حیدرآباد کے ایک مخصوص محلّہ تک چلنے کے لئے کرایہ کے مسئلہ پر تکرار کر رہی ہیں۔ سچ پوچھئے تو اس مشاعرہ میں بھی ہمیں مشاعرہ کا ہی لطف آیا تھا، مُجرے کا نہیں۔ تیس پینتیس برس میں ہمارے ہاں مشاعرہ کی روایت اس مقام پر پہنچ گئی ہے جہاں مُجرہ پیچھے رہ گیا ہے اور مشاعرہ آگے کو نکل گیا ہے۔ اس لئے کہ مجرے کے کچھ آداب ہوتے ہیں جن کا اب تک بھی پاس ولحاظ رکھا جاتا ہے۔ لیکن مشاعرہ کے آداب جو کبھی ہوا کرتے تھے، اب باقی نہیں رہے۔

حضرت خمار بارہ بنکوی سے ہمیں دلی ہمدردی ہے کہ ایسے مشاعروں میں جا کر اُن کی عمر بڑھنے کے بجائے کم ہونے لگی ہے۔ ہم تو خیر کبھی بھی کسی مشاعرہ میں یہ سوچ کر نہیں گئے کہ یہاں جانے سے ہماری عمر بڑھے گی۔ اگر مشاعروں میں جانے سے عمر بڑھ سکتی تو علم طب نے آج اتنی ترقی نہ کی ہوتی۔ ہر کوئی اسپتال جانے کے بجائے مشاعرہ میں بھرتی ہو جاتا۔ ہم تو خیر خود بھی شاعر نہیں ہیں اور نہ ہی شاعری سے کوئی دلچسپی رکھتے ہیں۔ بس کبھی کبھار بعض مخصوص شاعرات کو دیکھنے کے لئے مشاعروں میں چلے جاتے ہیں۔ ہمیں نہیں پتہ کہ اس سے ہماری عمر بڑھتی ہے یا گھٹتی ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں، کہ ہم اُپنے آپ کو پھر سے جوان محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اب بھلا بتایئے اس عمر میں یہ ایک تبسم بھی کسے ملتا ہے۔

(آخرکار۔ ۱۹۹۷)

معذرت نامہ

قارئین کرام! ہم یہ معذرت نامہ نہایت ادب کے ساتھ اپنے اُس کالم کے سلسلہ میں لکھ رہے ہیں جو ابھی تین ہفتے پہلے "مشاعرے اور مجرے کا فرق" کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا۔ معذرت اس بات پر کہ ہم نے بعض مخصوص شاعرات کو راہِ راست پر لانے کے نیک ارادے سے انجانے میں خواہ مخواہ ہی بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا ہے۔ حضرت خمار بارہ بنکوی نے اس معاملہ میں ہاتھ ڈالا تھا تو یہ کام اُن کے دستِ مبارک کو زیب دیتا ہے کیوں کہ وہ آئے دن مشاعروں میں جاتے رہتے ہیں۔ ہمیں اس سے کیا لینا دینا ہے۔ آپ تو جانتے ہیں کہ ہم ایک نیک، پاکباز اور شریف آدمی ہیں۔ اپنی پاکیٔ داماں کی حکایت اپنے ہی منہ سے کیا بیان کریں۔ دنیا جانتی ہے کہ ہم گفتار کے ہی نہیں کردار کے بھی غازی ہیں۔ چہار دانگ عالم میں ہماری پاکبازی کے ڈنکے بجتے ہیں اور جہاں نہیں بجتے وہاں ہم خود بجا دیتے ہیں۔ اس پر بھی ایک شاعرہ نے اس کالم کو پڑھ کر ہمیں لکھا ہے کہ "آپ ہمیں راہِ راست پر لانے سے پہلے خود کو راہِ راست پر لے آئیں تو اچھا ہے تا کہ دُنیا سے ایک اوباش تو دور ہو۔" توبہ توبہ ہم پر یہ کیسی بہتان تراشی ہو رہی ہے۔ خدارا آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم مذکورہ بالا شاعرہ کے اس جملہ سے مشتعل ہو کر معذرت نامہ لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔ بخدا ہم نے آج تک کبھی ایسی چھوٹی موٹی باتوں پر اظہارِ معذرت نہیں کیا اور نہ ہی ایسی جلی کٹی باتوں سے کبھی ہمارے دِل میں اپنی اصلاح

کرنے کا خیال آیا۔ اِس معذرت نامہ کو لکھنے کا اصل پس منظر یہ ہے کہ ہمیں کل ہی ایک اور شاعرہ کا خوشبوؤں میں بسا ہوا ایک خط ملا ہے (خط کا لفظ تو ہم نے مُروّت میں لکھ دیا ورنہ ایسے خطوں کو کچھ اور ہی نام سے یاد کیا جاتا ہے)۔ اب آپ سے کیا چھپانا کہ یہ وہی شاعرہ ہیں جن کی سننے والی نہیں بلکہ دیکھنے والی شاعری کو سامنے رکھ کر ہی ہم نے مذکورہ بالا کالم لکھا تھا۔ وہی اس کالم کی جان تھیں۔ وہی اس کی محرک تھیں اور وہی اس کی مخاطب بھی۔ کالم کو لکھتے وقت جہاں جہاں ہمارا قلم بہکا ہے (اگر واقعی بہکا ہے تو) وہ اُن ہی کے ذکر اور تصور سے بہکا ہے۔ سچ تو یہ ہے ہم دِل ہی دِل میں اُن سے خوفزدہ تھے اور طے کر لیا تھا کہ جس کسی مشاعرہ میں بھی یہ ''اپنا کلام بلوغت نظام'' دکھانے کے لئے آئیں گی وہاں ہم اُن کے متوقع قہر کے ڈر سے نہیں جائیں گے۔ حسنِ بلاخیز کی جلوہ سامانیوں اور عشوہ طرازیوں کے آگے جب بڑے بڑے پانی پانی ہو جاتے ہیں تو ہم کس کھیت کی گوبھی ہیں۔ خیر جب اُن کا مذکورہ بالا خط ہمارے غریب خانہ کو زینت بخشنے کے لئے آیا تو دیوان خانہ میں ہماری اہلیہ بھی موجود تھیں جو اس وقت گھریلو اخراجات جیسے غیر شاعرانہ موضوع پر ہم سے بحث کرنے کی آڑ میں لڑنے پر اُتر آئی تھیں۔ ایسے میں ڈاکیئے نے جیسے ہی گھر میں ڈاک ڈالی گھر کا گھر معطر ہو گیا۔ خوشبو کے اس اچانک جھونکے سے گھبرا کر ہم نے اپنی بیوی سے کہا بھی کہ شاید باتھ روم کا دروازہ کھلا رہ گیا ہے اسے ذرا بند کر دیں۔ بولیں ''مجھے بے وقوف نہ بناؤ۔ یہ خوشبو اس ڈاک میں سے آ رہی ہے جو ابھی ڈاکیہ ڈال گیا ہے۔'' بادل نخواستہ خوشبو کے سرچشمے یعنی لفافہ کو کھولا تو اس میں سے پہلے تو آسمانی رنگ کا ایک تہہ بہ تہہ کاغذ برآمد ہوا۔ اس کی پہلی تہہ کھولی تو اس میں سے گلاب کے ایک مرحوم پھول کی پتیاں گریں۔ دوسری اور تیسری تہیں کھولیں تو اُن میں سے بھی کچھ نہ کچھ گرا (ہم تفصیل نہیں بتائیں گے۔ ویسے یہ چیزیں آپ کے لئے تھیں بھی نہیں۔ آپ جان کر کیا کریں گے یہاں تک کہ اس خط کی عبارت اور خاص طور پر ہمارے لئے جو القاب استعمال کئے گئے ہیں وہ بھی صیغہ راز میں ہی رہیں گے۔ کیوں کہ یہ القاب بھی جان نثار اختر کے شعروں کی طرح ہیں۔)

ع کچھ شعر فقط اُن کو سنانے کے لئے ہیں

تاہم موصوفہ کے اس خط کے بعض قابلِ اشاعت اور بے ضرر سے حصے ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔

''آپ کا کالم پڑھا۔ بے حد پسند آیا۔ آپ نے ان نام نہاد خاتون شعراء کو، جنہوں نے مشاعرہ کو مُجرے میں تبدیل کر دیا ہے، بے نقاب کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں آپ کی اس کوشش میں قدم قدم پر آپ کے ساتھ رہوں گی۔ آیئے ہم دونوں مل کر مشاعرہ کو مجرے میں تبدیل ہونے سے بچائیں۔ اس معاملہ میں آپ اور میں قدم سے قدم ملا کر چلیں تو کیا نہیں ہو سکتا'' (موصوفہ نے اس پس منظر میں مجروح سلطانپوری کا ایک مصرعہ بھی نقل کیا ہے۔ ع، تیرا ہاتھ ہاتھ میں آ گیا کہ چراغ راہ میں جل گئے) موصوفہ نے خط کے آخر میں یہ مژدہ جانفزا بھی سنایا ہے کہ وہ اگست میں کسی مشاعرے کے سلسلہ میں دہلی آنے والی ہیں۔ ہمیں تاکید کی ہے کہ ہم ان دنوں دہلی میں ہی رہیں۔ اور اس خط کے سلسلہ میں اُن کے آنے تک کسی اور ''ماورائے شاعری شاعرہ'' سے تبادلۂ خیال نہ کریں۔ خط خاصا طویل ہے لیکن اس کے قابلِ اشاعت حصے صرف اتنے ہی تھے جو ہم نے اُوپر نقل کئے ہیں۔ اگر کوئی صاحب پورا خط پڑھنا چاہیں تو ہم سے تخلیہ میں آ کر ملیں۔ ہمیں اس خط کو دکھانے میں کوئی اعتراض نہ ہوگا کیوں کہ حالات کی مجبوری کے تحت جب اس خط کو ہماری اہلیہ تک نے پڑھ لیا ہے تو اب آپ سے کیا چھپائیں۔

اس خط کی وصولیابی کے بعد اب ہمیں اپنے ایک دوست پر سخت غصہ آ رہا ہے۔ چار پانچ برس پہلے جب ہم نے اس کالم کو لکھنا شروع کیا تھا تو اپنے دوست سے مشورہ طلب کیا تھا کہ ہمارے کالم کے ساتھ اگر ہماری رائج الوقت تصویر بھی شائع کی جائے تو کیسا رہے گا جیسا کہ دیگر اخباروں میں ہوتا ہے۔ ہمارا مقصد یہ تھا کہ کسی کو ہمارے تعلق سے کوئی ''غلط فہمی'' یا ''خوش فہمی'' نہ ہونے پائے۔ ہمارے دوست نے محض یہ سوچ کر ہماری تجویز کو مسترد کر دیا کہ ہم شاید اس طرح اپنی ''شہرت'' میں مزید اضافہ کے خواہشمند ہیں۔ اللہ نے ہمیں بھلے ہی بین الاقوامی شہرت نہ عطا کی ہو لیکن اتنی شہرت تو دے رکھی ہے کہ ہم اپنے محلّہ میں خاصے مشہور و معروف ہیں۔ پنواڑی بھی سلام کرتا ہے۔ دھوبی بھی

ہمیں راستہ میں دیکھ کر احتراماً رک جاتا ہے۔ حجام بھی بڑی محبت سے بال بناتا ہے، راشن والا ڈنڈی تو ضرور مارتا ہے لیکن اتنی نہیں مارتا جتنی دوسروں کے لئے ضروری سمجھتا ہے۔ ہمیں اس سے زیادہ شہرت کی ہوس بھی نہیں ہے۔ خدا گواہ ہے کہ ہم کبھی شہرت کے پیچھے نہیں بھاگے۔ جس عمر میں جس کے پیچھے بھاگنے کی ضرورت پیش آئی ضرور بھاگتے رہے لیکن اس معاملہ میں کبھی شہرت کو زحمت نہیں دی جب کہ ہمارے ہاں بعض شاعر اور ادیب ایسے ہیں جنہوں نے پیدا ہوتے ہی شہرت کے پیچھے جو بھاگنا شروع کیا تو اب ضعیفی کے عالم میں بھی بھاگتے ہی چلے جارہے ہیں۔ دم ہے کہ پھولا جارہا ہے (کاش کہ یہ کبھی خود شاعری کے پیچھے بھی بھاگتے) قطع کلام معاف اگر اولمپک کھیلوں میں ''شہرت'' کے پیچھے بھاگنے کا بھی کوئی عالمی مقابلہ منعقد کیا جائے تو یقین مانئے اس میں جیت کسی اُردو شاعر یا نقاد کی ہی ہوگی۔ مشکل یہ ہے کہ ہمارے بیشتر شاعر اور ادیب اس راز سے واقف نہیں ہیں کہ شہرت جب ایک خاص حد سے تجاوز کر جاتی ہے تو بدنامی کی حدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد شہرت اور بدنامی کا فرق اسی طرح مٹنے لگتا ہے جس طرح آج مشاعرہ اور مجرے کا فرق مٹ گیا ہے۔

خیر اس تمہید کو بیان کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ اگر ہمارے کالم کے ساتھ ہماری تصویر بھی شائع ہوتی تو مذکورہ بالا شاعرہ کو ہمیں اتنے اہتمام کے ساتھ خط لکھنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ مگر اب کیا کریں جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔ ہمیں افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہم نے جس شاعرہ کو نشانہ بنا کر تیر چلایا تھا (یہاں اشارہ طنز کے تیر کی طرف ہے کسی اور تیر کی طرف نہیں) اس کو یہ تیر بہت بھایا ہے۔ بلکہ اب وہ اسی تیر کی مدد سے ہمیں نشانہ بنانا چاہتی ہے۔ انگریزی میں اس کو Boomrang ہونا کہتے ہیں۔ یعنی تیر اُلٹا شکاری کے آلگے۔ مانا کہ ضعف کی وجہ سے ہمارے ہاتھوں میں اب رعشہ آ گیا ہے لیکن ہم نے نشانہ تو ٹھیک ہی لگایا تھا بلکہ ہمارے ایک دانا دوست کا کہنا تو یہ ہے کہ ہمارے طنز کے تیر اس سے پہلے کبھی اس طرح نشانہ پر نہیں بیٹھے تھے جیسا کہ اب بیٹھے ہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہر حال اس شاعرہ کے خط کو پانے کے بعد اب ہمیں افسوس ہو رہا ہے کہ ہم نے وہ کالم لکھا ہی کیوں تھا۔ پشیمانی کا یہی وہ جذبہ ہے جس سے مغلوب ہو کر ہم اس

معذرت نامہ کو لکھنے بیٹھ گئے ہیں۔ صاحبو! مشاعرہ اگر مجرا بن رہا ہے تو ضرور بنا کرے۔ ہم کون ہوتے ہیں بیچ میں بولنے والے۔ یوں بھی ہماری عمر اب ایسی نہیں رہی کہ مشاعرہ کو مجرانہ بننے دیں۔ ان دنوں تو ہم اپنا ''سامانِ آخرت'' اکٹھا کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ گناہوں کا حساب کتاب تو کراماً کاتبین رکھتے ہی ہیں۔ اس معاملہ میں کسی گھپلے کا اندیشہ نہیں ہے۔ البتہ نیکیوں کی گنتی ہمیں کو کرنی پڑ رہی ہے۔ دو چار سے زیادہ اب تک نہیں ملی ہیں بلکہ ہم تو اس کالم کو بھی نیکی کے کھاتہ میں ہی ڈالنے والے تھے۔ ایسے کڑے وقت میں کوئی ہماری توجہ کو بھٹکانے کی کوشش کرے تو یہ اچھی بات نہیں ہے۔ شاعرہ موصوفہ سے ہماری گذارش ہے کہ وہ ہماری تپسیا کو مزید بھنگ نہ کریں۔

آخر میں اطلاعاً یہ عرض کرتے چلیں کہ ہمیں اس کالم کے سلسلہ میں ایک ایسی شاعرہ کا خط بھی وصول ہوا ہے جن کی ہم بیحد عزت کرتے ہیں۔ اُن کی شاعری کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ خود سے شعر کہتی ہیں۔ اچھے شعر کہتی ہیں اور ترنم سے دُور رہتی ہیں۔ گویا مستند اور معتبر شاعرہ ہیں۔ اُنہوں نے تو ہمارے کالم کا مطلب ہی غلط نکالا ہے۔ اُنہوں نے یہ سمجھا ہے کہ ہم مشاعروں میں خاتون شعراء کی شرکت کے سرے سے خلاف ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب پارلیمنٹ تک میں خواتین کے لئے نشستوں کا الگ سے کوٹہ مقرر کرنے کی بات چل رہی ہے تو ہمیں مشاعروں میں شاعرات کی شرکت پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ صرف شاعرات پر اعتراض کرنے سے بات نہیں بنے گی۔ آپ اُن مرد شاعروں پر کیوں اعتراض نہیں کرتے جو طرح طرح کے حُلیے بنا کر مشاعروں میں شرکت کرتے ہیں اور مشاعروں کو مجرا تو کجا ''حجرہ'' تک بنانے پر تُلے ہوئے ہیں۔ آپ روشن خیالی اور مساوات کا ڈنکا تو ضرور پیٹتے ہیں لیکن اندر سے اب بھی آپ عورت پر مرد کی برتری کے قائل ہیں ورنہ خاتون شعراء ہی پر آپ کیوں اعتراض کرتے۔

ع یاروں کو تجھ سے حالی کیا بدگمانیاں ہیں

(آخر کار۔ 1997)

چینی ایش ٹرے کی یاد میں

(نیلوفر اور صنوبر کی نذر)

میرے ڈرائنگ رُوم میں ایک چینی ایش ٹرے گذشتہ پندرہ برسوں سے موجود تھا جو پرسوں ٹوٹ گیا۔ مجھے یہ چینی ایش ٹرے بہت پسند تھا۔ اتنا پسند کہ جیسے ہی سگریٹ جلاتا فوراً اُسے ایش ٹرے کی نالی میں رکھ دیتا تھا اور گھنٹوں سگریٹوں کے بجھنے کے منظر کو دیکھ دیکھ کر لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔ دوست احباب یہاں تک کہا کرتے تھے کہ مجھے سگریٹ کی نہیں ایش ٹرے کی عادت ہوگئی ہے۔ یہ سچ بھی تھا، کیوں کہ جب گھر سے باہر ہوتا تھا تو مجھے اچانک اس ایش ٹرے کی شدّت سے طلب ہوا کرتی تھی اور میں گھر سے باہر جلائے ہوئے کسی سگریٹ کو اس ایش ٹرے میں بُجھانے کی خاطر بھاگا بھاگا گھر آیا کرتا تھا۔ میری اس بے چینی کو دیکھ کر دوستوں نے دو ایک بار سنجیدگی سے مشورہ دیا تھا کہ مجھے فوراً کسی ''سائیکیاٹرسٹ'' کے پاس جانا چاہئے۔ احباب یوں بھی کسی کی مالی حیثیت کا جائزہ لیے بغیر ایسے قیمتی مشورے دینے کے عادی ہوتے ہیں۔

اور ادھر جب سے چین نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا میں اپنے سگریٹ کی آگ کے علاوہ اپنے دِل کی آگ بھی اس ایش ٹرے میں بجھانے لگا تھا۔ مگر جب یہ ٹوٹ گیا تو مجھے یوں لگا جیسے یہ اپنے ساتھ میری پندرہ سالہ سماجی، ادبی، اور تہذیبی زندگی کی یادیں بھی لے کر چلا گیا ہے۔ اسی ایش ٹرے کے اطراف بیٹھ کر میرے دوستوں نے بڑے

بڑے معرکے سر کیے تھے۔ بہت سے ادیبوں کو ادب میں مقام عطا کیا تھا۔ سیاسی گتھیوں کو سلجھانے کی کوشش کی تھی۔ کسی فلسفیانہ مسئلہ پر غور کرتے کرتے اکثر اوقات میرے احباب ایش ٹرے کو سگریٹوں سے بھر دیتے تھے اور جوں جوں ایش ٹرے سگریٹوں سے بھرتا جاتا تھا میرے دوستوں کے ذہن خالی ہوتے جاتے تھے۔ میرے دوستوں اور ایش ٹرے میں یہی تو ایک فرق تھا۔ جب ایش ٹرے لبالب بھر جاتا تو میں بحث کے ''حاصل'' کو کوڑے میں پھینک آتا تھا اور نئے سرے سے ہم لوگ کسی مسئلہ کو پھر سے اُٹھا لیتے تھے۔ یوں بھی دورِ جدید کے بہت سے مسائل کا بوجھ صرف ایش ٹرے ہی اُٹھائے پھرتا ہے۔ جب احباب چلے جاتے اور میں ڈرائنگ رُوم میں اکیلا رہ جاتا تو میں ایش ٹرے میں جھانک کر یہ دیکھ لیتا تھا کہ ہم نے آج کتنی بحث کی ہے اور ابھی کتنی بحث ہونی باقی ہے۔ کبھی میرے احباب جلدی رُخصت ہونے کی کوشش کرتے تو میں اُنہیں یہ کہہ کر روک لیتا کہ بھائیو، ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ ابھی تو ہم نے صرف آدھے ایش ٹرے کی حد تک بحث کی ہے۔ ایک نشست میں کم از کم 'یون ایش ٹرے' کی بحث تو ہونی ہی چاہئے، ورنہ بحث کا فائدہ ہی کیا ہوا؟

میرے دوست نئے سرے سے اپنے اپنے سگریٹ جلا لیتے اور ''بحث پیما'' میں جھانک جھانک کر یہ دیکھتے رہتے کہ ہماری بحث کہاں تک پہنچی ہے۔ جب ہم 'ایش ٹرے بھر' بحث کر لیتے تو میرے دوست رُخصت ہونے لگتے کیوں کہ اس وقت ایش ٹرے میں بحث کی کوئی گنجائش ہی باقی نہ رہتی۔ جب یہ چلے جاتے تو میں رواج کے مطابق ساری بحث کو ''سم اَپ'' کرنے میں لگ جاتا۔ میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ ایش ٹرے میں سے سگریٹوں کے ٹکڑوں کو نکالنے لگتا۔ یہ سُریندر کا سگریٹ ہے، یہ کیلاش کا سگریٹ، یہ ایاز کا سگریٹ، وہ محمود کا سگریٹ، یہ پروفیسر بھٹا چاریہ کا سگریٹ اور وہ میرا سگریٹ ہے۔ پھر ساری بحث آنکھوں میں گھومنے لگ جاتی۔ میں سگریٹ کے ایک ایک ٹکڑے کو خانوں میں بانٹنے لگتا۔ مثلاً یہ جو اَدھ جلا سگریٹ ہے، پروفیسر بھٹا چاریہ کا سگریٹ ہے جسے اُنہوں نے اس وقت بجھایا تھا جب ہم لوگوں نے 'وجودیت' کے مسئلہ پر اُن کی رائے سے یکسر اختلاف کیا تھا۔ پروفیسر بھٹا چاریہ اچانک آپے سے باہر ہو گئے تھے اور

ہمارے خلاف کچھ نہ بن پڑا تو فوراً اپنا اَدھ جلا سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ یہ سگریٹ اب ایش ٹرے میں پڑا پروفیسر بھٹاچاریہ کی ''قوتِ برداشت'' کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کررہا ہے۔ یوں بھی ہم لوگوں میں جہاں ضبط کی حد ختم ہوجاتی ہے، وہاں سے ایش ٹرے کی حد شروع ہوتی ہے۔ میں بڑی دیر تک پروفیسر بھٹاچاریہ کے اَدھ جلے سگریٹ کو دیکھ دیکھ کر مسکراتا رہتا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے پروفیسر بھٹاچاریہ میرے ڈرائنگ رُوم سے چلے نہیں گئے ہیں بلکہ سگریٹ کے اس ٹکڑے کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گئے ہیں اور اپنی ''وجودیت'' کو ٹٹول رہے ہیں۔ اور یہ محمود کا سگریٹ ہے۔ اس سگریٹ کو میں اس لیے پہچانتا ہوں کہ محمود نے اُسے مجھ سے ہی مانگ کر پیا تھا ___ اور یہ سریندر کا سگریٹ ہے۔ اسے اُس نے اُس وقت بجھایا تھا، جب ہمیں اس کی نظم میں کوئی مفہوم نظر نہیں آیا تھا۔ سریندر نے ہماری رائے جان کر اس سگریٹ کو کچھ ایسے اسٹائل سے بجھایا تھا جیسے اس سگریٹ کے بجھنے سے اس کی نظم میں مفہوم کی روشنی چمک اُٹھے گی۔ جب اس کے بعد بھی ہماری سمجھ میں کچھ نہ آیا تو اس نے ایک اور سگریٹ جلالیا اور نئی نظم سنانی شروع کردی۔ اب سُریندر کے سارے سگریٹ ابہام کی راکھ کے ڈھیر میں چپ چاپ پڑے ہیں اور اُن کے برابر ہمارے وہ سگریٹ بھی پڑے ہیں جنہیں سریندر کی نظموں کو سمجھنے کی جستجو میں ہم نے جلایا تھا۔ یہ سارے بے نام سگریٹ جو ادب اور ثقافت کا کوئی حصہ نہ بن سکے، اب یوں ہی ایش ٹرے میں پڑے ہیں۔

اُنہیں دیکھئے یہ ایاز کے سگریٹ ہیں۔ اس نے بحث کے دوران میں اپنے سارے سگریٹ عربوں کے نام معنون کئے تھے اور عربوں کی حمایت میں اسرائیلیوں کے خلاف دھواں دھار بحث کی تھی۔ اب اس کے سگریٹ ایش ٹرے میں یوں پڑے ہیں جیسے جنگ کے بعد میدانِ جنگ میں خالی کارتوس پڑے رہتے ہیں۔ میں ایاز کے دھواں دھواں چہرہ کو بڑی دیر تک یاد کرتا رہ جاتا ہوں۔

میں جب ساری بحث کو ''سم اپ'' کرلیتا ہوں تو سگریٹوں کو تقسیم کرنے لگ جاتا ہوں۔ ادب کی بحث کے سگریٹ الگ کرتا ہوں، فلسفہ کے سگریٹوں کو الگ جوڑتا ہوں، ثقافت کے سگریٹوں کو الگ رکھتا ہوں اور سیاست کے سگریٹوں کو دوسرے

سگریٹوں سے جُدا کرتا ہوں۔ پھر میں ہر ایک پر نظر ڈال کر جائزہ لیتا ہوں کہ ہماری بحث کا غالب رجحان کیا ہوتا ہے۔ اور جب اس جائزہ سے فارغ ہوتا ہوں تو میں فلسفہ، ثقافت، ادب اور آرٹ کے ان سگریٹوں کو دوبارہ یکجا کر کے کوڑے میں پھینکنے چلا جاتا ہوں کیوں کہ ہمارے معاشرے میں ادب، آرٹ اور فلسفہ کو بالآخر یہیں پھینکا جاتا ہے۔

کبھی کبھی میں ایش ٹرے کی مدد سے ملک کی معاشی صورتِ حال کا جائزہ بھی لے لیتا ہوں۔ محمود کے بجھے ہوئے سگریٹ میں سے اس کی معیشت جھانکنے لگتی۔ یہ بجھے ہوئے اِمپورٹڈ سگریٹ پروفیسر بھٹاچاریہ کے ہیں۔ وہ اپنے سگریٹ اور منطق دونوں ہی بیرونی ممالک سے درآمد کرتے ہیں مگر جب بحث کرتے ہیں تو ملک کو ''خود کفیل'' بنانے کے موضوع پر گھنٹوں بول سکتے ہیں۔ اس ایش ٹرے میں بعض اوقات میرے کلرک دوست خالد کی بیڑی بھی چلی آتی تھی۔ ہمہ اقسام کے سگریٹوں کے بیچ جب خالد کی بیڑی اچانک نکل آتی تھی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ہمارے ملک سے غربت اتنی آسانی سے نہیں ہٹے گی۔ پہلے خالد کی بیڑی کو ایش ٹرے سے ہٹایا جائے تو تب کوئی بات بھی بنے۔ میرے اس چینی ایش ٹرے کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ میں اس میں جھانک کر ملک کی سماجی، ثقافتی اور معاشی صورتِ حال کو بہ آسانی دیکھ لیتا تھا۔ گویا ایش ٹرے نہ ہوا جامِ جم ہوا۔

بہرحال اس ایش ٹرے کے ٹوٹنے کا مجھے بڑا دُکھ ہوا۔ بالآخر مجھے ایک اور ایش ٹرے بازار سے لانا پڑا۔ پتہ نہیں آپ کے گھر میں ایش ٹرے ہے یا نہیں؟۔ میں ایش ٹرے کے بغیر گھر کو اسی طرح نامکمل سمجھتا ہوں جیسے مقطع کے بغیر غزل۔ میرے ایک دوست خود تو سگریٹ نہیں پیتے لیکن اس کے باوجود انہیں ''ایش ٹرے'' پالنے کا بے حد شوق ہے۔ ایش ٹرے پالنے کی بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ اُن کے گھر میں پالتو جانوروں کی وضع پر بنے ہوئے ''ایش ٹریز'' کی بھرمار ہے۔ ایک طرف اونٹ کا ایش ٹرے ہے تو دوسری طرف بلّی کا ایش ٹرے۔ اِدھر مرغ کا ایش ٹرے کھڑا بانگ دے رہا ہے تو اُدھر بطخ کا ایش ٹرے رکھا ہوا ہے۔ کہیں مور کا ایش ٹرے ناچ رہا ہے تو کہیں ہرن کا ایش ٹرے کلیلیں بھر رہا ہے۔ آپ یقین کریں کہ یہ سارے ایش ٹرے اتنے نفیس ہیں کہ

اُن میں سگریٹ بجھانا تو کجا اُنہیں ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ جب بھی اُن کے گھر جاتا تو میں اس ڈر سے کہ کہیں سگریٹ کی راکھ کسی ایش ٹرے میں جھاڑنی نہ پڑ جائے، سگریٹ ہی نہیں جلاتا تھا۔ ایسے ایش ٹرے آدمی سے سگریٹ کی عادت کو ترک کروانے میں بڑے معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ میرے دوست نے ایک دن پوچھا کہ میں اُن کے گھر آ کر سگریٹ کیوں نہیں پیتا جب کہ گھر میں اتنے سارے ایش ٹریز رکھے ہیں۔ میں نے ان کے ایش ٹریز کے بارے میں اپنے احساسات سے اُنہیں واقف کرایا تو بولے ''تم ان ایش ٹریز سے بالکل نہ گھبراؤ، یہ تمہیں بالکل نقصان نہیں پہنچائیں گے، بڑے وفادار اور سدھے ہوئے ایش ٹرے ہیں۔'' میں اُن کی باتوں میں آ گیا اور اُن کے گھر میں بھی سگریٹ پینے لگا۔ مگر میں تب بھی خوف محسوس کرتا رہا کیوں کہ کبھی کبھی یہ ''جانوروں والے ایش ٹرے'' مجھے زندہ اور متحرک نظر آنے لگتے۔ جس گھر میں اتنے سارے حیوانی ایش ٹرے رکھے ہوں وہاں آدمی کو اصولاً خوفزدہ ہی ہونا چاہئے۔ ایک دن میرے دوست گھر میں موجود نہیں تھے۔ اُن کے نوکر نے مجھے ڈرائنگ رُوم میں بٹھایا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ صاحب تھوڑی دیر میں آئیں گے، آپ انتظار کیجئے۔ میری کمزوری یہ ہے کہ میں سگریٹ کے بغیر کسی کا انتظار نہیں کر سکتا۔ لہٰذا میں نے سگریٹ جلایا اور اُن کے مختلف ایش ٹریز میں اُس کی راکھ بار بار جھاڑتا رہا اور ایش ٹریز کو مختلف زاویوں سے بغور دیکھتا رہا۔ جب سگریٹ جل کر آخری حد پر پہنچ گیا تو میں نے سوچا اسے کسی اچھے سے ایش ٹرے میں بجھانا چاہیے۔ اسی اثنا میں میری نظر بلّی والے ایش ٹرے پر پڑی جو صوفے کے برابر نیچے رکھا ہوا تھا۔ میں اس حسین اور نفیس ایش ٹرے کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ کیوں کہ یہ سچ مچ زندہ بلّی کی طرح نظر آ رہا تھا، ایسی بلّی جو خوب سارے چوہے کھانے کے بعد اپنی گردن نیوڑھا کر سو رہی ہو۔ میں نے اچانک اپنا سگریٹ بلّی کے ایش ٹرے میں دبا دیا اور اسے حسبِ عادت زور سے مسلنے ہی والا تھا کہ ایش ٹرے میں سے دفعتاً زور کی ایک چیخ برآمد ہوئی۔ پھر ایش ٹرے نے اپنا پنجہ میرے ہاتھ پر زور سے مارا اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایش ٹرے جست لگا کر ڈرائنگ روم سے بھاگ گیا۔ اسی اثنا میں میرے یہ دوست ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ میرے ہاتھ سے خون نکلتا دیکھ کر اُنہوں

نے پوچھا، یہ کیا ہوا؟۔ میں نے کپکپاتے بدن، لرزتے ہونٹوں اور لڑکھڑاتی زبان سے کہا ''تمہارے بلی والے ایش ٹرے نے پنجہ مارا ہے۔ میں اسی لئے تمہارے گھر کے ''ایش ٹریز'' میں سگریٹ نہیں بجھاتا تھا۔ کیا پتہ کہ کس دن کسی ایش ٹرے میں جان پڑ جائے۔ اب خود ہی دیکھ لو کہ میرا کیا حشر ہوا ہے۔'' میرے دوست لاکھ سمجھاتے رہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ میرے گھر میں بلّی تو ہے مگر بلّی کا ایش ٹرے ہرگز نہیں ہے۔ اب میں اُنہیں کیسے سمجھاتا کہ اُن کا ایک ایش ٹرے ابھی تھوڑی دیر پہلے زندہ ہو گیا تھا۔

میری بات تو چھوڑیئے۔ ان کے کمسن بچے بھی ان حیوانی ایش ٹریز سے دھوکہ کھا جاتے ہیں۔ ایک دن میں اُن کے کم سن بچے کو چڑیا گھر کی سیر کرانے لے گیا۔ شیر کے پنجرے کے سامنے سے جب ہم گزرے تو اس نے پنجرے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''انکل، انکل! دیکھو پنجرے میں کتنا بڑا ایش ٹرے ٹہل رہا ہے۔'' پھر ریچھ کے پنجرے کی طرف اشارہ کر کے کہا ''انکل! یہاں بھی ایک ایش ٹرے موجود ہے'' میں نے انواع و اقسام کے جانور اسے دکھائے مگر گھر جا کر اُس نے یہی کہا کہ وہ ''چڑیا گھر'' میں صرف ایش ٹرے دیکھ کر آرہا ہے۔

بعض لوگ اتنے نفیس ایش ٹرے اپنے گھر میں رکھتے ہیں کہ اُن میں سگریٹ بجھانے کو نہیں بلکہ اُن میں آئس کریم ڈال کر کھانے کو جی چاہتا ہے۔ ایسا ایش ٹرے کبھی میرے سامنے موجود ہو تو میں حتی الامکان اس میں راکھ جھاڑنے سے گریز کرتا ہوں اور سگریٹ کی راکھ قیمتی قالینوں اور صوفوں پر جھاڑنے کو ترجیح دیتا ہوں۔ ایسے ایش ٹریز آپ کو بڑے بڑے ہوٹلوں میں بھی نظر آجاتے ہیں۔ اسی لیے اکثر گاہک چائے کی پیالیوں میں تو مسلسل راکھ جھاڑتے رہتے ہیں مگر ایش ٹریز پر کوئی آنچ نہیں آنے دیتے۔ ایسے ہی ایک ہوٹل کے منیجر نے اپنے گاہکوں کو متنبہ کرنے کے لیے اس قسم کی ہدایت کی تختی ہر میز پر رکھ چھوڑی تھی کہ جو گاہک چائے کی پیالیوں میں سگریٹ کی راکھ جھاڑیں گے اُنہیں ایش ٹریز میں چائے فراہم کی جائے گی۔ گاہکوں کو ہر طرح مطمئن کرنا ہمارا شیوہ ہے۔

میرے ایک خوش مذاق دوست نے اپنے گھر کو ''ایش ٹرے خانہ'' بنا رکھا ہے۔ ہر برانڈ کے سگریٹ کے لیے اُن کے پاس ایک الگ ایش ٹرے ہے۔ ...کار اس ایش

ٹرے میں بجھے گا تو بیڑی اس ایش ٹرے میں بجھے گی۔ امپورٹڈ سگریٹ فلاں ایش ٹرے میں بجھے گا اور دیسی سگریٹ اس ایش ٹرے میں بجھے گا۔ میں جب بھی اُن کے گھر جاتا ہوں تو ''طبقاتی کشمکش'' کو نہ صرف شدت سے محسوس کرتا ہوں بلکہ قائل بھی ہو کر آتا ہوں۔

بعض اوقات آدمی جب حالتِ سفر میں ہوتا ہے یا کسی محفل میں جا کر بیٹھ جاتا ہے تو ضرورتاً ''ہنگامی ایش ٹرے'' بھی ایجاد کر لیتا ہے۔ مثلاً میرے ایک دوست جب بھی کسی ایسی ادبی محفل میں شرکت کے لیے جاتے ہیں، جہاں نشست کا انتظام فرش پر ہوتا ہے، تو وہ اپنے سامنے اپنے جوتے رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ منتظمین کو ابتداء میں اُن کی نیت پر شبہ ہوتا ہے مگر جب وہ اپنا سگریٹ جلا کر جوتوں میں راکھ جھاڑنا شروع کرتے ہیں تو منتظمین کو بڑی طمانیت ہوتی ہے کہ ان جوتوں کا ادبی محفل کی بحث سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر رفتہ رفتہ برابر بیٹھے ہوئے لوگ بھی اُن کے جوتے میں راکھ جھاڑنے لگ جاتے ہیں بلکہ ایک بار تو ہم نے یہاں تک دیکھا تھا کہ اُن کا جوتا خود بخود چلتا ہوا ''مسندِ صدارت'' تک پہنچ گیا تھا اور اس میں لگاتار دو گھنٹوں تک ''صدارت'' کی راکھ جھاڑی جاتی رہی۔ یوں بھی ادبی محفل میں جوتے کو ایش ٹرے بنا کر اسے محفل میں گشت کرانا زیادہ اطمینان بخش کام ہوتا ہے۔ کیوں کہ جوتا ہمیشہ آپ کی نظروں کے سامنے رہتا ہے۔ مالِ عرب پیشِ عرب۔ برخلاف اس کے ہم کچھ اس انداز سے ادبی محفل میں شرکت کرتے ہیں کہ ایک چوتھائی توجہ کی مدد سے محفل کی کارروائی کو سنتے ہیں اور بقیہ تین چوتھائی توجہ اپنے جوتے پر مرکوز رکھتے ہیں کہ جوتا ادب سے زیادہ اہم اور ضروری شئے ہے۔

چاہے کچھ بھی ہو ایش ٹرے بڑے کام کی چیز ہے۔ جب ادیب یا دانشور کسی وزنی اور موٹے تازے ''ایش ٹرے'' کے اطراف بیٹھ کر بحث کرنے لگتے ہیں تو یہ نہ سمجھے کہ یہ ایش ٹرے صرف سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کے کام آتا ہے بلکہ وقتِ ضرورت اس ایش ٹرے کی مدد سے ایک دانشور دوسرے دانشور کی مزاج پُرسی بھی کر سکتا ہے اور مخالف دانشور کو ''بزور ایش ٹرے'' اپنی منطق کا قائل بھی کروا سکتا ہے۔ اس لیے جب بھی کسی

ادبی مسئلہ پر دوستوں سے بحث شروع ہوتی ہے تو میں احتیاطاً سامنے پڑے ہوئے ایش ٹرے کو اپنے ہاتھوں میں لے کر تول لیتا ہوں۔ اس کے وزن اور اس کی ہلاکت خیزی کا اچھی طرح جائزہ لیتا ہوں تاکہ بعد میں پچھتانا نہ پڑ جائے۔

پھر صاحب ایش ٹرے کی سب سے بڑی افادیت یہ ہوتی ہے کہ چھوٹے بچے اُسے جب جی چاہے اُلٹ سکتے ہیں اور سارے گھر کو گل وگلزار بنا سکتے ہیں۔ دورِ جدید کے بچوں کو آپ کتنے ہی اچھے کھلونے دیں، اُن کا جی اس وقت تک نہیں بہلتا جب تک وہ دن میں دو تین بار ایش ٹرے کو اُنڈیل نہیں دیتے۔ پھر لطف کی بات یہ کہ بچے جب ایش ٹریز اُنڈیل دیتے ہیں، تو والدین کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ اپنے بچوں کے بارے میں پڑوسیوں سے فخریہ انداز میں کہیں گے ’’بھئی نیلوفر کی ہوشیاری کے کیا کہنے۔ ابھی تو صرف سوا سال کی ہے مگر دن میں کم از کم تین بار تو ایش ٹرے ضرور اُنڈیل دیتی ہے اور سگریٹ کی راکھ کا پاؤڈر اپنے منہ پر مل لیتی ہے ابھی سے اُسے بناؤ سنگار کا اتنا شوق ہے۔ ایسی ذہین بچّی ہم نے نہیں دیکھی۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں یہ حال ہے تو بڑی ہو کر قیامت بنے گی قیامت۔ اور تو اور صنوبر بی بی کی ذرا ذہانت تو دیکھو کہ ابھی اچھی طرح رینگ بھی نہیں سکتی مگر لڑھک لڑھک کر ایش ٹرے کے پاس ضرور پہنچ جاتی ہیں اور آن کی آن میں اُسے لُڑھکا دیتی ہیں۔ خدا نظرِ بد سے بچائے۔ اتنی سی جان اور اتنی ذہانت۔ یہ تو بس خدا کی دین ہے دین۔ مگر یہ بتاؤ تمہاری منی کا کیا حال ہے؟۔ وہ ایش ٹرے انڈیلتی ہے یا نہیں؟‘‘

اور پڑوسن اپنی منی کی ذہانت کا رشتہ ایش ٹرے سے ملانے بھی نہیں پاتی کہ کمرے میں سے اچانک صنوبر بی بی کی دلدوز چیخ سنائی دیتی ہے، بھاگ کر دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ اُنہوں نے ایش ٹرے کو پچھاڑ دینے کے بعد ایک جلتا ہوا سگریٹ اپنے ننھے منے ہاتھ میں پکڑ رکھا ہے اور بے پناہ ذہانت کا جیتا جاگتا ثبوت فراہم کر رہی ہیں۔

میں نے ابھی جس چینی ایش ٹرے کے ٹوٹنے کا ذکر بڑی حسرت ویاس سے کیا تھا اور جو اپنے ساتھ میری پندرہ سالہ سماجی، ادبی اور ثقافتی زندگی کی یادیں لے کر چلا گیا ہے وہ نیلوفر بی بی کی ذہانت کی وجہ سے ہی ٹوٹا تھا۔ اب میں پیتل کا ایش ٹرے لے آیا

ہوں تا کہ وہ نیلوفر کی بے پناہ ذہانت کی تاب لا سکے۔ میں تو یہ چاہتا تھا کہ اس ایش ٹرے میں سگریٹ کی راکھ بالکل نہ جھاڑوں بلکہ اُسے صنوبر اور نیلوفر کے کھیلنے کے لئے مختص کردوں۔ مگر ذرا نیلوفر کی ذہانت تو دیکھئے کہ وہ جب خالی ایش ٹرے اُنڈیل دیتی ہیں تو ایک لمحہ کے لیے اُن کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ پھیل جاتی ہے مگر جب دوسرے ہی لمحے اُنہیں فرش پر سگریٹوں کے بجھے ہوئے ٹکڑے نظر نہیں آتے تو دہاڑیں مار مار کر رونے لگ جاتی ہیں کہ جس ذہین عمل کا کوئی حاصل نہ ہو، ایسی ذہانت کو لے کر کیا کیجئے گا۔ اُنہیں خوش کرنے کے لیے مجھے مجبوراً ایش ٹرے میں پھر سے سگریٹ کے ٹکڑے ڈالنے پڑتے ہیں اور نیلوفر بی بی کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پھیل جاتی ہے کہ لگتا ہے وہ ایش ٹرے پہ نہیں مجھ پر ہنس رہی ہیں۔

(بہرحال۔ 1974)

برف کی الماری

صبغتہ اللہ پرسوں عین ایسے وقت ہمارے ہاں آدھمکے جب ہماری تین ٹانگوں والی ڈائننگ ٹیبل پر دوپہر کا کھانا چُنا جا چکا تھا۔ ہم پہلا نوالہ منہ میں ڈالنا ہی چاہتے تھے کہ اُنہوں نے ہمارے منہ سے نوالے کو چھینتے ہوئے کہا:

''چالیس برس سے اس دنیا میں لگاتار زندہ ہو لیکن تمہیں مہمان نوازی کے یہ آداب نہ آئے کہ کھانے کے وقت مہمان آئے تو اسے سب سے پہلے کھانا کھلانا چاہئے۔'' پھر ہمارے منہ سے چھینے ہوئے نوالے کو اپنے پیٹ کی گہرائیوں اور گیرائیوں میں پہنچانے کے بعد بولے:

''یہ اس نوالے میں سے بُو کیسی آرہی ہے؟ کیا باسی کھانا کھا رہے ہو؟''

ہم نے تاڑ لیا کہ اب یہ حسبِ معمول کوئی ایسی تجویز پیش کرنے والے ہیں جو ہماری ''نصف بہتر'' کو تو پسند آئے گی لیکن ہماری بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے گی۔ ہم نے پوچھا:

''کیسی بُو اور کیسا باسی کھانا؟''

بولے: ''میں خوب جانتا ہوں کہ تم نے آج تک اپنی ناک اور دماغ کا صحیح استعمال تو کجا غلط استعمال تک نہیں کیا ہے۔ تم کیا جانو کہ دال جب باسی ہونے لگتی ہے تو اس میں کیا کیا کیمیائی تبدیلیاں ہوتی ہیں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ تم فوراً ''برف کی الماری''

خرید لو۔''

''برف کی الماری''! ہم نے حیرت سے پوچھا ''یہ کیا ہوتی ہے؟ میں تو پہلی بار اس کا نام سُن رہا ہوں۔''

بولے ''یار! انگریزی لفظوں کے آسان اُردو ترجمہ کو تمہاری پیچیدہ سمجھ کبھی قبول نہیں کرے گی۔ جب تک اُردو میں عربی اور فارسی کی آمیزش نہ کی جائے تم اسے اُردو ماننے سے انکار کر دیتے ہو۔''

ہم نے کہا ''مگر یہ تو بتاؤ، تمہاری اس برف کی الماری کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟''

بولے۔ ''ریفریجریٹر ــــ جسے تم جیسے نیم انگریزی داں اختصار، احتیاط، اور سہولت کی خاطر ''فریج'' بھی کہہ لیتے ہیں۔''

ہم صبغتہ اللہ کے اس آزاد بلکہ باغیانہ ترجمہ کی داد دینا ہی چاہتے تھے کہ کنی کاٹ گئے اور بولے ''ترجمہ کی داد بعد میں دینا۔ یہ بتاؤ کہ برف کی الماری کب خریدو گے؟ میں تمہیں ریفریجریٹر کے فوائد گِنا سکتا ہوں مگر مشکل یہ ہے کہ میرے ہاتھ میں صرف دس اُنگلیاں ہیں اور ریفریجریٹر کے فوائد اُنگلیوں سے زیادہ ہیں۔ اس صدی کی اگر سب سے اہم کوئی ایجاد ہے تو بس یہی ریفریجریٹر ہے۔ یوں بھی اُنیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں عالمی سطح پر کچھ ایسے حالات پیدا ہو گئے تھے کہ اگر ریفریجریٹر بروقت ایجاد نہ ہوتا تو ہماری تہذیب، ہمارا تمدن، ہماری اقدار، ہمارا معاشرہ سب کچھ سڑ گل جاتے۔ انسانیت پر ریفریجریٹر کا بہت بڑا احسان ہے۔ گھریلو سطح پر ریفریجریٹر کے بے شمار فائدوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ گھر یلو بیبیوں کو ذرا فراغت کے ساتھ باتیں کرنے اور ایک دوسرے کی غیبت کرنے کا موقع مل جاتا ہے۔ تم پوچھو گے وہ کس طرح؟۔ بھائی میرے سلیقہ مند عورت کے قبضہ میں جب ریفریجریٹر آتا ہے تو وہ ''ماس اسکیل'' پر دس بارہ دن کا کھانا بیک وقت تیار کر لیتی ہے اور شوہر کی خدمت کا فریضہ ریفریجریٹر کو سونپ کر کم از کم دس بارہ دن کے لیے مطمئن ہو جاتی ہے۔ سچ پوچھو تو دو ایک معاملوں کو چھوڑ کر ریفریجریٹر بیوی کا صحیح نعم البدل ہے۔ دوسری طرف ریفریجریٹر

عورت کو صحیح معنوں میں عورت بناتا ہے۔ وہی عورت جو آج سے ہزاروں سال پہلے جنگلوں اور غاروں میں مرد کی رفیق تھی جس پر تہذیب وتمدن نے باورچی خانہ کا بوجھ نہیں لادا تھا۔ خالص اور کراری عورت تو تہذیب وتمدن کی دبیز تہوں کے نیچے نہ جانے کب کی دب چکی تھی۔ اب ریفریجریٹر کی مدد سے وہ پھر ان تہوں میں سے اپنا سر نکالنے لگی ہے۔ چلو اُمید کی ایک شمع تو روشن ہوئی ہے۔''

ہم نے کہا'' مگر صبغتہ اللہ تم نے جوشِ عقیدت میں اس اندیشہ کی طرف دھیان نہیں دیا کہ اگر سگھڑ بی بی دس بارہ دن کا ''اجتماعی کھانا'' پکاتے وقت ذرا سی بھی گڑبڑ کردے یعنی مرچ یا نمک زیادہ ڈال دے تو ہم جیسے سگھڑ مردوں کو دس بارہ دِنوں تک کھانے کے نام پر زہر کھانا ہوگا۔''

ہماری بیوی کی طرف دادطلب نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے'' تمہارا اندیشہ دُرست ہے مگر تمہارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم دوسروں کی بیویوں کے اندیشہ کو ضرورت سے زیادہ اور وقت سے پہلے محسوس کرتے ہو۔ تمہیں تو اپنی بیوی سے سروکار رکھنا چاہئے۔''

پھر ہماری بیوی سے رشتہ لگاتے ہوئے بولے:'' بھابی کھانا پکانے کے معاملے میں سائنس دانوں کی سی مہارت اور باریک بینی رکھتی ہیں۔ وہ باورچی خانہ میں نہیں لیبارٹری میں کھانا پکاتی ہیں، پھر تمہیں مرچ اور نمک کی زیادتی کا خیال کیوں پریشان کرنے لگا۔ سچ سچ بتاؤ اس اندیشہ کا اظہار کرتے وقت تمہارے ذہن میں کس کی بیوی تھی اور کس کی بیٹی تھی؟ اس کا محل وقوع بھی بتاؤ تو تمہارا احسان ہوگا۔''

صبغتہ اللہ نے بات کی تان کچھ ایسی جگہ توڑی تھی کہ اب ''برف کی الماری'' کا معاملہ ہمارے ہاتھوں سے نکل کر ہماری بیوی اور صبغتہ اللہ کے غیر محفوظ ہاتھوں میں جا چکا تھا۔

ہماری بیوی جو بڑی دیر سے خاموش تھیں ہمیں یکسر نظر انداز کرکے صبغتہ اللہ سے بولیں'' بھائی صاحب! ان کی باتوں میں نہ آیئے۔ اُن کی تو ساری زندگی ہی میرے خلاف ایسے اوچھے الزامات لگانے میں گزری ہے۔ یہ مجھے خالص عورت کے رُوپ میں

دیکھنا ہی کہاں چاہتے ہیں۔ آپ مجھے فوراً برف کی الماری لا دیجئے''۔

اور پھر اس مباحثہ کے دوسرے دن ہمارے گھر میں ریفریجریٹر کا آسان اُردو ترجمہ آچکا تھا۔ صبغتہ اللہ نے برف کی الماری کا ہینڈل ہمارے ہاتھ میں دیتے ہوئے آنکھ مار کر کہا'' تمہاری نصف بہتر کے اس نصف بہتر کو سنبھال کر رکھنا۔ برف کی یہ الماری صحیح معنوں میں تمہاری خدمت کرے گی۔ خدا تم دونوں کو آباد اور خوش رکھے۔''

جون کی گرمیوں کے دن تھے اور صبغتہ اللہ نے اتنا بڑا ریفریجریٹر ہمارے گھر میں گُھسا دیا تھا کہ یہ ہمیں اپنی استطاعت اور معیشت دونوں کے لئے خطرہ کی علامت نظر آنے لگا۔ اس ڈیڑھ قد آدم ریفریجریٹر کو اپنے 10x10 فیٹ کے کمرے میں رکھا تو یوں لگا جیسے ہم نے اپنے کمرے میں ایک اور کمرہ تعمیر کرلیا ہو۔ پہلا دن تھا اس لیے ہم بچوں کو ریفریجریٹر کی بنیادی تفصیلات سے واقف کراتے رہے۔ پانی کی بوتلیں یہاں رکھی جائیں، سبزیاں یہاں رکھی جائیں، یہ جگہ انڈوں کے لئے ہے وغیرہ وغیرہ۔ افہام وتفہیم کی اس منزل سے گزر کر ہم نے ریفریجریٹر میں بیعانے کے طور پر پانی کی بوتلیں رکھیں اور خود قیلولہ کرنے میں مصروف ہوگئے۔

شام ہوئی تو ہمیں احساس ہوا کہ جب ریفریجریٹر لیا ہے تو اس میں رکھنے کے لیے سامان بھی چاہیے۔ فوراً بازار گئے۔ اور ڈھیر ساری چیزیں خرید کرلے آئے، انڈے سبزیاں، گوشت، مکھن، پنیر، ڈبل روٹیاں اور نہ جانے کیا کیا۔ ساری چیزیں قرینہ سے ریفریجریٹر میں رکھیں اور اطمینان کا لمبا سانس لینا ہی چاہتے تھے کہ بیوی نے ہمارے ہاتھ میں سودے کا تھیلا تھماتے ہوئے کہا'' ذرا جاکے بازار سے سبزیاں تو لے آیئے۔''

ہم نے کہا'' اتنی ڈھیر ساری مہینہ بھر کی سبزیاں تو ریفریجریٹر کے پیٹ میں ابھی ابھی جھونک چکا ہوں۔ اب مزید سبزیاں لانے کی کیا ضرورت ہے؟''

بولیں'' تمہیں اپنی عزت کا مطلق خیال نہیں رہتا۔ جانتے ہو نیا نیا ریفریجریٹر آیا ہے، محلے کی ساری عورتیں بچے، بوڑھے، جوان سبھی اسے دیکھنے آئیں گے۔ آئیں گے تو اسے کھولیں گے بھی۔ اور تم خود سوچو کہ اس وقت اگر ریفریجریٹر خالی ہو تو چار لوگوں میں

تمہاری کیا عزت رہ جائے گی۔ ریفریجریٹر کا سامان ریفریجریٹر میں ہی رہنے دو۔ اسے کوئی ہاتھ نہ لگائے۔ میں یہ نہیں چاہتی کہ اس ریفریجریٹر کے آنے کی وجہ سے محلّہ میں ہماری جو عزت بڑھی ہے وہ ریفریجریٹر سے کم بھی ہو۔"

بیوی کا یہ استدلال سُن کر ہمیں احساس ہوا کہ محترمہ اب واقعی خالص عورت بننے لگی ہیں۔ ہمیں پہلی بار پتہ چلا کہ متوسط طبقہ کا باعزت اور شریف آدمی پہلے ریفریجریٹر کا پیٹ بھرتا ہے اور بعد میں اپنے پیٹ کی طرف توجہ کرتا ہے۔ پھر خُدا کے فضل سے ہمارے ریفریجریٹر کا پیٹ بھی کمپنی نے اتنا بڑا بنایا تھا کہ ہمارے مہینہ بھر کی کمائی اس کے سامنے اُونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر معلوم ہوتی تھی۔

ایک مہینہ تک ہمارا ریفریجریٹر نمائش کے لئے رکھا گیا۔ دور دور سے رشتہ داروں اور دوستوں نے آکر چیزوں کو ٹھنڈا کرنے والی اس مشین کو دیکھا اور حسبِ استطاعت اپنے اندر حسد کی آگ کی لَو کو کچھ اور تیز کر کے چلے گئے۔ اب ہم آمدنی کے لحاظ سے ایک مہینہ پیچھے رہ گئے تھے کیوں کہ ایک مہینہ کی آمدنی اکثر ریفریجریٹر میں بند رہتی تھی اور ہر جاریہ مہینہ قرض پر چلتا تھا۔

جب ہمارے پڑوسیوں کو پتہ چلا کہ ہمارے ہاں ریفریجریٹر آ گیا ہے تو وہ اپنی اپنی قیمتی چیزیں ہمارے ریفریجریٹر میں محفوظ کروانے کے لیے بھیجنے لگے۔ کوئی کھیر بھیج کر یہ کہتا کہ اسے اپنے فریج میں محفوظ رکھیے ہم بعد میں اسے لے لیں گے۔ کہیں سے دہی کی چٹنی آجاتی، کوئی رائتہ بھیج دیتا، کوئی آئس کریم بھیج دیتا۔ فریج تو ہمارا پانچ ہزار روپیوں کا تھا مگر ہمارے پڑوسی جانے یا انجانے طور پر اس کی توہین کرنے کے لیے ایک روپیہ کلو والے آم بھی یہ کہہ کر بھیج دیتے تھے کہ اُنہیں اپنے فریج میں محفوظ رکھیے۔ آپ خود سوچیے ہمارے دل پر کیا نہ گزرتی ہوگی۔ مگر ہمارے ریفریجریٹر کی اس غیر معمولی شہرت کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ اب یہ سامان سے بھرا بھرا رہنے لگا۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سامان دوسروں کا ہوتا تھا۔ ہم چاہتے بھی یہی تھے کہ ریفریجریٹر میں یہ جو ہماری مہینہ بھر کی کمائی منجمد ہوگئی ہے وہ پگھل کر باہر آجائے۔ اور اس سرمایہ کو ہم عملی زندگی میں مشغول کر سکیں۔

مگر مشکل یہ ہوگئی کہ ہم اپنے ریفریجریٹر اور دوسروں کی اشیائے خورد و نوش کو

اپنے بچوں سے محفوظ رکھنے میں بہت مصروف رہنے لگے۔ مستقل چوکیداری کرتے کہ کہیں مُنا کسی کی کھیر اور آئس کریم نہ کھا جائے۔ ایک ایک بچہ کو سبق کی طرح یاد دلاتے کہ یہ کھیر حامد انکل کی ہے، یہ رائتہ شرما جی کا ہے، یہ شیلا کی گڑیا کی آئس کریم ہے، یہ جو سڑے ہوئے آم ہیں وہ ورما جی کے ہیں۔ اُنہیں ہاتھ نہ لگانا۔ رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ ریفریجریٹر میں صرف پانی ہمارا رہتا اور بقیہ چیزیں دوسروں کی ہوتیں۔ کبھی ایسا ہوتا کہ شیلا جب اپنی گڑیا کی آئسکریم لینے آتی تو اپنی گڑیا کے لیے چُپکے سے ورما جی کے دو آم بھی لے جاتی۔ حامد میاں کھیر لینے آتے تو نظر بچا کر شرما جی کا تھوڑا سا رائتہ بھی لے جاتے۔ ایک نوبت وہ بھی آئی جب ہمیں ورما جی کے ایک روپیہ کلو والے آموں کے دام اپنی جیب سے ادا کرنے پڑے۔

بالآخر ہم نے سارے بہی خواہوں اور پڑوسیوں کو سمجھا منا کر اس بات کے لیے آمادہ کیا کہ وہ اپنی چیزوں کی حفاظت کے لیے ہمارے ریفریجریٹر کو زحمت نہ دیا کریں۔ اس سمجھوتے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ریفریجریٹر کا پیٹ پھر خالی ہوگیا۔ ہماری بیگم بڑی خفا ہوگئیں کہ شیلا کی گڑیا کی آئسکریم، ورما جی کے آموں اور شرما جی کے رائتہ سے ہی ہمارے ریفریجریٹر کی عزت باقی تھی۔ اب اس میں کیا خاک رکھیے گا۔ آپ میں اتنی سکت تو ہے نہیں کہ بچوں کا پیٹ بھرنے کے علاوہ فریج کا پیٹ بھی بھر سکیں۔ لعنت ہے آپ کی زندگی پر۔"

اس لیکچر کو سُننے کے بعد ہم دفتر چلے گئے۔ شام میں گھر واپس ہوئے اور پانی پینے کے لیے فریج کو کھولا تو دیکھا کہ اس میں ہماری کتابیں بڑے قرینہ سے رکھی ہوئی ہیں۔ ہم نے بیوی سے کہا "یہ کیا حرکت ہے؟"

بولیں "آپ کی لکھی ہوئی کتابیں اب وہیں زیب دیتی ہیں۔ اُنہیں باہر رکھا جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں یہ سڑ گل نہ جائیں۔ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ دفتر سے واپس ہونے کے بعد آپ اپنے دماغ اور شعور کو بھی ریفریجریٹر میں ہی رکھا کریں۔ بخدا اب تو آپ کے خیالات میں سے باسی دال کی سی بُو آنے لگی ہے۔"

ایک دن بہت عرصہ بعد صبغۃ اللہ راستے میں مل گئے۔ اُنہوں نے پوچھا "بھئی

یہ بتاؤ تمہاری برف کی الماری کا کیا حال ہے؟''

ہم نے کہا'' صبغتہ اللہ! برف کی الماری بفضلِ تعالیٰ اچھی ہے اور اب ہم اس میں اپنی شرافت، نیک نفسی، رواداری، اخلاص اور مروّت کو بڑے جتن کے ساتھ محفوظ رکھنے لگے ہیں۔ چنانچہ اس وقت ہماری یہ ساری چیزیں ریفریجریٹر میں ہی رکھی ہوئی ہیں۔ اب ہم تمہارے سامنے خالص مرد کے رُوپ میں کھڑے ہیں۔''

یہ کہہ کر ہم صبغتہ اللہ کا گلا پکڑنے کے لیے آگے بڑھے اور وہ ایک چلتی ہوئی بس میں سوار ہو کر ہماری نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

(بالآخر۔ 1982)

تکیہ کلام

''تکیہ کلام'' سے یہاں ہماری مراد وہ تکیہ کلام نہیں جو بات چیت کے دوران میں بار بار مداخلت جاو بے جا کرتا ہے بلکہ یہاں تکیہ کلام سے مراد وہ کلام ہے جو تکیوں پر زیورِ طبع سے آراستہ ہوتا ہے اور جس پر آپ اپنا سر رکھ کر سو جاتے ہیں اور جو آپ کی نیندیں ''حلال'' کرتا ہے۔ پرسوں کی بات ہے کہ ہم نے ایک محفل میں غالب کا شعر پڑھا ۔

نیند اس کی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں
تیری زُلفیں جس کے شانوں پر پریشان ہوگئیں

اس شعر کو سُن کر ایک صاحب پہلے تو چونکے۔ پھر گہری سوچ میں غرق ہو گئے اور اپنا سر کُھجاتے ہوئے بولے: ''اگر میرا حافظہ خراب نہ ہوا ہو تو یہ شعر میں نے ضرور کہیں پڑھا ہے۔'' ہم نے اُن کی یادداشت کا امتحان لینے کی خاطر پوچھا۔ ''تب تو سوچ کر بتایئے کہ آپ نے یہ شعر کہاں پڑھا تھا'' وہ کچھ دیر سوچ کر بولے: ''بھئی! لو یاد آیا۔ یہ شعر ہم نے رحمٰن خاں ٹھیکیدار کے تکیہ کے غلاف پر پڑھا تھا۔ بھلا تمہیں یہ شعر کس طرح یاد ہوگیا؟۔ کیا تمہیں بھی اس تکیہ پر سونے کا اتفاق ہوا تھا؟۔'' ہم نے کہا: ''آپ کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ شعر تو دیوانِ غالب میں موجود ہے۔ رحمٰن خاں ٹھیکیدار سے ہمارا کیا تعلق؟۔'' اس پر وہ بولے ''بھئی! دیوانِ غالب سے ہمارا کیا تعلق۔ ہم تو شعر و شاعری

صرف تکیوں کے غلافوں پر پڑھ لیتے ہیں۔ جب شاعری آپ کو تکیوں کے غلافوں پر پڑھنے کو مل جاتی ہے تو اس کے لیے شعراء کے دواوین اُلٹنے پلٹنے کی کیا ضرورت ہے؟'' ان صاحب کے جواب کو سُن کر ہمیں پہلی بار احساس ہوا کہ جس زبان میں شعروشاعری کی بہتات ہوتی ہے اس کا یہی حشر ہوتا ہے۔ شاعری کا ''پیمانۂ صبر'' جب لبریز ہو جاتا ہے تو اشعار چھلک کر تکیوں پر گر جاتے ہیں، چادروں پر بکھر جاتے ہیں، لاریوں کی پیشانیوں پر چپک جاتے ہیں، رکشاؤں کی پیٹھ پر بیٹھ جاتے ہیں اور حد تو یہ ہے کہ دسترخوانوں تک کی زینت بن جاتے ہیں۔ کتنی ہی بار ایسا ہوا کہ ہم دسترخوان پر کھانا کھانے بیٹھے ہیں کہ اچانک دسترخوان پر چُنے ہوئے کسی شعر نے ہمیں چونکا دیا۔ اور ہم کھانا کھانے کی بجائے سر دُھنتے رہ گئے۔ بعض سخن فہم حضرات تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو دسترخوانوں پر فارسی میں اشعار لکھواتے ہیں، جیسے

شکر بجا آر کہ مہمانِ تو
روزیٔ خود می خورد از خوانِ تو

نتیجہ ان فارسی اشعار کی اشاعت کا یہ ہوتا ہے کہ مہمان کھانا کم کھاتے ہیں اور شعر کے معنٰی و مفہوم کو سمجھنے کی کوشش زیادہ کرتے ہیں اور جب وہ معنٰی و مفہوم کے چکر سے آزاد ہوتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ میزبان نے سارا کھانا خود ہی کھالیا ہے۔

دسترخوانوں کے اشعار کی بات چھوڑیئے، کیوں کہ اب ہم دسترخوانوں پر چُنی جانے والی اشیائے خوردونوش میں مختلف ملاوٹوں کے علاوہ اشعار کی ملاوٹ کے بھی عادی ہو گئے ہیں لیکن یہاں بات تکیوں اور اُن کے کلام کی چل رہی ہے۔ ہم نے ایسے معرکتہ الآرا شعر تکیوں پر دیکھے ہیں کہ اگر کوئی ان تکیوں پر سو جائے تو پھر زندگی بھر ان تکیوں پر سے اُٹھنے کا نام نہ لے۔

ہمیں ایک بار سفر پر جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک شناسا کے ہاں مہمان ٹھہرے۔ چونکہ ہم حسبِ روایت بستر اپنے ساتھ نہیں لے گئے تھے اس لئے میزبان نے ہمارے بستر کا انتظام کیا۔ اب جو ہم بستر پر پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ تکیہ پر نہایت جلی حروف میں یہ شعر لکھا ہوا ہے ؎

کسی کے حُسن کا جادو بسا ہے تکیہ میں
جہانِ عارض و گیسو بسا ہے تکیہ میں

اب آپ سے کیا بتائیں کہ ہمارے حق میں یہ بستر، بسترِ مرگ ثابت ہوا۔ رات بھر کروٹیں بدلتے رہے، اختر شماری تک کرتے رہے۔ ہر بار یہی سوچتے رہے کہ آخر تکیہ میں کس کے حسن کا جادو بسا ہے، آخر وہ کون مہ جبین ہے، جس کا جہانِ عارض وگیسو اس تکیہ میں پنہاں ہے۔ بار بار تکیہ کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس تکیہ نے ہم میں وہ سارے آثار پیدا کر دیئے جو آغازِ عشق کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ وفورِ عشق نے اتنا سر اُٹھایا کہ ہم بار بار تکیہ پر اپنا سر پٹختے رہے۔ بالآخر ہم نے فیصلہ کیا کہ صبح ہوگی تو ہم اس نازنین کو ضرور دیکھیں گے جس کے حُسن کا جادو اس تکیہ کے توسط سے ہمارے سر چڑھ کر بولنے لگا تھا۔

صبح ہوئی تو ہم نے چوری چھپے اس نازنین کو دیکھ ہی لیا۔ اس نازنین کے ڈیل ڈول اور وضع قطع کو دیکھنے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ محترمہ کو یہ شعر تکیہ پر نہیں، گاؤتکیہ پر لکھنا چاہئے تھا۔ کیوں کہ اُن کے حُسن کا ''سمبل'' صرف گاؤتکیہ ہی ہوسکتا تھا۔

اس واقعہ کے بعد تکیہ کے اشعار پر سے نہ صرف ہمارا ایقان اُٹھ گیا بلکہ جب بھی کوئی منظوم تکیہ ہمارے سر کے نیچے آیا تو ہم نے چپکے سے اس کا غلاف اُتار لیا کہ کون اپنی نیند حرام کرے۔ آپ نے تکیوں کے وہ اشعار ضرور پڑھے ہوں گے جن پر سو کر آپ نہایت ڈراؤنے خواب دیکھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں ؂

کونین تک سمیٹ لئے ہیں غلاف میں
ٹکڑے جگر کے ٹانک دیئے ہیں غلاف میں

☆

خواب ہائے دل نشیں کا اِک جہاں آباد ہو
تکیہ جنّت بھی اُٹھا لائے اگر ارشاد ہو

☆

چمن در چمن ہے غلاف آیئے تو
ذرا اِس پہ آرام فرمایئے تو

☆

غنچہ ہائے دِل کھلے، سر رکھ کے گستاخی معاف
گلشنِ اُمید کے سب پھول چُن لایا غلاف

غور فرمایئے کہ ان اشعار پر کیا آپ ''تکیہ'' کر سکتے ہیں؟۔ گویا تکیہ نہ ہوا، الہ دین کا چراغ ہوا کہ کونین تک اس میں سمٹ کر آ گئے۔

ہمیں یاد ہے کہ ہمارے ایک دوست کو ادھورے خواب دیکھنے کی بیماری تھی، وہ تھوڑا سا خواب دیکھتے کہ بجلی فیل ہو جاتی اور وہ نیند سے چونک پڑتے۔ ایک دن ہم سے بولے: ''بھئی! عجیب بات ہے کہ مجھے ادھورے خواب نظر آتے ہیں۔ آخر پورے خواب کیوں نظر نہیں آتے۔ میں خوابوں کے ''ٹریلر'' دیکھتے دیکھتے عاجز آ گیا ہوں۔'' ہم نے ان کے بستر کا معائنہ کیا تو دیکھا کہ تکیہ پر ایسا شعر لکھا ہوا ہے جو ''بحر'' سے خارج ہے۔ اس پر ہم نے کہا:

''بھئی! اس کا اصل راز یہ ہے کہ تم ایسے تکیہ پر سوتے ہو جس پر بے بحر شعر لکھا ہوا ہے اور اس تکیہ کی کرامت سے تمہارے خواب بھی بحر سے خارج ہو جاتے ہیں۔ اس شعر کو بدلو تو تمہارے خوابوں کی صحت بھی بہتر ہو جائے گی۔''

یہ تو ایک معمولی سا واقعہ ہے۔ ہمارے ایک اور دوست کا قصہ ہے کہ اُنہیں عرصہ سے بلڈ پریشر کی شکایت تھی۔ جب وہ بستر پر سو جاتے تو اُن کا بلڈ پریشر آسمان سے باتیں کرنے لگتا۔ جب ایلوپیتھی علاج سے فائدہ نہ ہوا تو ایک حکیم صاحب کی خدمات حاصل کیں۔ حکیم صاحب نے اُن کا بغور معائنہ کیا۔ زبان اتنی بار باہر نکلوائی کہ وہ ہانپنے لگے۔ مگر اسی اثناء میں حکیم صاحب کی نظر تکیہ پر پڑی اور وہ تکیہ کی جانب لپکے، شعر کو غور سے پڑھا اور تنک کر بولے:

''اس تکیہ کو ابھی یہاں سے ہٹایئے۔ بلڈ پریشر کی اصل جڑ تو یہ تکیہ ہے۔ واہ

صاحب واہ! کمال کر دیا آپ نے۔ آپ کو بلڈ پریشر کی شکایت ہے اور آپ نے شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا شعر تکیہ پر طبع کروا رکھا ہے۔ جانتے ہو جوشؔ کی شاعری میں کتنا جوش ہوتا ہے۔ جوشؔ کے شعر پر آپ سو جائیں گے تو دورانِ خون نہیں بڑھے گا تو اور کیا ہوگا؟ اس تکیہ کو اسی وقت یہاں سے ہٹائیے۔ خبردار جو آئندہ سے آپ نے جوشؔ کے تکیہ پر سر رکھا۔ اگر شعروں پر سونا ایسا ہی ضروری ہے تو داغؔ کے غلاف پر سو جائیے، جگرؔ کے غلاف کو اپنے سر کے نیچے رکھئیے۔ ان شعراء کا کلام آپ کے بلڈ پریشر کو کم کر دے گا۔ آپ کو فرحت ملے گی، بھوک زیادہ لگے گی آپ کے جسم میں خون کی مقدار میں اضافہ ہوگا وغیرہ وغیرہ۔''

حکیم صاحب کے اس مشورے کے بعد ہمارے دوست نے نہ صرف ''جوشؔ کا غلاف'' بدل دیا بلکہ اب وہ جوشؔ کے کلام کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی خوف محسوس کرتے ہیں کہ کہیں پھر بلڈ پریشر کا عارضہ لاحق نہ ہو جائے۔

لیکن تکیوں کے کلام کی ایک افادیت بھی ہوتی ہے جس کا راز صرف اہلِ دل ہی جانتے ہیں۔ یہ کوئی مبالغہ نہیں کہ ایک اہلِ دِل کی شادی صرف تکیوں کے اشعار کے باعث ہوئی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ یہ صاحب کہیں مہمان بن کر گئے ہوئے تھے۔ رات میں میزبان کے گھر میں سے اُن کے لئے جب بستر آیا تو اس میں ایک تکیہ بھی تھا، جس پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

شمیمِ طُرّہ گیسوئے یار لایا ہوں
میں اپنے ساتھ چمن کی بہار لایا ہوں

آدمی چونکہ ہوشیار تھے، اس لئے اس غلاف کا مطلب سمجھ گئے۔
دوسرے دن بازار گئے اور ایک ریڈی میڈ غلاف خرید لائے، جس پر یہ شعر لکھا ہوا تھا ؎

اُٹھا تو سَر پٹک دیا تکیہ پہ بار بار
شب بھر گواہ، یہ بھی مرے دردِ دل کا تھا

اُنہوں نے چُپکے سے تکیہ کا پرانا غلاف اُتارا اور نیا غلاف اس پر چڑھا دیا۔

اب یہ تکیہ اُن کا پیام لے کر اندر واپس ہوا۔ نہ جانے اس شعر نے کیا قیامت مچائی۔ شام میں جب پھر تکیہ واپس ہوا تو اس پر ایک نیا شعر لکھا ہوا تھا ؎

مرا جذبِ دل مرے کام آرہا ہے
اب اُن کی طرف سے پیام آرہا ہے

دوسرے دن، ان صاحب نے یہ غلاف بھی اُتار لیا اور پھر ایک طبع زاد غلاف چڑھادیا ؎

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

غرض اس ''تکیہ بردار'' عشق نے وہ جوش مارا کہ سلام و پیام کا سلسلہ بڑھتا رہا اور بالآخر ان دونوں کی شادی ہوگئی۔ چنانچہ اب یہ دونوں ایک ہی شعر پر تکیہ کررہے ہیں۔ لیکن اب ان تکیوں کے اشعار کی ماہیت تبدیل ہوگئی ہے۔ چنانچہ ہم نے پرسوں اُن کی خواب گاہ میں جو تازہ تکیہ دیکھا تھا اس پر یہ شعر درج تھا ؎

اس سیہ بخت کی راتیں بھی کوئی راتیں ہیں
خوابِ راحت بھی جسے خوابِ پریشاں ہوجائے

یہ تو خیر عام آدمیوں کے تکیوں کی بات تھی۔ اگر آپ دانشوروں کے تکیوں کو دیکھیں گے تو یقیناً دنگ رہ جائیں گے۔ اُن کے تکیوں پر ایسے صوفیانہ اور فلسفیانہ اشعار لکھے جاتے ہیں کہ اچھا خاصا آدمی بھی فلسفی بننے کی کوشش کر بیٹھتا ہے۔ مثلاً ایک دانشور نے اپنے تکیہ پر یہ شعر لکھ رکھا تھا ؎

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

سچ پوچھیے تو اس تکیہ پر کوئی عام آدمی سو ہی نہیں سکتا۔ ایسے فلسفیانہ شعر پر تو صرف ایک دانش مند ہی سو سکتا ہے اور اسی کو ایسے فلسفیانہ تکیے زیب دیتے ہیں۔

آیئے، اب اُن شعراء کے تکیوں کی بات ہوجائے جن کے لئے شاعری اوڑھنا

بچھونا ہوتی ہے۔ یعنے اُن کے تکیوں پر شعر ہوتے ہیں۔ حد ہوگئی کہ ہم نے ایک شاعر کی مچھر دانی پر بھی شعروں کا جنگل اُگا ہوا دیکھا۔ ہم نے ایک شاعر کے گھر میں ایک منظوم تکیہ دیکھا جس پر یہ شعر درج تھا ؎

یار سوتا ہے بصد ناز بصد رعنائی
محوِ نظارہ ہوں بیدار کروں یا نہ کروں

ہم نے اس شعر کو پڑھ کر کہا: ''بھئی واہ کیا خوب شعر کہا ہے، کس کا شعر ہے؟''

ہمارے سوال کو سُن کر اُن کا چہرہ تمتما اُٹھا اور بولے: ''معاف کیجئے، میں کسی دوسرے کے کلام پر تکیہ نہیں کرتا۔ یہ شعر میرا ذاتی ہے اور یہ بات میری خودداری کے خلاف ہے کہ میں دوسروں کے اشعار پر سو جاؤں۔ آپ مجھے کیا سمجھتے ہیں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ کوئی شاعر اپنے تکیہ پر میرؔ کے تکیہ کا شعر لکھ مارے ؎

سرہانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

ہم نے اُن کے غصّہ کو تاڑ کر معافی مانگ لی اور چُپ ہو رہے۔ بعد میں اُن کے گھر کی اشیاء پر جو نظر ڈالی تو ہر شے شعر میں لت پت نظر آئی۔ پھر بہت دِنوں بعد پتہ چلا کہ شاعر موصوف کی جو غزلیں مختلف رسالوں سے ''ناقابلِ اشاعت'' قرار پا کر واپس آتی ہیں، انہیں وہ اپنے گھر کی چادروں پر چھپوا دیتے ہیں، تکیوں کے غلافوں پر چڑھا دیتے ہیں اور میز پوشوں پر زیورِ طبع سے آراستہ کرتے ہیں۔ ہم تکیوں کے ذریعہ اَدب کی ترقی کے ضرور قائل ہیں لیکن ہمیں یہ بات پسند نہیں کہ ناقابلِ اشاعت اشعار بھی تکیوں پر چھاپے جائیں۔ پھر جب ہماری شاعری میں نئے رجحانات آرہے ہوں تو تکیوں میں بھی نئے رجحانات کا آنا نہایت ضروری ہے۔ کیا ہی اچھا ہو کہ کوئی سخن فہم اپنے تکیہ پر آزاد نظم لکھوائے۔ اگر تکیہ اس نظم کو قبول کرنے میں تنگ دامنی کا شکوہ کرے تو اس نظم کو دو تین تکیوں پر شائع کیا جائے۔ مثلاً نظم کا ایک بند تو ایک تکیہ پر ہو اور اس کے نیچے یہ عبارت درج ہو:

''براہِ کرم تکیہ اُلٹیے۔''

اور تکیہ اُلٹنے پر بھی کام نہ بنے تو نیچے یہ عبارت لکھی جائے:

''باقی نظم ملاحظہ ہو گاؤ تکیہ نمبر (۱) پر۔''

اور گاؤ تکیہ بھی اس طوالت کو برداشت نہ کر سکے تو اس کے نیچے لکھا جائے:

''باقی نظم ملاحظہ ہو شطرنجی کلاں پر۔''

اور جب یہ نظم ختم ہو جائے تو اس کے نیچے 'غیر مطبوعہ' کے الفاظ کا بھی اضافہ کر دیا جائے۔

ہمیں یقین ہے کہ ''منظوم تکیوں'' کے شائقین اپنے تکیوں کو شاعری کے جدید رجحانات سے ہم آہنگ کرنے کی سعی فرمائیں گے۔

سب سے آخر میں ہم اس مضمون کے لئے ان خاتون کے تہہ دل سے ممنون ہیں جن سے ہم نے تکیوں کے چند اشعار مانگے تو انہوں نے اپنے نوکر کو ہمارے گھر بھیجا۔ اس نوکر نے آتے ہی ہم سے کہا:

''صاحب اپنے نوکر کو باہر بھیجئے تا کہ وہ تکیے کے اشعار رکشہ میں سے اُتار سکے۔''

ہم نے حیرت سے پوچھا: ''تمہاری بیگم صاحبہ نے آخر اتنے اشعار کیوں بھیجے کہ اُنہیں رکشہ میں ڈال کر ہمارے یہاں لانا پڑا؟''

وہ بولا: ''صاحب، آپ نے بیگم صاحبہ سے تکیہ کے اشعار مانگے تھے اور اُنہوں نے اپنے گھر کے سارے تکیئے آپ کے پاس بھجوا دیئے ہیں، آپ ان تکیوں کا مطالعہ کرنے کے بعد انہیں واپس بھیج دیجئے۔''

ہم اس دھوبی کے بھی شکر گزار ہیں جو گھاٹ پر کپڑے دھو رہا تھا۔ ہم نے اس دھوبی کو دیکھا کہ وہ ایک کپڑا پانی میں سے نکالتا ہے، اسے کھولتا ہے، پھر اپنی عینک آنکھوں پر لگاتا ہے، کپڑے پر کوئی عبارت پڑھتا ہے اور پھر اس کپڑے کو پتھر پر زور زور سے پٹخنے لگتا ہے۔ ہم نے اس کی اس حرکت کا بغور مشاہدہ کیا تو پتہ چلا کہ وہ بعض کپڑے تو زور سے پٹختا ہے اور بعض کپڑے نہایت آہستگی اور سلیقے سے دھوتا ہے۔

ہم نے پوچھا: ''بھئی! تم بعض کپڑے زور سے پٹختے ہو اور بعض نہایت آہستگی

سے۔آخر یہ کیا راز ہے؟"

وہ بولا: "صاحب! یہ دراصل تکیے کے غلاف ہیں اور میں تکیے کے ہر غلاف کو دھونے سے پہلے اسے کھولتا ہوں اور اس پر لکھا ہوا شعر پڑھتا ہوں۔ اگر شعر مجھے پسند نہ آئے تو اس غلاف کو زور زور سے پتھر پر پٹختا ہوں، یعنی ادبی اصطلاح میں ہوٹنگ کرتا ہوں اور اگر اتفاق سے کوئی شعر پسند آئے تو اسے نہایت سلیقے سے دھوتا ہوں کہ اچھا شعر ساری قوم کی امانت ہوتا ہے۔"

ہم اس ادب دوست دھوبی اور اس کے گدھے کے بھی، جو اُن اشعار کا بوجھ اپنی پیٹھ پر لادے پھرتا ہے، ممنون ہیں کہ اس نے بعض اچھے اشعار ہمیں فراہم کیے جو اس مضمون میں شامل نہیں ہیں۔

(تکلف برطرف۔ 1968)

دیمکوں کی ملکہ سے ایک ملاقات

ایک زمانہ تھا جب میرا زیادہ تر وقت لائبریریوں میں گذرتا تھا۔لیکن جب میں نے دیکھا کہ سماج میں جہلا ترقی کرتے چلے جا رہے ہیں اور اونچی اونچی کرسیوں پر قبضہ جما چکے ہیں تو میں نے سوچا کہ لعنت ہے ایسے علم پر جس سے علم کی پیاس تو بھلے ہی بجھ جائے لیکن پیٹ کی آگ نہ بجھنے پائے۔ ملک کی یونیورسٹیوں پر غصہ بھی آیا کہ اگر وہ علم کو پھیلانے کے بجائے جہالت کو ہی عام کرنے کا بیڑہ اُٹھا لیتیں تو آج ملک نہ جانے کتنی ترقی کر لیتا۔اس خیال کے آتے ہی میں نے لائبریریوں کو خیر باد کہا اور پھر کبھی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھا۔میں نے باہر آ کر جہالت کے گر سیکھنے کی کوشش کی۔ یہاں تک کہ سیاستدانوں کی صحبتوں سے بھی فیضیاب ہوا کہ یہ ہستیاں جہالت کا سرچشمہ ہوتی ہیں۔لیکن یہ گُر نہ آیا۔کسی نے سچ کہا ہے کہ علم کی دولت آدمی کے پاس ایک بار آجاتی ہے تو پھر کبھی نہیں جاتی۔ میں نے لاکھ کوشش کی کہ اپنے اندر یہ جو علم کا افلاس ہے اسے کسی طرح باہر نکالوں اور اس کی جگہ جہالت کی دولت سے اپنے سارے وجود کو مالا مال کر دوں مگر یہ کام نہ ہو سکا۔یہ اور بات ہے کہ ایک عرصہ تک علم سے لگاتار اور مسلسل دور رہنے کی وجہ سے میں نے تھوڑی بہت ترقی ضرور کر لی۔

مگر پچھلے دنوں بات کچھ یوں ہوئی کہ میں اپنے ایک دوست کے ساتھ کہیں جا رہا تھا۔راستہ میں اسے اچانک ایک ضروری کام یاد آ گیا۔اس نے کہا کہ وہ دو گھنٹوں میں واپس آجائے گا۔تب میں یہیں کہیں اس کا انتظار کروں۔ سامنے ایک پارک تھا۔

سوچا کہ یہاں وقت گزار لوں لیکن اس عمر میں نوجوانوں کی خوشگوار مصروفیتوں اور ناخوشگوار حرکتوں میں مخل ہونا پسند نہ آیا۔ سامنے ایک ہوٹل تھا جہاں نہایت اونچی آواز میں موسیقی کو بجا کر گاہکوں کو ہوٹل کے اندر آنے سے روکا جا رہا تھا۔ اب وہ پرانی لائبریری ہی برابر میں رہ گئی تھی جس میں مَیں اپنے زمانہ جاہلیت میں نہایت پابندی سے جایا کرتا تھا۔ خیال آیا کہ چلو آج لائبریری میں چل کر دیکھتے ہیں کہ کس حال میں ہیں یاران وطن۔

افسوس ہوا کہ اب بھی وہاں کچھ لوگ علم کی دولت کو سمیٹنے میں مصروف تھے۔ چونکہ علم کی دولت چرائی نہیں جا سکتی اسی لیے ایک صاحب ضروری علم کو حاصل کرنے کے بعد اپنے سارے گھوڑے بیچ کر کتاب پر سر رکھ کر سو رہے تھے۔ چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ بہت دنوں بعد لسان العصر حضرت شیکسپیئر، مصورِ فطرت علاّمہ ورڈ سورتھ، شمس العلماء تھامس ہارڈی، مصورِ غم جان کیٹس وغیرہ کی کتابوں کا دیدار کرنے کا موقع ملا۔ میں نے سوچا کہ ان کتابوں میں اب میرے لیے کیا رکھا ہے۔ کیوں نہ اُردو کتابوں کی ورق گردانی کی جائے۔ چنانچہ جب میں لائبریری کے اُردو سیکشن میں داخل ہوا تو یوں لگا جیسے میں کسی بھوت بنگلہ میں داخل ہو گیا ہوں۔ میں خوفزدہ سا ہو گیا۔ لیکن ڈرتے ڈرتے میں نے گرد میں اٹی ہوئی ''کلیاتِ میر'' کھولی تو دیکھا کہ اس میں سے ایک موٹی تازی دیمک بھاگنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں اسے مارنا ہی چاہتا تھا کہ اچانک دیمک نے کہا ''خبردار! مجھے ہاتھ لگایا تو۔ میں دیمکوں کی ملکہ ہوں۔ باادب باملاحظہ ہوشیار۔ ابھی ابھی محمد حسین آزاد کی ''آبِ حیات'' کا خاتمہ کر کے یہاں پہنچی ہوں۔ جس نے ''آبِ حیات'' پی رکھا ہو اُسے تم کیا مارو گے۔ قاتل سے دبنے والے اے آسماں نہیں ہم۔''

دیمک کے منہ سے اُردو مصرعہ کو سن کر میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میں نے حیرت سے کہا ''تم تو بہت اچھی اُردو بولتی ہو بلکہ اُردو شعروں پر بھی ہاتھ صاف کر لیتی ہو۔''

بولی ''اب تو اُردو ادب ہی میرا اوڑھنا بچھونا اور کھانا پینا بن گیا ہے۔''

پوچھا ''کیا اُردو زبان تمہیں بہت پسند ہے؟''

بولی ''پسند ناپسند کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے۔ زندگی میں سب سے بڑی اہمیت

آرام اور سکون کی ہوتی ہے جو مجھے یہاں مل جاتا ہے۔تم جس سماج میں رہتے ہو وہاں آرام، سکون اور شانتی کا دور دور تک کہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔امن و امان کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہو۔اب اگر میں یہاں آرام سے رہنے لگی ہوں تو تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔"

میں نے پوچھا" لیکن تمہیں یہاں سکون کس طرح مل جاتا ہے؟"۔

بولی" ان کتابوں کو پڑھنے کے لئے اب یہاں کوئی آتا ہی نہیں ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے جیسے یہ ساری کتابیں میرے لئے فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کا درجہ رکھتی ہیں۔ مجھے تو یقین ہے کہ تم جواب یہاں آئے ہو تو تم بھی کتابیں پڑھنے کے لئے نہیں آئے ہو۔ کہیں تم خود مصنف تو نہیں ہو؟"

میں نے حیرت سے پوچھا" تم نے کیسے پہچانا کہ میں مصنف ہوں۔"

بولی" میں تمہیں جانتی ہوں۔ایک رسالہ کی ورق نوشی کرتے ہوئے میں نے تمہاری تصویر دیکھی تھی بلکہ تھوڑی سی تصویر کھائی بھی تھی۔ایک دم بدذائقہ اور کڑوی کسیلی نکلی۔حالانکہ وہ تمہاری نوجوانی کی تصویر تھی۔پھر بھی اتنی کڑوی کہ کئی دنوں تک منہ کا مزا خراب رہا۔میں تو بڑی مشکل سے صرف تمہاری آنکھیں ہی کھا سکی تھی کیوں کہ تمہارے چہرے میں کھانے کے لئے ہے ہی کیا۔تم اُردو کے مصنفوں میں یہی تو خرابی ہے کہ تصویریں ہمیشہ اپنی نوجوانی کی چھپواتے ہو اور تحریریں بچوں کی سی لکھتے ہو۔اور ہاں خوب یاد آیا۔تم نے سرسیّد احمد خان کو داڑھی کے بغیر دیکھا ہے؟۔نہیں دیکھا تو" آثار الصنادید" کی وہ جلد دیکھ لو جو سامنے پڑی ہے۔ایک دن خیال آیا کہ سرسیّد داڑھی اور اپنی مخصوص ٹوپی کے بغیر کیسے لگتے ہوں گے۔اس خیال کے آتے ہی میں نے بڑے جتن کے ساتھ سرسیّد احمد خاں کی ساری داڑھی نہایت احتیاط سے کھالی۔پھر ٹوپی کا صفایا کیا۔اب جو سرسیّد احمد خاں کی تصویر دیکھی تو معاملہ وہی تھا۔قیس تصویر کے پردے میں بھی عریاں نکلا۔اب یہ تصویر میرے آرٹ کا ایک نادر نمونہ ہے۔مجھے تصویروں میں مسکراہٹیں بہت پسند آتی ہیں۔مونالیزا کی مسکراہٹ تو اتنی کھائی کہ کئی بار بدہضمی ہوگئی۔زمانے کو اس کی مسکراہٹ آج تک سمجھ میں نہیں آئی۔مجھے اس کا ذائقہ سمجھ میں نہیں آیا۔عجیب کھٹ میٹھا

سا ذائقہ ہے۔ کھاتے جاؤ تو بس کھاتے ہی چلے جاؤ۔ بھلے ہی پیٹ بھر جائے لیکن نیت نہیں بھرتی۔''

میں نے کہا'' تم تو آرٹ کے بارے میں بھی بہت کچھ جانتی ہو۔''

بولی'' جب آدمی کا پیٹ بھرا ہو تو وہ آرٹ اور کلچر کی طرف راغب ہوتا ہے۔ میں نے دیکھا کہ کیڑوں مکوڑوں کا پیٹ بھر جائے تو وہ بھی یہی کرتے ہیں۔ تب احساس ہوا کہ انسانوں اور کیڑوں مکوڑوں میں کوئی زیادہ فرق نہیں ہے۔ خیر اب تو تم لوگ بھی اپنی زندگی حشرات الارض کی طرح ہی گذارنے لگے ہو۔''

میں نے کہا'' اب جب کہ تم نے خاصے اُردو ادب کو چاٹ لیا ہے تو یہ بتاؤ یہ تمہیں کیسے لگتا ہے؟''

بولی'' شروع شروع میں یہ میرے پلّے نہیں پڑا تھا۔ بڑا ریاض کیا۔ متقدمین کے دیوان چاٹے۔ مشکل یہ ہوئی کہ میں نے سب سے پہلے'' دیوانِ غالب'' پر ہاتھ صاف کرنے کی کوشش کی۔ خاک سمجھ میں نہ آیا۔ لہٰذا مولوی اسماعیل میرٹھی کی آسان اور زود ہضم نظمیں پہلے نوش جان کیں۔ پھر وہ کیا کہتے ہیں، آپ کے مفلر والے شاعر، وہی جو پانی پت میں رہتے تھے مگر وہاں کی جنگوں میں شریک نہیں تھے۔ ارے اپنے وہی مولانا حالی، اُن کی نصیحت آمیز شاعری پڑھی۔ شاعری کم کرتے تھے نصیحت زیادہ کرتے تھے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ تم لوگوں نے ان کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ اگر کیا ہوتا تو آج تمہارے گلے میں بھی روایات کا ایک بوسیدہ سا مفلر ہوتا۔ اب تو خیر سے سارا ہی اُردو ادب میری مٹھی میں ہے۔ سب کو چاٹ چکی ہوں۔ ایک بار غلطی سے جوش ملیح آبادی کی ایک رباعی چاٹ لی۔ طبیعت میں ایسا بھونچال آیا کہ سارا وجود آپے سے باہر ہونے لگا۔ اس کے اثر کو زائل کرنے کے لیے چاروناچار، جاں نثار اختر کی گھر آنگن والی شاعری چاٹنی پڑی۔ ویسے تو میں نے دنیا کی کم و بیش ساری ہی زبانوں کی کتابیں چاٹ لی ہیں۔ لیکن اُردو شاعروں میں ہی یہ وصف دیکھا کہ اپنے معشوق کو کبھی چین سے بیٹھنے نہیں دیتے۔ کوئی معشوق کے گیسو سنوارنا چاہتا ہے تو کوئی انہیں بکھیر دینا چاہتا ہے۔ کوئی وصل کا طالب ہے تو کوئی ہجر کی لذتوں میں سرشار رہنا چاہتا ہے۔ کوئی معشوق کو کوٹھے پر بلانے کا قائل ہے تو کوئی اس

کا دیدار بھی یوں کرنا چاہتا ہے جیسے چوری کر رہا ہو۔ تم لوگ آخر معشوق سے چاہتے کیا ہو۔ اسے ہزار طرح پریشان کیوں کرتے ہو۔ اُردو شاعری میں معشوق خود شاعر سے کہیں زیادہ مصروف نظر آتا ہے۔ یہ بات کسی اور زبان کے معشوق میں نظر نہیں آئی۔ اُردو شاعروں کا عشق بھی عجیب و غریب ہے۔ عشق کرنا ہو تو سیدھے سیدھے عشق کرو۔ بھائی کس نے کہا ہے تم سے کہ معشوق کی یاد آئے تو آسمان کی طرف دیکھ کر تارے گنتے رہو۔ اس کی یاد نے زور مارا تو اپنا گریبان پھاڑنے کے لئے بیٹھ جاؤ۔ معلوم ہے کپڑا کتنا مہنگا ہو گیا ہے۔ سیدھے سیدھے معشوق کے پاس جاتے کیوں نہیں۔ اپنے دل کا مدعا بیان کیوں نہیں کرتے۔ عاشق بزدل اور ڈرپوک ہو تو ایسے ہی چونچلے کر کے اپنے دل کو بہلاتا رہتا ہے۔''

میں نے کہا ''اردو ادب پر تو تمہاری گہری نظر ہے۔''

بولی ''اب جو کوئی اس کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتا ہی نہیں تو سوچا کہ کیوں نہ میں ہی نظر رکھ لوں۔''

پوچھا ''داغ دہلوی کے کلام کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟''

بولی ''اُن کا کلام گانے کے چکر میں اچھی خاصی بیبیاں طوائفیں بن گئیں۔ مجھے تو طبلہ اور سارنگی کے بغیر اُن کا کلام سمجھ میں نہیں آتا۔''

پوچھا ''اور ہمارے فانی بدایونی؟''

بولی ''اُن کے غم پر بے پناہ ہنسی آتی ہے۔ عجیب مضحکہ خیز غم ہے۔''

''اور مولانا آزاد؟''

بولی ''زندگی بھر ٹھاٹ سے عربی لکھتے رہے اور لوگ اسے اُردو سمجھ کر پڑھتے رہے۔ عربی کے کسی ادیب کو اُردو میں شائد ہی اتنی شہرت ملی ہو۔''

میں نے کہا ''یہ بتاؤ تمہیں اُردو کی کتابیں کیسی لگتی ہیں؟''

بولی ''تمہارا جو ادب لیتھوگرافی کے ذریعہ چھپا ہے اسے کھاؤ تو یوں لگتا ہے جیسے باسی روٹی کے ٹکڑے چبا رہی ہوں۔ پھر جگہ جگہ کتابت کی غلطیاں کباب میں ہڈی کی طرح چلی آتی ہیں۔ لیکن جو کتابیں اُردو اکیڈمیوں کے جزوی مالی تعاون کے ذریعہ

چھپنے لگی ہیں وہ بہت لذیذ ہوتی ہیں۔ میں تو جزوی امداد کی چاٹ میں کل کتاب کو ہی کھا جاتی ہوں۔ ان میں ادب ہو یا نہ ہو کھانے میں لذیذ ہوتی ہیں کیوں کہ مفت خوری میں جو مزہ ہے وہ محنت کی کمائی میں کہاں۔ اعزازی زندگی گذارنے کی شان ہی جداگانہ ہوتی ہے۔ ہاں ایک بات اور، اُردو کا مصنف اور شاعر اپنی کتابوں کے دیباچوں میں بات بات پر اس قدر شکریے کیوں ادا کرتا ہے۔ پبلشر اور سرپرستوں وغیرہ کا شکریہ تو خیر پھر بھی برداشت کیا جا سکتا ہے لیکن اُردو کا مصنف اس سائیکل رکشا والے کا بھی شکریہ ادا کرنے پر مجبور نظر آتا ہے، جس میں بیٹھ کر وہ کتاب کی پروف ریڈنگ کرنے جایا کرتا تھا۔ اس کا شکریہ ادا کرنے سے تو یہی گمان ہوتا ہے کہ اُردو کا مصنف سائیکل رکشا والے کو کرایہ بھی ادا نہیں کرتا۔ تب ہی تو اتنا گڑگڑا کر اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر ممنون ہوتا رہتا ہے۔ میں نے تو یہاں تک دیکھا کہ ایک شاعر نے اپنے مجموعہ کلام کی اشاعت کے لئے چمڑے کے ایک بیوپاری کا یوں شکریہ ادا کیا تھا جیسے چمڑے کا یہ بیوپاری نہ ہوتا تو اُردو ادب در بدر کی ٹھوکریں کھاتا پھرتا اور وہ بھی ننگے پاؤں۔ بھیا چمڑے کا کاروبار اور چمڑی کا کاروبار دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ تم اپنی شاعری میں چمڑی کا کاروبار کرتے ہو۔ پھر چمڑے کے بیوپاری کو اس کی ساری خباثتوں کے ساتھ ادب میں کیوں لے آتے ہو؟''

میں نے کہا'' کیا تم یہ چاہتی ہو کہ اُردو کے ادیب اور شاعر کسی کا شکریہ نہ ادا کریں۔''

بولی'' شکریہ ادا کرنا اچھی بات ہے لیکن اصل میں جس کا شکریہ ادا ہونا چاہئے اس کا تو ادا کرو۔'' میں نے پوچھا'' مثلاً کس کا؟''

شرما کر بولی'' مجھے کہتے ہوئے لاج سی آتی ہے۔ اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کو تو اب میرے سوائے کسی اور کا شکریہ ادا نہیں کرنا چاہئے۔ کیوں کہ بالآخر اب میں ہی اُن کی کتابوں میں پائی جاتی ہوں۔ ورنہ انہیں پوچھتا کون ہے۔''

دیمکوں کی ملکہ کی بات بالکل سچی تھی۔ میں نے گھبرا کر کہا۔'' تم بالکل ٹھیک کہتی ہو۔ اگلی بار اگر میری کوئی کتاب چھپی تو اس میں تمہارا شکریہ ضرور ادا کروں گا۔''

ہنس کر بولی'' اتنی ساری بات چیت کے بعد بھی تم اپنی کتاب چھپواؤ گے۔

بڑے بے شرم اور ڈھیٹ آدمی ہو۔ مرضی تمہاری۔ ویسے میرا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اگر کتاب ہی میرے نام معنون کردو تو کیسا رہے گا۔"

یہ کہہ کر دیمکوں کی ملکہ "کلیاتِ میر" کی گہرائیوں میں کہیں گم ہوگئی اور میں لائبریری سے باہر نکل آیا۔

(آخرکار۔ ۱۹۹۷ء)

قصّہ پہلے گریجویٹ دُرویش کا

اے بزرگانِ ذی احترام، خواتینِ خوش خرام، نوجوانانِ بدکلام و طفلانِ بے لگام! راوی اس جھوٹے قصے کا یوں بیان کرتا ہے کہ کسی زمانے میں ایک شہر آباد تھا کہ جس کے کھنڈر اس کے شاندار مستقبل کی جھوٹی گواہی دیتے تھے اور چونکہ باشندے یہاں کے بہت خوش حال تھے یعنی غربت سے مالا مال تھے اسی لئے اس شہر میں عوام کی تفریح کے لئے ایمپلائمنٹ ایکسچینج کا ایک دفتر بھی قائم تھا جہاں بڑے بڑے نامی گرامی تعلیم یافتہ نوجوان اپنے اسم ہائے گرامی درج کروانے آتے اور اوقاتِ فرصت میں اس دفتر کے احاطے میں بیٹھ کر خوش گپیوں اور کبھی کبھار ''رنج گپیوں'' میں مصروف رہتے تھے۔ جب بھی کوئی عاقبت نااندیش نوجوان یونیورسٹی میں علم کی پیاس بجھا لیتا تو وہ اپنی بھوک مٹانے کے لئے اس دفتر کا رُخ کرتا اور برسوں اس دفتر سے واپس نہ لوٹتا۔

سو اس قصہ کا راوی غیر معتبر پیچھے ہٹ کر یوں بیان کرتا ہے کہ ایک دن اس دفتر کے احاطہ میں کہ جس کا قطر پچیّس میل تھا، چار گریجویٹ دُرویش اپنے ایمپلائمنٹ کارڈوں کی پانچ سو چھٹی مرتبہ تجدید کروانے آئے۔ لیکن دفتر کے کھلنے میں ابھی بہت دیر تھی، یعنی ہر طرف اندھیر تھی، اسی لئے ان چاروں درویشوں نے جو شدتِ غم سے نڈھال تھے مگر شجاعت میں بے مثال تھے یہ طے کیا کہ ہر نوجوان اپنی زندگی کا قصہ بیان کرے اور یوں اپنا غم ''صحیح'' کرے۔

صاحبو! یہ قصہ بہت طولانی ہے اور جان بھی ایک دن جانی ہے۔ پس اے صاحبان اپنی عینکوں کے شیشوں کو صاف کیجئے اور اس قصہ کو غور سے سنئے اور اگر ہو سکے تو ایک دُوسرے کے کلیجے بھی تھام لیجئے۔

پھر پہلے گریجویٹ درویش نے کہ جس کی ایک آنکھ سے آنسوؤں کا سیلاب مسلسل بہہ رہا تھا دُوسرے درویش کی ٹیڈی پتلون کی جیب سے ایک ٹوٹی ہوئی کنگھی نکالی اور اپنے بالوں کو سلیقے سے جمانے کے بعد ایک ایسی زوردار مصنوعی آہ کھینچی کہ اس کی شدت سے اس کے بال پھر بکھر گئے۔ پہلے گریجویٹ نے دُوسرے گریجویٹ کو کنگھی واپس کی، پھر تیسرے گریجویٹ کی پتلون کی جانب متوجہ ہوا اور بولا:

''اے میرے پیارے بھائی! قبل اس کے کہ میں اپنی داستان سناؤں، مجھے ایک سگریٹ پلا کہ میں نے تین دن سے ایک سگریٹ بھی نہیں پی ہے۔''

اس پر تیسرا گریجویٹ رونی صورت بناتے ہوئے بولا'' پیارے رفیق، تو نے صرف تین دن سے سگریٹ نہیں پی ہے مگر میں نے تو ایک ہفتہ سے سگریٹ کی شکل تک نہیں دیکھی۔ لہٰذا مجبوری ہے، پس اپنی داستان سگریٹ کے بغیر ہی سنائیو۔'' یہ سُن کر پہلے گریجویٹ کی دُوسری آنکھ سے بھی آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ اس نے اپنے حواس درست کئے اور بولا: ''اے میرے درویش بھائیو! تب تو کوئی فکر کی بات نہیں۔ میں سگریٹ کے بغیر ہی اپنی داستان سناؤں گا، تو صاحبو کان کھول کر سُن لو کہ یہ حقیر فقیر کہ نام جس کا ایس، اے غلام بخت، قسمت جس کی کم بخت اور عقل جس کی محتاجِ پخت ہے، رہنے والا ملکِ دکّن کا ہے جہاں کی ہر شئے نرالی ہے، جہاں کا ہر شخص موالی ہے اور جس کا محبوب مشغلہ قوالی ہے۔

پہلے درویش نے اپنی داستان یہیں تک سُنائی تھی کہ چوتھے گریجویٹ نے جو بظاہر ادب کا گریجویٹ معلوم ہوتا تھا مگر بباطن نان میٹرک نظر آتا تھا اُٹھ کھڑا ہوا اور جھاڑو سے اپنے کپڑے جھاڑ کر بولا: ''ارے میرے منہ بولے بھائی، تمہاری داستان کا آغاز ہی غلط ہوا ہے، کیوں کہ صدیوں سے یہ روایت چلی آ رہی ہے کہ جب بھی کوئی دُرویش اپنی داستان سناتا ہے تو وہ اپنی داستان سے پہلے ایک غیر متعلق شعر بھی سُنا دیتا

ہے پس تو بھی ایک شعر سُنا اور اپنے آباؤ اجداد کی بھٹکی ہوئی روحوں کو باغ باغ کر دے۔''

پہلا گریجویٹ بولا: ''اے ادب کی ویران خانقاہ کے مجاور، مجھے یونیورسٹی سے نکلے ہوئے چھ سال ہو چکے ہیں۔ لہٰذا اب مجھے اپنے ایمپلائمنٹ کارڈ کے نمبر کے سوا کوئی شعر یاد نہیں ہے۔ پھر بھی تیری خواہش کی تکمیل کروں گا۔'' یہ کہہ کر پہلا گریجویٹ سوچ میں اتنا غرق ہو گیا کہ ڈوبتے ڈوبتے بچا اور جب اُبھرا تو بولا: ''لو صاحبو مجھے شعر یاد آ گیا ہے، نہ جانے کس افسانہ نگار کا ہے ؎

ہزاروں سال نمی اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اس شعر کو سن کر ادب کا گریجویٹ پھر اُٹھ کھڑا ہوا اور بولا:

''اے برادرِ خورد، اپنی زبان سنبھال اور شعر کو غلط نہ پڑھ۔ کیوں کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ یہ شعر علامہ اقبال کا ہے اور اس شعر میں تو جہاں اداکارہ نمی کا ذکر کر رہا ہے وہاں پدما شری نرگس کا ذکر ہونا چاہئے۔''

پہلا گریجویٹ بولا: ''اے ادب کے بے ادب گریجویٹ تو ہمارے نقار خانے میں اپنے طوطی کو بار بار بولنے پر کیوں مجبور کرتا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ شعر میں نمی کا ذکر ہے یا پدما شری نرگس کا۔ بس اتنا جانتا ہوں کہ اُستادِ محترم تو یہاں بیگم پارہ پڑھایا کرتے تھے ——''

اس استدلال کو سن کر ادب کے گریجویٹ کو اتنا غصہ آیا کہ وہ لیڈر کی طرح رنگ بدلنے لگا۔ پھر وہ پہلے گریجویٹ پر حملہ آور ہونا ہی چاہتا تھا کہ تیسرے درویش نے مداخلت کی اور بولا: ''بھائیو! میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس شعر میں نمی اور نرگس دونوں کا ذکر موزوں معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ نمی اور نرگس دونوں بھی ایک ہی معیار اور زمانہ کی اداکارائیں ہیں۔ اس طرح شعر کی معنویت اور اس کی نزاکت کو ٹھیس پہنچنے کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔ پس اے پہلے گریجویٹ، اپنے قصۂ پارینہ کو جاری رکھ۔''

پہلا گریجویٹ سنبھلا اور بولا: ''تو صاحبو! یہ حقیر فقیر پُر تقصیر جو ستم ہائے روزگار کا مارا ہوا، کرم ہائے بے روزگاری کا ستایا ہوا، یونیورسٹی سے نکالا ہوا، کالج کی نازنینوں کا

نچایا ہوا، والدین کا دھتکارا ہوا، رہنے والا ملکِ دکن کا ہے جہاں کا مشہور میوہ املی ہے۔

صاحبو! میرا جنم ایک تحصیل دار کے گھرانے میں ہوا۔ پس مجھے وہ ساری سہولتیں حاصل تھیں جو دیگر تحصیل داروں کے بیٹوں کو حاصل تھیں۔ میری ابتدائی تعلیم جو اتفاق سے آخری تعلیم بھی تھی گھر پر ہوئی۔ وہ گھر کرایہ کا تھا اور قلبِ شہر میں واقع تھا جس کے حدودِ اربع یہ تھے کہ اس کے شمال میں ایک ہوٹل تھا، اس کے جنوب میں ایک چائے خانہ، اس کے مشرق میں ایک رستورنٹ اور اس کے مغرب میں گلنار کیفے واقع تھا۔ غرض ہوٹلوں نے نام بدل بدل کر ہمارے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ دوستو، وہ بھی عجیب دن تھے کہ جب ہر صبح مرغانِ خوش الحان ریڈیو سے فلمی نغمے سُنایا کرتے تھے۔ اور کانوں میں گنّے کا رس گھولا کرتے تھے۔ قصہ مختصر میں نے جب ہوش سنبھالا تو میرے والد کے ہوش ٹھکانے لگ گئے اور اُنہیں میری تعلیم کی فکر ہوئی۔ مگر افسوس کہ میرے والد نے خود اپنی تعلیم کی فکر کبھی نہیں کی، کیوں کہ والد میرے مڈل کامیاب تھے۔ خیر میری تعلیم شروع ہوئی اور گھر پر اُستادوں کا تانتا بندھ گیا۔ تاریخ کے اُستاد، اُردو کے اُستاد، ریاضی کے اُستاد، جغرافیہ کے اُستاد، گوشمالی کرنے کے اُستاد، مرغا بنانے کے اُستاد، کھانا پکانے کے اُستاد، سودا سلف لانے کے اُستاد، وغیرہ وغیرہ۔

اُستادوں کی اتنی افراط تھی کہ میں تو کرسی پر بیٹھا رہتا اور بے چارے اُستاد میرے سامنے بنچوں پر کھڑے رہتے۔ ان تمام اُستادوں کا بیک وقت احترام کرنا مشکل تھا لہٰذا میں صرف ریاضی کے اُستاد کا احترام کرتا تھا اور بقیہ سارے اُستادوں کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔ ریاضی کے اُستاد کا احترام مجھ پر اس لئے بھی لازم تھا کہ ریاضی میری سب سے بڑی کمزوری تھی۔ تو صاحبو! ان دنوں میری حالت اس مرغی کی سی تھی جو دو ملاؤں کی لڑائی کے درمیان موقع پاکر فرار ہو جاتی ہے۔ میں پڑھتا رہا اور میرا غم بڑھتا رہا۔ میں صبح دوگنی اور دوپہر چوگنی زوال کی منزلیں طے کرتا رہا۔ حساب میں جس کا تخلص ریاضی ہے اتنی بار فیل ہوا کہ جس کا حساب نہیں۔ اُردو چونکہ میری مادری زبان تھی اور چونکہ میں اپنی والدہ کا احترام نہیں کرتا تھا اس لئے مجھ سے جگہ جگہ اِملا کی غلطیاں سرزد ہو جایا کرتی تھیں۔ والد میرے اس زوال کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے کیوں کہ میں انہی کے نقشِ قدم پر چل رہا تھا۔

بالآخر مجھے ایک سرکاری مدرسہ میں داخل کرا دیا گیا۔ سرکاری مدرسہ میں داخل ہونا تھا کہ میری صلاحیتیں اچانک اُجاگر ہونے لگیں اور میں کھیل کود، سیر سپاٹوں اور شرارتوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگا۔ اور چوری چھپے داخلِ درنصاب فلمیں جیسے سکندرِ اعظم، راجہ ہریش چندر اور شکنتلا دیکھنے لگا۔ میں نے میٹرک کے امتحان میں جو گُل کھلائے وہ دنیا کے کسی باغ میں دستیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ مثلاً تاریخ کے پرچے میں مَیں نے سکندرِ اعظم اور راجہ پورس کی لڑائی کا حال یوں لکھا تھا

''سکندرِ اعظم جب ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو اس وقت تک پانی پت کا میدان تیار نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے سکندرِ اعظم اور راجہ پورس کو مجبوراً یہ لڑائی دریائے جہلم کے کنارے لڑنی پڑی۔ یوں تو لڑائی میں دونوں بادشاہوں کے سپاہی حصہ لے رہے تھے لیکن لڑائی میں بار بار سکندرِ اعظم اور راجہ پورس ہی نمایاں نظر آتے تھے۔ ایک مرحلہ پر سکندر نے میان سے تلوار نکالی اور پورس پر حملہ آور ہوا لیکن پورس نے ڈھال کی مدد سے سکندر کے وار کو بیکار کر دیا۔ اور بڑی تمکنت کے ساتھ بولا: ''اے سکندرِ اعظم، اپنی جان کی خیر منا اور اسی وقت اپنی فوجوں کو لے کر واپس چلا جا ورنہ تو اپنی لاش خود اپنے کندھوں پر اُٹھا کر یہاں سے واپس جائے گا۔'' سکندرِ اعظم مسکرایا اور پرَے ہٹ گیا، اس نے پینترا بدلا اور پورس پر دوبارہ حملہ آور ہوا لیکن یہ وار بھی پروگرام کے مطابق خالی گیا۔ اب سکندرِ اعظم کی آنکھوں سے آگ کے شعلے برسنے لگے، اس کے چہرے پر خون سمٹ آیا، اس کے دانت بجنے لگے، اس نے پھر تلوار اُٹھائی اور پورس پر حملہ آور ہوا ہی چاہتا تھا کہ اچانک پیچھے سے آوازیں آنے لگیں ''چائے گرم چائے، سوڈا لیمن پان بیڑی سگریٹ۔'' لوگ کرسیوں پر سے اُٹھ کر باہر جانے لگے، ہم لوگ بھی انٹرول میں سگریٹ پینے کے لئے باہر چلے گئے۔ واپس ہوئے تو دیکھا کہ راجہ

پورس کو گرفتار کر کے سکندرِ اعظم کے حضور میں پیش کیا گیا ہے۔ اس
کا مطلب یہ تھا کہ سکندرِ اعظم نے ہمارے غیاب سے فائدہ اُٹھا کر
راجہ پورس پر فتح حاصل کر لی تھی۔ لوگ سکندرِ اعظم کو بڑا بادشاہ
مانتے ہوں تو شوق سے مانیں لیکن میں یہ کہوں گا کہ سکندرِ اعظم لاکھ
اعظم سہی، اُسے اداکاری مطلق نہیں آتی تھی۔"

میرے درویش بھائیو! میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں کئی کارنامے انجام
دیئے اور اگر میں ان کارناموں کو تفصیل سے بیان کروں تو شاید تمہاری دوروزہ زندگی ختم
ہو جائے اور تم لوگ میرا قصہ سننے کے بعد گھروں کی طرف جانے کی بجائے سیدھے
قبرستان کا رُخ کرو۔ ایک بار تاریخ کے اُستاد نے مجھ سے پوچھا: "بتاؤ فرانس میں کتنے
لوئی گزرے ہیں؟" اس پر میں گننے لگا کہ لوئی اوّل، لوئی دوم، لوئی سوم، لوئی چہارم، لوئی
پنجم، لوئی ششم، لوئی ہفتم، لوئی ہشتم، لوئی نہم، لوئی دہم، لوئی میٹرک، لوئی بی اے (جونیئر)
اور لوئی بی اے (فائنل)۔ خوش قسمتی سے ہمارے تاریخ کے اُستاد اتنے رحم دل تھے کہ
جہانگیر بادشاہ بھی اتنا رحم دل نہ رہا ہوگا۔ لہٰذا وہ از راہِ رحم دلی بچوں کو زدوکوب کرنے کی
بجائے خود اپنا سر پیٹ لیا کرتے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے میرے جواب کو سُن کر مجھے پیٹنے
کی بجائے اپنا سر پیٹ لیا اور بولے۔

"بیٹا، تو فرانس کے لوئیوں کو غلط گن رہا ہے، دماغ پر بار ڈال، کیوں کہ لوئی دہم
کے بعد لوئی میٹرک نے حکمرانی نہیں کی تھی۔"

اس پر میں نے دماغ پر زور ڈالا اور لوئیانِ فرانس کو پھر یوں گننے لگا: "لوئی
اوّل، لوئی دوم، لوئی سوم، لوئی چہارم، لوئی پنجم، لوئی ششم، لوئی ہفتم، لوئی ہشتم، لوئی نہم،
لوئی دہم، لوئی چہلم۔"

اُستاد نے پھر سر پیٹ لیا اور بولے: "بیٹا لوئی دہم کے بعد لوئی چہلم کس طرح
آسکتا ہے؟"

میں بولا: "کیوں نہیں آسکتا جب کہ ہمارے دادا کے انتقال پر دہم کے بعد اُن
کا چہلم ہی ہوا تھا۔"

تاریخ کے ایک پرچے میں مَیں نے شاہجہاں کی فنِ تعمیر سے دلچسپی کا حال یوں لکھا تھا:

''شاہجہاں کو فنِ تعمیر سے بہت دلچسپی تھی۔ اسے جب بھی موقع ملتا، پھاوڑا اور تھاپی لے کر عمارتیں تعمیر کرنے لگ جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ملک میں اتنی عمارتیں نمودار ہوئیں کہ اُن میں رہنے کے لئے لوگوں کو تلاش کرنا پڑتا تھا، اُن کی منت سماجت کرنی پڑتی تھی۔ جب کوششِ بسیار کے بعد بھی عمارتوں کے لئے مکین فراہم نہ ہوسکے تو بادشاہ نے حکم دیا کہ اُن عمارتوں میں مُردوں کو دفن کردیا جائے تاکہ اُن عمارتوں کو بنانے کا مقصد پورا ہو چنانچہ خود بادشاہ بھی اپنے حکم کی تعمیل میں ایک عمارت میں دفن ہوا۔ حوالے کے لئے ملاحظہ ہو تاج محل جو آگرہ میں ہے۔ بادشاہ نے جب خوب سیر ہوکر عمارتیں تعمیر کرلیں تو وہ فنِ تعمیر کے دیگر شعبوں کی جانب متوجہ ہوا۔ چنانچہ اُس نے بڑے بڑے پہاڑ بنوائے اور وسیع وکشادہ دریا کھدوائے۔ ہمالیہ پہاڑ شاہجہاں ہی نے بنوایا تھا۔ ایک سمندر بھی بنوایا تھا جسے تاریخ میں بحرِ ہند کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس سمندر کو تعمیر کرنے کے بعد بادشاہ بہت پریشان ہوا، کیوں کہ اس میں پانی نہیں تھا لہٰذا اس نے رعایا کو حکم دیا کہ وہ خلیجِ بنگال کا پانی بالٹیوں میں بھر کر بحرِ ہند میں ڈالے چنانچہ لگاتار دس برس تک بحرِ ہند میں پانی ڈالا گیا۔ دُوسرے سمندروں کی مچھلیاں اور وھیل مچھلیاں پکڑ پکڑ کر اس سمندر میں چھوڑ دی گئیں، تب کہیں جا کر یہ سمندر تعمیر ہوا۔''

پہلے دُرویش نے اپنی داستان یہاں تک سنائی اور اچانک چھ زانو ہوکر بیٹھ گیا۔ پھر دیگر درویشوں کی جانب متوجہ ہوکر بولا:

''بھائیو! میں تو قصہ سنانے میں مصروف ہوں اور تم اسے شوق سے

سننے میں مصروف ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ دفتر کھل کر بند ہو جائے، ایمپلائمنٹ کارڈ تقسیم ہو جائیں اور ہم یہیں بیٹھے رہیں۔ لہٰذا ہر درویش باری باری سے دفتر کے حالات پر کڑی نظر رکھے۔"

دوسرا درویش بولا:

"اے درویش! تجھے غلط فہمی ہوئی ہے کہ میں تیرا قصہ سُن رہا ہوں۔ میں تو برابر ٹکٹکی باندھے ایمپلائمنٹ کارڈ تقسیم کرنے والے کلرک کی کھڑکی کو دیکھ رہا ہوں۔ پس تو سکونِ قلب سے اپنے قصہ کو جاری رکھیو۔"

اس پر پہلا دُرویش اُٹھ کر قریبی نل کے پاس گیا، جب خوب سیر ہو کر پانی تناول کر چکا تو دوبارہ واپس ہوا اور یوں گویا ہوا:

"اے صاحبو! تو قصہ یوں چلتا ہے کہ میرے میٹرک کا امتحان کامیاب کرنے تک میرے والد کو طرح طرح کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ میری ایک کامیابی کے لئے میرے والد کو کئی ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر میرے والد نے میرے خلاف گہری سازش کی اور ممتحن پر اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے مجھے امتحان میں کامیاب کرا دیا۔"

جب میں کالج میں داخل ہوا تو زندگی نِکھار پر آئی ہوئی تھی۔ ہر طرف رنگینیاں تھیں لیکن میری زندگی کا وہی حال تھا یعنی میرا کلاس میں ٹِکنا محال تھا۔ صاحبو! میں نے پڑھنے کی بہت کوشش کی لیکن چند جاسوسی ناولوں کے سوا کچھ نہ پڑھ سکا۔ انگریزی اور اُردو میں میری استعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ مگر خوشی اس بات کی تھی کہ میرے دوستوں کی انگریزی بھی اتنی ہی کمزور تھی جتنی کہ میری۔ چنانچہ میں آپ حضرات کو اپنے ایک دوست کا قصہ سنانا چاہتا ہوں کہ ایک بار کینٹین میں ایک شخص سے لڑائی ہو گئی۔ اس شخص نے میرے دوست سے کہا: "یو ڈیم ایڈیٹ!" میرے دوست نے اس کا کچھ نوٹس نہ لیا۔ البتہ وہ وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ آدھا گھنٹہ نہ گزرا ہوگا کہ وہ پھر واپس ہوا اور نہایت غصہ کے عالم میں پوچھنے لگا "وہ شخص کہاں گیا جس نے مجھے ڈیم ایڈیٹ کہا تھا۔" ہم نے کہا وہ تو چلا گیا۔ اس پر وہ بولا مجھے "اس کا اتا پتہ بتاؤ میں اسے مزہ چکھانا چاہتا ہوں۔" ہم لوگوں

نے کہا جب اس نے تمہیں ڈیم ایڈیٹ کہا تھا تو تم نے اسی وقت مزہ کیوں نہ چکھایا؟ وہ بولا:۔۔۔ ’’بھائیو، میں ابھی ابھی ڈکشنری میں اس لفظ کے معنی دیکھ کر آرہا ہوں اور مجھ پر ابھی دومنٹ پہلے یہ انکشاف ہوا ہے کہ اس نے آدھا گھنٹہ پہلے مجھے گالی دی تھی۔‘‘ غرض دوستو، انگریزی کی بات تو بہت بڑی ہے خود میری اُردو اتنی کمزور تھی کہ میں بات چیت کرتے وقت بھی املا کی غلطیاں کر بیٹھتا تھا۔ اگر آپ اسے مذاق سمجھیں کہ ایک شخص بات چیت میں املا کی غلطیاں کس طرح کر سکتا ہے تو میں اس کے لئے آپ کو بیت بازی کے اس مقابلہ کا حوالہ دینا چاہتا ہوں جس میں مَیں شریک ہوا تھا۔ مخالف ٹیم کے ایک طالب علم نے شعر پڑھا ؎

اک شہنشاہ نے دولت کا سہارا لے کر
ہم غریبوں کی محبت کا اُڑایا ہے مذاق

اس پر میں نے تڑاخ سے یہ شعر پڑھ دیا تھا ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے
خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

اے میرے مونسو! غم خوارو! یہی وہ دن تھے جب میں پڑھنے پڑھانے سے عاجز آچکا تھا کہ ایک دن میری نظر کالج کی ایک حسینہ پر پڑی کہ جس کا نام مہ لقا تھا اور جس کا محبوب عطر، عطرِ لخلخہ تھا۔ پہلی نظر میں تو میں اس لڑکی پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا لیکن دوسری نظر میں اس پر بمشکل پانچ سو جان سے عاشق ہو سکا۔ کیوں کہ جب میں نے اسے دوسری بار دیکھا تو اس کا میک اَپ اُتر چکا تھا۔ میں آٹھوں پہر عشق کی آگ میں جلنے لگا۔ ایک دن میں نے فیصلہ کیا کہ اس پری چہرہ حسینہ پر اپنے عشق کا اظہار کرنا چاہئے۔ اس وقت تک میرے عشق کی حالت یہ تھی کہ ع

ایک ہی طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی

مگر اس حسینہ کے حضور میں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ سو میں نے ایک ترکیب نکالی اور اس کی ایک سہیلی کی خدمت میں حاضر ہو کر گڑگڑانے لگا: اے شہزادی مہ لقا کی سہیلی، بوجھ تو سہی میری پہیلی کہ میں مریضِ عشق ہوں اور دوا چاہتا ہوں۔ تیری مہ لقا

سے شفا چاہتا ہوں۔'' وہ بولی: ''اے ایس اے غلام بخت، کیا تو نے آج صبح آئینہ میں اپنی صورت دیکھی ہے کہ یوں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔'' میں نے کہا: ''خدا کے لئے مجھ عشق کے مارے پر بہکنے کا الزام عاید نہ کر۔ بات دراصل یہ ہے کہ مجھے تیری سہیلی سے محبت ہوگئی ہے، اس کی ہر شئے سے مجھے اُلفت ہوگئی ہے اور میں تیرے وسیلے سے اپنی محبت کو پروان چڑھانا چاہتا ہوں۔'' وہ بولی: ''میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا ہے۔ میرے وسیلے سے بھلا تم دونوں کی محبت کس طرح پروان چڑھ سکتی ہے؟'' میں نے کہا: ''اے نادان لڑکی! تو اتنی معمولی سی بات بھی نہیں سمجھتی، جبھی تو بی، اے میں دو سال سے فیل ہورہی ہے۔ اگر تو نے واقعی میری بات نہیں سمجھی ہے تو سُن لے کہ ان دنوں ہر طرف سفارش کا سکہ چل رہا ہے اور جہاں سفارش نہیں چلتی وہاں مکھن بازی چل رہی ہے۔ میں عشق کا ایک شاہ بے تاج ہوں اور تیری ایک سفارش کا محتاج ہوں۔ لہٰذا شہزادی مہ لقا کے نام ایک سفارشی خط لکھیو۔ مجھے یقین ہے کہ تیری سفارش سے میرا کام بن جائے گا اور باقی تیرا نام رہ جائے گا۔'' بالآخر اس لڑکی نے میرے دل کا مدعا پہچان لیا اور ایک گلابی رنگ کے کرم خوردہ کاغذ پر ایک سفارشی خط لکھ دیا۔ میں اس سفارشی خط کو لے کر خوشی خوشی شہزادی مہ لقا کے گھر کی طرف روانہ ہوا لیکن ابھی تھوڑی دُور ہی گیا تھا کہ میری نظر ایک مرد ٹریلین پوش پر پڑی جو اپنے مکان کے برآمدے میں کھڑا زاروقطار رو رہا تھا۔ غالباً اس کی بیوی مر گئی تھی اور وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا ''ہائے میں لُٹ گیا، میں تباہ ہوگیا۔ اب مجھے بدمزہ سالن کون کھلائے گا۔ اب مجھ سے بات بات پر لڑائی جھگڑا کون کرے گا۔ ہائے اب میری شیروانی سے پیسے کون چرائے گا۔ اب مجھ سے میری تنخواہ کا حساب کون پوچھے گا؟''

اس مرد ٹریلین پوش کے دُکھ کا یہ عالم تھا کہ اس کے آنسو تھامے نہ تھمتے تھے۔ مجھے اس کی حالت پر بڑا رحم آیا۔ میرے دل میں ہمدردی اور ایثار کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔ میں مثل ایک تیر کے اس غم زدہ شخص کی جانب بڑھا اور بولا: ''اے زود رنج انسان! تیری آہ وبُکا کو سُن کر میں نے یہ اندازہ لگایا ہے کہ تو ایک ''عادی شوہر'' ہے اور بیوی کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا۔'' پھر میں نے اپنی محبوبہ کے نام اس کی سہیلی کا دیا ہوا سفارشی خط

اس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا'' اے مردِ ٹریلین پوش! اپنی زندگی سے یوں مایوس نہ ہو کہ تیرے درد کا علاج میرے پاس ہے۔ یہ سفارشی خط لے کر اسی وقت اس نازنین کے درِ دولت پر جا، جس کا پتہ اس لفافہ پر درج ہے۔ انشاء اللہ تیری مراد برآئے گی۔ اصل میں یہ سفارشی خط میرے حق میں لکھا گیا تھا۔ لیکن میں نے تیری گریہ وزاری کو سُن کر شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے اور میں ترے حق میں شہزادی مہ لقا سے دستبردار ہو رہا ہوں۔''

جذب وایثار کے اس بے مثال واقعہ کے بعد میں مثلِ دیوداس، اُداس رہنے لگا۔ میری اُداسی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ان دنوں میں ملک کے بعض سیاسی رہنماؤں کی سوانح عمریوں کے مطالعہ میں مصروف تھا۔ ان سوانح عمریوں میں بار بار یہ ذکر ملتا کہ فلاں لیڈر نے ''ہندوستان چھوڑ وتحریک'' میں حصہ لیا اور تعلیم ترک کردی۔ فلاں لیڈر نے ''عدمِ تعاون کی تحریک'' میں سرگرمی دکھائی اور تعلیم ترک کردی۔ مجھے ان لیڈروں پر رشک آتا تھا، جنہوں نے ''ہندوستان چھوڑ وتحریک'' میں حصہ لینے کے بہانے اسکول چھوڑ دیا تھا۔ ان دنوں میں ہاسٹل میں رہتا تھا۔ اور مجھے بار بار یہ احساس ہوتا تھا کہ میں بعداز وقت پیدا ہوا ہوں۔ کیوں کہ اب کالج چھوڑنے کے لئے کوئی بہانہ ملنا دُشوار تھا۔ اس غم میں، میں اچانک بیمار پڑا اور بسترِ مرگ بچھا کر سوگیا۔ ہاسٹل کے وارڈن صاحب بہت پریشان ہوئے۔ دُور دُور سے ڈاکٹروں بشمول ڈاکٹرز آف فلاسفی کو طلب کیا گیا۔ لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ بالآخر ایک دن ایک حکیم صاحب نے جو یکتائے بیروزگار تھے میرا طبّی معائنہ کیا اور وارڈن صاحب سے کہا: ''مرض نہایت معمولی ہے اور اس کا علاج تو اس سے بھی معمولی ہے۔'' وارڈن صاحب نے فرمایا: ''حکیم صاحب تو پھر نسخہ تجویز فرمادیجئے۔'' حکیم صاحب بولے: ''نسخہ یہ ہے کہ اس مرد کو ہاسٹل کا فوڈ مانیٹر بنادیجئے۔ چند دنوں میں نہ صرف بھلا ہوجائے گا بلکہ چنگا بھی ہوجائے گا۔''

غرض مجھے فوڈ مانیٹر بنادیا گیا اور میری صحت دن بہ دن اچھی ہونے لگی۔ اور اُدھر کالج میں میرے دُشمنوں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔ دُشمنوں نے میرے خلاف گہری سازش کی اور مجھے بہلا پھسلا کر کالج یونین کے انتخابات میں کھڑا کردیا۔ انتخابات

میں دُشمنوں نے مجھے جی کھول کر ووٹ دیئے اور میں بھاری اکثریت سے کالج یونین کا صدر منتخب ہوگیا۔ دُشمنوں کی اس گہری سازش کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دُشمن تو پڑھائی لکھائی میں مصروف رہنے لگے اور میں خارج از نصاب سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگا، یہاں تک کہ میرے دُشمنوں نے امتحان میں ٹاپ کیا اور میں فیل بھی نہ ہوسکا۔ کیوں کہ مجھے نقل کرنے کے الزام میں کالج سے ایک سال کے لئے ریس ٹیکیٹ کردیا گیا۔

مگر اے میرے درویش بھائیو! میں نے کالج یونین کے صدر کی حیثیت سے جو کارنامے انجام دیئے وہ کالج کی تاریخ میں سفید روشنائی سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ جب کبھی کالج جانے کو میرا جی نہیں چاہتا تھا تو میں ہڑتال کروادیتا تھا۔ جب بھی میرے ساتھیوں کا جی ہوٹنگ کرنے کی طرف مائل ہوتا تھا تو ایک عدد مشاعرہ منعقد کرڈالتا تھا۔ میں نے کالج میں بے شمار ڈرامے کھیلے اور سارے اہم کردار خود ادا کیے۔ ڈرامہ ''شیریں فرہاد'' میں مَیں نے فرہاد کا رول اس قدر اثر انگیزی کے ساتھ ادا کیا کہ نہر کھودنے کے منظر میں سارے اسٹیج کو کھود کر رکھ دیا اس کے بعد اس اسٹیج پر کوئی ڈرامہ نہ کھیلا جاسکا۔ ڈرامہ ''رستم وسہراب'' میں میں سہراب بنا لیکن میں نے ڈرامے کے آخری منظر میں رُستم کو اس بُری طرح پیٹا کہ وہ بے ہوش ہوگیا۔ اور ڈرامے کے مطابق مجھے ہلاک کرنے کا اہل نہ رہا۔ واضح ہو کہ جس لڑکے نے رستم کا کردار ادا کیا تھا وہی تھا جس نے مجھے بہلا پھسلا کر کالج یونین کے انتخابات میں کھڑا کیا تھا۔

تو صاحبو! اس کے بعد میں لگاتار چار برس تک بی اے کا امتحان دیتا رہا۔ پھر خدا کا کرنا یوں ہوا کہ کالج کے پرنسپل صاحب مجھ پر مہربان ہوگئے۔ کیوں کہ میں فرصت کے اوقات میں اُن کے گھر کا سودا سلف لانے لگا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ کلیدِ کامیابی یہی ہے۔ غرض جیسے تیسے میں نے بی اے کا امتحان کامیاب کیا اور گزشتہ چھ سال سے بیروزگار ہوں۔ یعنی اپنی ہی قسمت پر ماتم گُسار ہوں۔ صاحبو! میری عمر اس وقت تیس سال ہے اور روزگار کا ملنا محال ہے۔ گرانی اتنی بڑھ چکی ہے کہ صبح میں والد کی شیروانی سے ایک روپیہ چراتا ہوں تو شام تک ختم ہوجاتا ہے۔ صبح میں کھانا کھاتا ہوں تو دوپہر تک پھر بھوک لگ جاتی ہے۔ صبح میں سیکل کے پہیئے میں ہوا بھراتا ہوں تو شام تک پہیہ پنکچر ہوجاتا ہے۔

غرض گرانی نے بہت پریشان کر رکھا ہے۔ قیمتیں اس قدر تیزی سے بڑھ رہی ہیں کہ دو پیسے میں ایک سگریٹ خرید کر پینے لگتا ہوں تو اس کا آدھا حصہ ایک پیسے میں پیتا ہوں اور جب بقیہ آدھا حصہ جلنے لگتا ہے تو مجھے پھر یہ دو پیسے میں پڑتا ہے۔"

پہلے درویش نے اپنی داستان ختم کی اور زار و قطار رونے لگا۔ وہ دراصل رونے کے لئے اپنی داستان کے ختم ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہنے لگا، تو تیسرے درویش نے اسے دلاسہ دیتے ہوئے کہا: "میرے اچھے درویش بھائی! اب زیادہ رنج نہ کر کیوں کہ ہم سب ایک ہی کشتی کے سوار ہیں، یعنی ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی چٹا ہے اور کوئی بٹا ہے۔"

پہلے درویش نے ایک آہِ سرد کھینچی اور تیسرے گریجویٹ کو پرے ہٹاتے ہوئے بولا: "مگر بھائی کچھ تو معلوم ہو کہ ہمیں ملازمت کب ملنے والی ہے اور ہمارے دل کی مرجھائی ہوئی کلی کب کھلنے والی ہے؟"

اس پر تیسرا درویش بولا: "اے میرے رفیق، تو ابھی تک خوابِ غفلت میں پڑا جاگ رہا ہے۔ معلوم یوں ہوتا ہے جیسے تو نے ایک خوشخبری ابھی تک نہیں سُنی ہے۔"

خوشخبری کا لفظ سنتے ہی پہلا درویش گیند کی طرح اُچھل پڑا اور تیسرے درویش کا گریبان پکڑ کر پوچھنے لگا: "یار بتا دے نا وہ خوشخبری کون سی ہے؟"

تیسرا درویش بولا: "اے میرے پیارے درویش بھائیو! میں آج تمہیں یہ خوشخبری سنانا چاہتا ہوں کہ حکومت نے ہم جیسے بیروزگاروں کی سہولت کے لئے وظیفہ پیرانہ سالی کی اسکیم منظور کی ہے جہاں ہم نے اپنی زندگی کے تیس سال نا اُمیدی میں گزار دیئے ہیں کیا ہم وہاں مزید تیس سال اُمیدِ روزگار میں نہیں گزار سکتے؟"

ابھی چاروں درویشوں نے اس خبر پر اچھی طرح مسرّت کا اظہار بھی نہیں کیا تھا کہ ایمپلائمنٹ ایکسچینج کے کلرک نے آواز لگائی: "صاحبان! اپنے اپنے ایمپلائمنٹ کارڈ لائیے اور اُن کی تجدید کروائیے۔" سارے درویش کاؤنٹر کی طرف دوڑ پڑے اور پہلے درویش کی داستان وہاں ختم ہوئی جہاں سے اُسے شروع ہونا چاہئے تھا۔

(تکلف برطرف۔ ۱۹۶۸)

مرزا غالبؔ کی پریس کانفرنس

عالمِ بالا میں جب نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں نظام جنگ بہادر المتخلص بہ غالبؔ کو فرصت کے رات دن میسر آ گئے تو وہ تصورِ جاناں کرنے بیٹھ گئے ۔ اور اس قدر بیٹھ گئے کہ اگر بروقت نہ چونکتے تو بہشت کی زمین میں مرزا غالبؔ کی جڑیں پھوٹ جاتیں اور وہ ایک ہرے بھرے درخت میں تبدیل ہو کر رہ جاتے اور بعد میں یہ درخت دیوانِ غالبؔ کے نسخوں سے لد جاتا۔ مگر خدا بھلا کرے میر مہدی مجروحؔ کا کہ اُن کی کھانسی نے مرزا غالبؔ کو چونکا دیا۔ اور انہوں نے چونکتے ہی میر مہدی مجروحؔ سے پوچھا ''بھئی کیا وقت ہے؟'' میر مہدی مجروحؔ نے پہلے تو اپنی گھڑی کو اچھی طرح ہلا کر یقین کر لیا کہ یہ چل رہی ہے یا نہیں، پھر گھڑی کی طرف غور سے دیکھ کر کہا اُستاد محترم، آپ وقت کیا پوچھتے ہیں، کافی بُرا وقت آ گیا ہے۔ پوری ایک صدی بیت گئی ہے اور آپ صرف تصورِ جاناں میں کھوئے رہ گئے۔ اب ذرا جاگئے کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے اور شاعر کہہ گیا ہے ؎

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

شعر کو سُنتے ہی مرزا غالبؔ جو پہلے ہی سے چونک گئے تھے کافی سے زیادہ چونک گئے اور بولے، یہ کیا کہہ رہے ہو میاں میر مہدی! ذرا ہوش کے ناخن لو، کیا ہم پوری

ایک صدی تک ''تصوّرِ جاناں'' کرتے رہے؟

میر مہدی بولے ''اور نہیں تو کیا۔ آپ نے تو تصوّرِ جاناں کے سارے عالمی بلکہ کائناتی ریکارڈ توڑ کر رکھ دیئے ہیں۔'' یہ کہہ کر میر مہدی نے ایک ٹوٹے ہوئے ریکارڈ کے چند ٹکڑے مرزا غالبؔ کی خدمت میں پیش کیے اور ایک سرد آہ کھینچ کر یوں گویا ہوئے ''اے میرے استادِ محترم! مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے، جو ہونا تھا وہ ہو چکا، قسمت کے لکھے کو بھلا کون مٹا سکتا ہے۔ آپ ادھر تصوّرِ جاناں میں مگن رہے اور ادھر دنیا والوں نے آپ کی صد سالہ تقاریب منا ڈالیں بچے بچے کی زبان پر آپ کا نام تو تھا ہی اب بڑوں کی زبان پر بھی آپ کا نام ہے۔ دنیا میں اب یہ رواج عام ہو گیا ہے کہ اگر کسی کو دھمکی دینا ہو تو کہا جاتا ہے ''میاں! ذرا ہوشیار رہنا، نہیں تو تمہاری غالبؔ صدی تقاریب منا کر رکھ دوں گا۔'' میں نے بارہا اس قسم کے جملے سنے ہیں۔

''اگر کل تک مکان کا کرایہ ادا نہ ہوا تو سرِ بازار تمہاری غالب صدی تقاریب منا دوں گا۔'' ''اگر ٹھیک سے کام نہ کرو گے تو تمہارا غالب سیمینار منعقد کروں گا۔'' وغیرہ وغیرہ۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو آپ کی تصویر بتا کر ڈراتی ہیں۔ ''اگر شور کرو گے تو غالبؔ کو بلاؤں گی۔'' قبلہ! اب آپ سے کیا عرض کروں کہ آپ غالبؔ سے ''گالبؔ'' بن گئے ہیں۔ اور بعض بعض مقامات بلکہ مقاماتِ آہ و فغاں پر تو آپ ''گلیبؔ'' بھی بن چکے ہیں۔ لہٰذا اب خوابِ غفلت سے جاگیے اور دشمنوں کا منہ توڑ جواب دیجیے ورنہ عین ممکن ہے کہ آپ کی شاعری صرف فیشن بن کر رہ جائے۔

مرزا غالبؔ میاں میر مہدی کی اس تقریر دل پذیر کو بڑے غور سے سنتے رہے پھر بولے: ''تم نے ہمیں پہلے ہی کیوں نہ جگایا؟''

میر مہدی بولے ''حضور! آپ کو تو یک گونہ بے خودی دن رات چاہئے بلکہ یہی تو آپ کا واحد پسندیدہ ''اِن ڈور گیم'' ہے۔ بس اسی خیال سے نہ جگایا۔

ورنہ کیا بات کر نہیں آتی

مرزا غالبؔ بولے ''وہ تو ایک صدی پہلے کی بات تھی۔ اب تو ''حالات'' اور ہماری ''حالت'' دونوں تبدیل ہو چکے ہیں۔ مگر بھئی کوئی سبیل تو بتاؤ کہ اب ہم کیا کریں؟''

تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر اچانک میر مہدی نے چٹکی بجا کر کہا'' قبلہ! ایک ترکیب ذہن میں آئی ہے۔ اگر اس پر عمل کیا جائے تو شاید آپ اپنے موقف کی وضاحت کر سکیں۔''

مرزا غالب نے پوچھا'' وہ کیا ترکیب ہے؟''

میر مہدی بولے'' حضور ان دنوں ہندوستان میں پریس کا بول بالا ہے۔ پریس کی طاقت بہت بڑی طاقت ہے۔ ایسے آڑے وقت میں پریس ہی آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ کیوں نہ ہم پریس والوں کو طلب کریں۔''

مرزا غالب نے کسی قدر حیرانی سے پوچھا'' کیا منشی نول کشور کا پریس اب تک موجود ہے؟'' میر مہدی نے مرزا غالب کی سادگی پر کفِ افسوس ملتے ہوئے کہا'' حضور! منشی نول کشور کا پریس تو اسی وقت بند ہو گیا تھا جب اس نے آپ کا دیوان چھاپا تھا۔ پریس والوں سے میری مراد اخبار والوں سے ہے۔ ہم ایک پریس کانفرنس طلب کریں گے جس میں آپ اپنے موقف کی وضاحت کریں۔''

مرزا غالب نے تقریباً نڈھال ہو کر کہا'' میاں میر مہدی! ہم تو کچھ بھی نہیں جانتے۔ ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی۔ ہمیں تم پر پورا پورا بھروسہ ہے۔ تم جو کچھ کرو گے وہ اچھا ہی کرو گے۔ مناسب سمجھو تو پریس کانفرنس بلا لینا مگر خیال رہے کہ یہ پریس کانفرنس دلّی میں منعقد ہو کیوں کہ ہم نے بہت دنوں سے دلّی نہیں دیکھی آنکھیں ترس گئی ہیں اسے دیکھنے کے لئے۔''

میر مہدی نے فوراً بات کو کاٹ کر کہا'' حضور پریس کانفرنس دلّی میں نہیں ہو گی کیوں کہ دلّی '' ڈرائی ایریا '' ہے اور پریس میں کوئی بات ___ ع

بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

لہٰذا پریس کانفرنس حیدرآباد میں منعقد ہو گی کیوں کہ یہ ابھی تک خوش قسمتی سے '' ویٹ ایریا '' ہے۔''

بالآخر پریس کانفرنس طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔ میر مہدی نے مرزا غالب کو پریس کانفرنس کے اسرار و رموز سے واقف کرایا۔ اُنہیں ان ساری زیادتیوں کا حال سنایا

جو ایک صدی کے عرصہ میں اُن کی ذات کے ساتھ کی گئی تھیں۔ مرزا غالبؔ ان زیادتیوں کو سنتے جاتے اور زار و قطار روتے جاتے تھے اور اُن کی زبان پر یہ شعر تھا ؎

غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا میرے بعد

میر مہدی بار بار انہیں دلاسہ دیتے اور کہتے ؎

غالبؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں

میر مہدی نے مرزا غالبؔ کو سمجھایا اور کہا کہ ''حضور اب رونے کا وقت نہیں رہا۔ اب ذرا سنبھل جائیے اور ایک تفصیلی صحافتی بیان تیار کیجئے تاکہ اس کی سائیکلو اسٹائل کاپیاں پریس کانفرنس میں اخبار والوں کے حوالے کی جاسکیں۔''

پریس کانفرنس کی تیاریاں شروع ہوگئیں، مرزا غالبؔ اور میاں میر مہدی دوسری دنیا سے اس دنیا میں عارضی طور پر آگئے۔ غالبؔ دن بھر پریس کانفرنس کی تیاریوں میں مصروف رہتے اور راتوں کو اپنا صحافتی بیان لکھنے میں مگن ہو جاتے۔ مرزا غالبؔ نے بڑے انہماک کے ساتھ ان غالبؔ نمبروں کا مطالعہ شروع کر دیا جو مختلف رسالوں نے اُن کی صدی تقاریب کے موقع پر شائع کئے تھے۔ مرزا غالبؔ نے غالبیات کا مطالعہ یوں شروع کر دیا جیسے وہ خود اپنے آپ پر ریسرچ کرنے چلے ہوں۔ کسی کو مرزا غالبؔ کی آمد کی اطلاع نہیں دی گئی اور کسی کو یہ پتہ نہ چلا کہ مرزا غالب اُن کے درمیان یوں موجود ہیں جیسے چور کی داڑھی میں تنکا موجود ہوتا ہے۔

چاروں طرف غالبؔ صدی تقاریب کا غلغلہ مچا ہوا تھا۔ ''یومِ غالبؔ'' ''جشنِ غالبؔ'' ''یادِ غالبؔ'' ''غالبؔ ڈے'' ''غالبؔ فیسٹیول'' ''غالبؔ فنڈ'' ''غالب میموریل'' ''غالبؔ بال روم ڈانس'' ''غالبؔ سمیتی'' ''غالبؔ سبھا'' ''غالبؔ سنستھا'' ''غالبِ مہیلا وِبھاگ'' ''غالب کاریہ کرم'' اور ''غالب پریہ درشنی'' کا اس قدر غلبہ تھا کہ غالب نے حیران ہو کر خود سے سوال کیا ؎

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

حد ہوگئی کہ انہوں نے سڑکوں پر ایسے بورڈ بھی آویزاں دیکھے "غالبؔ پان شاپ"، "غالبؔ ہیر کٹنگ سیلون"، "غالب اینڈ سنس"، "غالبؔ انجینیر نگ ورکس"، "غالبؔ اسٹون پالشنگ ورکس"، "غالبؔ کلاتھ مرچنٹ"، "غالب کراکری" وغیرہ وغیرہ۔ مرزا غالبؔ ان ساری زیادتیوں بلکہ مظالم کا بغور جائزہ لیتے رہے اور دل میں کڑھتے رہے۔

جب مرزا غالبؔ کا صحافتی بیان تیار ہوگیا تو مرزا غالبؔ نے میر مہدی کے مشورے سے پریس کانفرنس کی تاریخ مقرر کی اور ایک اخبار کے ایڈیٹر سے ملنے چلے گئے۔ اخبار کے ایڈیٹر نے پہلے تو بڑے تپاک سے اُن کا استقبال کیا مگر جب مرزا غالب نے بتایا کہ وہ مرزا غالبؔ ہیں تو اس نے فوراً اپنے نوکر کو آواز دی اور کہا "اُن صاحب کو باہر لے جاؤ۔ مجھے غالب پر ایک مقالہ لکھنا ہے، میرے پاس ایسے غیر ضروری لوگوں سے ملاقات کے لئے وقت نہیں ہے۔"

مرزا غالبؔ نے جو ملازم کی گرفت میں آچکے تھے چیخ کر کہا ؎

تمہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

"صاحب یہ کہاں کا انصاف ہے کہ آپ مجھ پر تو مقالہ لکھ سکتے ہیں لیکن مجھ سے ملاقات کے لئے وقت نہیں نکال سکتے؟"

ایڈیٹر نے کہا "صاف صاف بتایئے کہ آپ کون ہیں؟"

مرزا غالب نے میر مہدی کی طرف دیکھ کر کہا ؎

پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

ایڈیٹر بولا، "دیکھئے حضرت، میرا وقت خراب نہ کیجئے، بتایئے کہ آپ کون ہیں؟"

مرزا غالب بولے "میں مرزا غالب ہوں اور یہ میر مہدی مجروح ہیں۔"

ایڈیٹر نے طنز آمیز مسکراہٹ کے ساتھ کہا "آپ کا نمبر کون سا ہے؟"

غالبؔ بولے ”نمبر سے آپ کا کیا مطلب ہے؟“

ایڈیٹر نے کہا ”نمبر سے مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے پانچ مرزا غالبؔ میرے پاس آچکے ہیں۔ آپ کا نمبر چھٹواں ہے۔“

مرزا غالبؔ کا چہرہ تمتما گیا اور اُنہوں نے بڑی درشتگی کے ساتھ کہا: ”مذاق بند کیجئے۔ میں مرزا غالب ہوں اور صدفی صد غالب ہوں، میں دُوسری دُنیا سے اس دُنیا میں بطورِ خاص اس لیے آیا ہوں کہ اب تک میرے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے اس کا جواب دوں اگر آپ کو یقین نہیں آتا تو آپ دیوانِ غالبؔ سے اشعار پوچھ سکتے ہیں، مجھے اپنے سارے اشعار زبانی یاد ہیں۔ ایڈیٹر بولا ”دیوانِ غالب کے سارے اشعار تو مجھے بھی یاد ہیں۔ کیا میں محض اس قصور کی پاداش میں غالب کہلاؤں گا؟“

مرزا غالبؔ نے زور دے کر کہا ”خدا کے لئے اس بات کا یقین کیجئے کہ میں مرزا غالبؔ ہوں۔“

ایڈیٹر بولا ”اگر آپ مرزا غالبؔ ہیں بھی تو مجھ سے کیا واسطہ؟“

مرزا غالبؔ بولے ”آپ سے صرف اتنا واسطہ ہے کہ آپ غالبؔ صدی تقاریب کے خلاف میرا بیان شائع کریں اور میری پریس کانفرنس میں شرکت کریں جو اگلے اتوار کو منعقد ہو رہی ہے۔“

ایڈیٹر نے کہا ”معاف کیجئے، میں غالبؔ صدی تقاریب کے خلاف آپ کا بیان اپنے اخبار میں نہیں چھاپ سکتا۔ کیوں کہ ہمارا اخبار اگر ایسا کوئی بیان شائع کرے تو غالب صدی تقاریب کمیٹی ہمیں اشتہار دینا بند کردے گی اور ہم آپ کی خاطر کوئی خطرہ نہیں مول لینا چاہتے اور میرے لئے اگلے اتوار کو آپ کی پریس کانفرنس میں شرکت کرنا اس لئے ناممکن ہے کہ اسی روز غالبؔ اکیڈیمی کی جانب سے غالب تقاریب منائی جارہی ہیں اور ان تقاریب کا آپ کی پریس کانفرنس سے کلیش (Clash) ہوگیا ہے۔ لہٰذا مجھے معاف کیجئے۔ میں آپ کے کلام سے قریب اور آپ سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ یہ کہہ کر ایڈیٹر اُٹھ کھڑا ہوا اور مرزا غالبؔ کو چھوڑ کر اپنے کمرے سے باہر چلا گیا۔

مرزا غالبؔ بہت بے آبرو ہو کر اس کوچہ سے نکلے اور اس کے بعد انہوں نے

میاں میر مہدی سے کہہ دیا کہ وہ آئندہ کسی ایڈیٹر کے پاس نہیں جائیں گے۔ لہٰذا پریس کانفرنس کے سارے امور وہ خود انجام دے لیں۔

میر مہدی مجروحؔ نے کافی دوڑ دھوپ کی بلکہ دھوپ زیادہ کھائی اور دوڑ کم لگائی۔ بالآخر پریس کانفرنس کا وقت آ گیا، مرزا غالبؔ پریس کانفرنس کے دن اپنا مخصوص چغہ پہننا چاہتے تھے۔ لیکن معلوم ہوا کہ ان کا چغہ غالب صدی تقاریب کمیٹی کے قبضہ میں ہے لہٰذا انہیں اپنے یونیفارم کے بغیر ہی پریس کانفرنس میں آنا پڑا۔

پریس کانفرنس کے دن کافی چہل پہل تھی۔ انواع و اقسام کے اخباروں کے پریس رپورٹرس جمع ہونے لگے۔ جب سارے رپورٹرس جمع ہو گئے تو میاں میر مہدی مجروحؔ ڈائس پر آئے اور بولے ''دوستو! آپ لوگ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھ جائیں، اُردو کے ممتاز شاعر مرزا غالبؔ ابھی آپ کے سامنے آئیں گے، آپ تھوڑی دیر صبر کریں۔''

اس پر اخبار ''ٹیوز ڈے ٹائمز'' کے نمائندے نے کہا ''آخر ہم کب تک صبر کریں۔ پریس کانفرنس کا وقت ہو چکا ہے لیکن ابھی تک آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آج پریس کانفرنس کا مینو (Menu) کیا ہوگا۔ محض آپ کی پریس کانفرنس کے خیال سے ہم نے دوپہر کا کھانا نہیں کھایا ہے۔ لہٰذا ہمیں مرزا غالبؔ کو دکھانے سے پہلے یہ بتائیے کہ آپ نے کھانے پینے کی اشیاء کہاں سجا رکھی ہیں۔''

اس پر میاں میر مہدی مجروحؔ نے کہا ''حضرات، آپ اطمینان رکھیں کہ ہم نے ایٹ ہوم کا مناسب بندوبست کر رکھا ہے لیکن ایٹ ہوم پریس کانفرنس کے بعد ہی ہوگا ورنہ اندیشہ ہے کہ کہیں آپ لوگ ایٹ ہوم کے بعد سیدھے اپنے گھروں کو روانہ ہو جائیں لہٰذا صبر کیجئے کہ صبر کا پھل میٹھا ہوتا ہے۔''

ابھی میر مہدی مجروحؔ کا بیان جاری ہی تھا کہ مرزا غالبؔ اچانک ڈائس پر نمودار ہو گئے۔ انہوں نے صحیفہ نگاروں کو بیٹھ جانے کے لئے کہا کہ اور اپنا صحافتی بیان پڑھنا شروع کر دیا۔

''ساتھیو! میں مرزا غالبؔ ہوں، اسد اللہ خاں غالبؔ، میں وہی غالبؔ ہوں، جس نے ''دیوانِ غالبؔ'' لکھا اور جو قرض کی مے پیتا تھا اور جس کے اشعار آپ یوں

استعمال کرتے ہیں جیسے یہ آپ کے ذاتی اشعار ہوں۔ میرا انتقال ایک سو سال پہلے ہوا تھا۔ جب میرا انتقال ہوا تھا تو مجھے یہ اندیشہ نہیں تھا کہ میرے بعد آپ لوگ میری ایسی درگت بنائیں گے کہ میرا جغرافیہ ہی بگڑ جائے گا۔ میں نے احتیاطاً اپنی زندگی میں ہی عرض کر دیا تھا ع

بارے آرام سے ہیں اہلِ جفا میرے بعد

مگر بعد میں پتہ چلا کہ اہلِ جفا کی اصل سرگرمیاں تو میرے مرنے کے بعد ہی شروع ہوئی ہیں۔ میرے انتقال کے بعد لوگوں نے خواہ مخواہ میرے حالاتِ زندگی میں دلچسپی لینی شروع کی۔ یقین مانئے کہ اگر لوگ میرے جیتے جی میرے حالاتِ زندگی میں دلچسپی لیتے تو شاید میں آج تک بھی نہ مرتا اور اب تک میرے کئی دیوان شائع ہو چکے ہوتے۔ مگر جن دِنوں میں قرض خواہوں سے منہ چھپاتا پھرتا تھا۔ اپنی پنشن کے اجراء کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھایا کرتا تھا، ان دنوں کسی نے پلٹ کر بھی یہ پوچھنے کی کوشش نہیں کی کہ میرے منہ میں کتنے دانت ہیں۔ جو لوگ میرے اشعار پر ناک بھوں چڑھایا کرتے تھے وہ آج میرے اشعار کی تعریف کرتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے وہ پاگل ہو گئے ہوں۔ میں نے بڑی کس مپرسی کی حالت میں اپنی عمر کا آخری حصہ گزارا۔ مگر آج جب جگہ جگہ ''غالب میموریل فنڈ'' قائم کئے جا رہے ہیں تو مجھے یہ پوچھنے کا حق پہنچتا ہے کہ ؎

حیراں ہوں پھر ''مشاہرہ'' ہے کس حساب میں

میں بہت ادب کے ساتھ یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے پیچھے ہاتھ دھو کے کیوں پڑے ہوئے ہیں۔ اگر آپ کو کسی کی ''صدی تقاریب'' ہی منانا مقصود تھا تو اس کے لئے مومنؔ کیا بُرے تھے، ذوقؔ میں کیا برائی تھی اور پھر اگلے زمانے میں ایک میرؔ بھی تو تھے۔ ان سارے شعراء کی موجودگی میں صدی تقاریب کے انعقاد کے لئے میرے انتخاب کی کیا وجہ ہے، مجھے آپ لوگوں کی نیت پر شبہ ہے۔ آپ نے میرے چھوٹے سے دیوان اور چند نجی خطوط کو اتنی اہمیت دے ڈالی ہے کہ میرے دیوان کا حلیہ بگڑ گیا ہے۔ آپ نے میری اجازت کے بغیر ''غالبیات'' کا ایک شعبہ قائم کر رکھا ہے۔ بحیثیت غالب میں نے غالبیات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ لوگوں نے اب تک

مجھ پر اتنی ریسرچ کی ہے کہ میں اکیلا شخص ریسرچ کے اس بھاری بوجھ کو برداشت نہیں کرسکتا۔ اتنی ریسرچ کے لئے تو پندرہ بیس غالبوں کی ضرورت تھی۔ میں نے غالبیات کے مطالعہ کے دوران ایسے مضامین بھی پڑھے ہیں جو ''عالم غیب'' سے میرے خیال میں بھی نہ آسکتے تھے۔ مثال کے طور پر چند مضامین کے عنوانات ملاحظہ فرمایئے: ''غالب اور ایٹمی دور''، ''غالب اور منصوبہ بندی''، ''غالب کی شاعری میں پنچایتی عنصر''، ''غالب کی شاعری پر غالب کا اثر''، ''اقبال غالب کے آئینے میں''، ''غالب کی شراب نوشی ایک سنگِ میل''، ''فلمی صنعت پر غالب کے احسانات''، ''غالب اور کفایت شعاری''، ''ہماری معیشت غالب کے کلام کے آئینے میں''، ''غالب اور فیملی پلاننگ''۔

حضرات، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ میری شاعری کا تعلق فیملی پلاننگ سے پیدا کیا جائے گا تو سچ مچ شاعری کے معاملہ میں بھی ''فیملی پلاننگ'' پر عمل کرتا اور دو یا تین شعر بس کے اصول پر کاربند رہتا۔ غالبیات کے مطالعہ کے دوران مجھے بار بار یہ احساس ہوا کہ آپ جس غالب کا ذکر کررہے ہیں وہ شاید میں نہیں ہوں لیکن جب میں نے اپنا نام اپنی ولدیت کے ساتھ پڑھا تو یقین کرنا پڑا کہ وہ غالب میں ہی ہوں جس کی مٹی پلید کی جارہی ہے۔ حد ہوگئی کہ ایک ماہر غالبیات نے میری شاعری کے دو دیوان شائع کئے ہیں اور ان کے نام علی الترتیب ''دیوانِ غالب'' اور ''دیوانِ اسد'' رکھے ہیں۔ ''دیوانِ غالب'' میں غالب والے تخلص کے اشعار موجود ہیں اور ''دیوانِ اسد'' میں وہ غزلیں ہیں جن میں میرا تخلص اسد ہے۔ آپ ہی بتایئے کہ اس تکلف کی کیا ضرورت تھی۔

ماہرینِ غالبیات کا تو ذکر ہی چھوڑیئے۔ جب سے اسکولوں کے تعلیمی نصاب میں میرے کلام کو شامل کیا گیا ہے اس وقت سے مجھے یہ گمان ہونے لگا ہے ؎

تمہارے شعر ہیں اب صرف دل لگی کے اسد

میں نے ایک طالب علم کی جوابی بیاض دیکھی تھی جس میں اُس نے میرے ''حالاتِ زندگی'' کچھ اس طرح بیان کئے تھے:

''غالب آگرہ کے تاج محل میں پیدا ہوئے۔ بہت دنوں تک تاج محل کی سیر کرتے رہے۔ جب خوب سیر تفریح کرچکے تو انہیں ایک شریف آدمی کی طرح فکرِ معاش

لاحق ہوگئی۔ چونکہ آگرہ میں رہ کر فکرِ معاش کرنا بے سود تھا۔ اسی لئے وہ آگرہ سے نکل گئے اور بلاٹکٹ سفر کی صعوبتیں جھیلتے ہوئے حیدرآباد پہنچے۔ یہاں اُنہوں نے عثمانیہ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی اور یہیں انگریزی کے اُستاد مقرر ہوئے۔ چونکہ غالبؔ کو اُردو شاعری سے بہت دلچسپی تھی اس لئے وہ بات بات پر شعر کہتے تھے۔ وہ اُردو کے واحد شاعر ہیں جنہوں نے ازاربند کی مدد سے شعر کہے۔ ہر غزل کے لئے ایک نیا ازاربند استعمال کرتے تھے اور جیسے ہی کوئی شعر ہوتا تھا فوراً ازاربند میں گرہ لگادیتے تھے۔ شعروں اور ازاربند میں گرہ لگانا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ غالبؔ شراب بہت شوق سے پیتے تھے اور دوسروں کو پینے کا کوئی موقع ہی عطا نہیں کرتے تھے۔ اسی لئے اُن کے بہت سے دُشمن پیدا ہوگئے۔ انہوں نے غالبؔ کے خلاف سازش کی اور بالآخر غالبؔ کو دہلی واپس ہوجانا پڑا۔''

حضرات! ان حالاتِ زندگی کو پڑھ کر میری کیا حالت نہ ہوئی ہوگی آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اگر کوئی آپ کے حالاتِ زندگی اس طرح لکھتا تو آپ کے دل پر کیا نہ گزرتی۔

دوستو! میں نے ''غالبؔ صدی تقاریب'' کا حال تفصیل سے پڑھا ہے۔ ان تقاریب میں ملک کے ایسے سیاسی لیڈروں نے بھی حصہ لیا جو میرے نام اور کام سے قطعاً واقف نہ تھے۔ کسی نے مجھے ''پرجا سوشلسٹ'' ثابت کرنے کی کوشش کی تو کسی نے کہا کہ غالبؔ کانگریس کے حامی تھے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا ذلّت ہوسکتی ہے کہ ایک لیڈر نے میرا تعلق ''سوتنترا پارٹی'' سے پیدا کرنے کی کوشش کی تھی۔ میں اس سیاسی لیڈر کے بارے میں بھی سُن چکا ہوں جو میری صدی تقاریب کے افتتاح کے لئے آیا تھا اور بار بار لوگوں سے پوچھ رہا تھا کہ ''گالب صاحب کہاں ہیں، اُن کے بغیر یہ اُدگھاٹن کیوں کر ہوسکے گا؟'' ان لیڈروں نے لوگوں کو مشورہ دیا کہ وہ میرے نقشِ قدم پر چلیں۔ انہیں یہ تک نہیں معلوم کہ میرے نقشِ قدم پر چل کر آدمی صرف مقروض ہی بن سکتا ہے۔ میں نے یہاں تک سنا ہے کہ سیاسی انتخابات میں لیڈروں نے میرے نام پر ووٹ حاصل کئے اور یہ کیسی بدقسمتی ہے کہ میں خود اپنے نام سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ فلمی صنعت نے بھی مجھے نہ

بخشا اور میری زندگی کو کچھ اس طرح فلمایا کہ یہ فلمیں ''باکس آفس ہٹ'' ہوگئیں۔ ایسے گھٹیا مکالمے جو میں زندگی بھر اپنی زبان سے ادا نہ کر سکا وہ میری زبان سے کہلوائے گئے۔ میری بیوی کو فلموں میں اس قدر حسین دکھایا گیا کہ اگر وہ سچ مچ اتنی ہی حسین ہوتی تو میرے حالاتِ زندگی مختلف ہوتے۔ قوّالوں نے میری غزلوں کا قتلِ عام کیا۔ مجھے گلی گلی رُسوا کیا گیا اور میں ضبط کرتا رہا۔ مگر اب پانی سر سے اُونچا ہوگیا ہے، اب تک میری جو رُسوائی ہوئی ہے اس کی تلافی ہونی چاہئے ورنہ میں ازالۂ حیثیتِ عرفی کا مقدمہ دائر کردوں گا۔''

مرزا غالبؔ نے اپنا صحافتی بیان ختم کیا اور نڈھال ہوکر کُرسی پر گر گئے۔ میاں مہدی مجروحؔ نے فوراً انہیں پانی پلایا اور پنکھا جھلنے لگے۔ جب مرزا غالب کو ہوش آیا تو میر مہدی نے اخباری نمائندوں سے کہا کہ وہ اگر کوئی سوال کرنا چاہتے ہوں تو کرسکتے ہیں۔ اخباری نمائندوں نے جو پہلے ہی سے اس موقع کی تاک میں بیٹھے ہوئے تھے مرزا غالب پر سوالات کی بوچھار کردی۔

ایک صحافی نے پوچھا: ''ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے؟''

دوسرے صحافی نے پوچھا: ''کعبہ کس منہ سے جاؤ گے غالبؔ؟''

تیسرے صحافی نے پوچھا: ''نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا؟''

چوتھے صحافی نے پوچھا: ''آہ کا کس نے اثر دیکھا ہے؟''

پانچویں صحافی نے پوچھا: ''نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟''

چھٹے نے پوچھا: ''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں؟''

مرزا غالب نے اچانک اتنے سارے سوالات کو سُن کر کہا: ؎

آتا ہے ابھی دیکھئے کیا کیا میرے آگے

''دوستو! مجھ سے آسان سوالات پوچھئے، آپ مجھ سے ایسے سوالات کیوں پوچھتے ہیں جن کے جوابات میں خود اپنی زندگی میں دے نہ سکا تھا۔ میرے ہی سوالوں کے ذریعہ مجھے لاجواب کرنے کی سازش اچھی نہیں۔''

اس پر پریس کانفرنس میں تھوڑی دیر سکتہ طاری رہا، پھر ایک صحافی نے اُٹھ کر پوچھا:

''مسٹر غالبؔ! جدید شاعری کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

غالبؔ نے کہا: ''جناب والا، آپ جسے جدید شاعری کہتے ہیں وہ اصل میں کافی قدیم شاعری ہے۔ یہ اس وقت کی شاعری ہے جب انسان کو لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا اور وہ ابھی علمِ عروض کی باریکیوں سے واقف نہ ہوا تھا۔ لہٰذا جدید شاعری کو جدید شاعری نہ کہئے بلکہ قدیم شاعری کہئے۔ جدید شاعری تو وہ ہے جو میں نے کی ہے۔''

اس کے بعد ایک اور صحافی نے پوچھا ''محکمہ ڈاک نے آپ کے جو یادگاری ٹکٹ جاری کئے ہیں ان کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

مرزا غالبؔ بولے: ''ٹکٹ تو بہت اچھے ہیں مگر مجھے یہ شکایت ہے کہ ڈاک والے ان ٹکٹوں پر بہت زور سے مہر لگاتے ہیں اور اس کے بعد ان ٹکٹوں میں ''یادگار'' نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔''

تھوڑی دیر پھر خاموشی رہی۔ اتنے میں اچانک ایک نوجوان صحافی نے اُٹھ کر پوچھا: ''مسٹر غالبؔ! سچ سچ بتائیے کہ اس پریس کانفرنس کے انعقاد کا مقصد کیا ہے؟''

غالبؔ نے کچھ دیر سوچ کر کہا ''بھئی! سچ بات تو یہ ہے کہ میں اس پریس کانفرنس کے ذریعہ اس رقم کا حساب کتاب پوچھنا چاہتا ہوں جو ''غالب میموریل فنڈ'' کے کھاتے میں جمع ہوئی ہے۔ بحیثیت غالب اس رقم پر میرا حق ہے، لہٰذا مجھے یہ رقم ملنی چاہئے اور میں اسے حاصل کر کے ہی رہوں گا۔''

اس پر ایک صحافی نے دیگر صحافیوں کو مخاطب کر کے کہا ''بھائیو! مجھے تو یہ کوئی دھاندلی نظر آ رہی ہے۔ اصل میں یہ شخص غالبؔ کا روپ دھارن کر کے پیسے بٹورنا چاہتا ہے۔''

اچانک کسی نے آواز لگائی ''پکڑو اسے۔ کوئی اُچکا نظر آتا ہے، جانے نہ پائے۔ اسے پولیس کے حوالے کر دو۔''

پریس کانفرنس میں اچانک بھگدڑ مچ گئی اور مرزا غالبؔ میر مجروحؔ کے ساتھ فرار ہو گئے۔ پریس کانفرنس خود بخود ختم ہو گئی۔ البتہ دُوسرے دن اخباروں میں اس قسم کی سُرخیاں چھپیں:

''مرزا غالبؔ کا روپ اختیار کر کے عوام کو دھوکہ دینے کی کوشش۔''

''نقلی مرزا غالبؔ کے خطرناک عزائم کو ناکام بنا دیا گیا۔''

''عوام، دھوکہ بازوں سے خبردار رہیں۔ غالب صدی تقاریب کمیٹی کا انتباہ۔''

لوگوں نے بہت تلاش کیا مگر پھر کہیں اِن غالب صاحب کا پتہ نہ چل سکا جو میاں میر مہدی مجروحؔ کے ہمراہ اپنے دُشمنوں کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے دوسری دنیا سے اس دنیا میں آئے تھے۔ پتہ نہیں وہ اصلی تھے یا نقلی۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(قطع کلام۔ ۱۹۶۹)

سوئز بینک میں کھاتہ ہمارا

حضرات! میں کسی مجبوری اور دباؤ کے بغیر اور پورے ہوش وحواس کے ساتھ یہ اعلان کرنا چاہتا ہوں کہ سوئزرلینڈ کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ موجود ہے۔ آپ اس بات کو نہیں مانتے نہ مانئے۔ میری بیوی بھی پہلے اس بات کو نہیں مانتی تھی۔ اب نہ صرف اس بات کو مان رہی ہے بلکہ مجھے بھی ماننے لگی ہے۔ آپ یقیناً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ جب سارے لوگ اپنے کھاتوں کو پوشیدہ رکھنے کے سو سو جتن کر رہے ہیں تو ایسے میں مجھے اپنے آپ ہی اپنے کھاتے کی موجودگی کا اعلان کرنے کی ضرورت کیوں پیش آرہی ہے اس کے لئے میں بات کو ذرا شروع سے شروع کرنا چاہتا ہوں۔ تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ ایک دن میں دفتر سے بے حد تھکا ماندہ گھر پہنچا تو بیوی نے کہا "آپ جو اتنا تھک جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ دفتر میں کام بھی کرتے ہیں۔"

میں نے کہا "بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ آدمی محنت کرنے سے ہی تو تھکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک میں نے کسی سیاستدان اور مولوی کو تھکا ماندہ نہیں پایا۔"

بولی "آدمی محنت کرتا ہے تو پھر اسے اس کا صلہ بھی ملتا ہے۔ تم جو اتنی محنت کرتے ہو تو تمہیں کیا مل رہا ہے؟"

ظاہر ہے کہ اس مشکل سوال کا آسان جواب ملک کے ماہرین معاشیات کے پاس بھی نہیں ہے تو میں کیا خاک جواب دیتا۔ سو میں خاموش ہوگیا۔ میں نے سوچا کہ تیس برس کی

رفاقت میں، مَیں نے اپنی بیوی کو روز کی خوشیاں اُسی روز دینے کے سوائے اور کیا کیا ہے۔ اس کی جھولی میں ایک ایک دن اور ایک ایک پل کے حساب سے جمع کیا ہوا تیس برسوں کے عرصہ پر پھیلا ہوا ماضی تو ہے لیکن آنے والے کل کا کوئی ایسا لمحہ نہیں ہے جسے عام زبان میں خوش آئند مستقبل کہتے ہیں۔ میں نے سوچا چلو آج اسے تھوڑا سا مستقبل بھی دے دیتے ہیں۔ لہٰذا میں نے کہا'' یہ تم کیا محنت اور اس کے صلہ کے پیچھے حیران ہو رہی ہو۔ آج میں تمہیں ایک خوش خبری سنانا چاہتا ہوں کہ سوئیزر لینڈ کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ موجود ہے۔'' یہ سنتے ہی میری بیوی کا منہ حیرت سے کھلا کا کھلا رہ گیا۔ بڑی دیر بعد جب وہ بند ہوا تو اس نے اچانک گھر دروازے اور کھڑکیاں بند کرنا شروع کر دیں۔

میں نے کہا'' یہ کیا کر رہی ہو؟''

بولی'' سوئیزر لینڈ کے بینک کے کھاتے کی بات کوئی یوں کھلم کھلا کرتا ہے۔ اگر بفرضِ محال سوئیزر لینڈ کے کسی بینک میں تمہارا کھاتہ ہے بھی تو تمہیں اس کا اعلان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر مجھے اس کھاتے کا سراغ لگانا ہو تو میں کسی خفیہ ایجنسی کے ذریعہ اس کا پتہ لگا سکتی ہوں یا پھر ایک دن ملک کے کسی اخبار میں خود بخود اس کی خبر چھپ جائے گی۔ مگر پہلے یہ بتاؤ کیا سچ مچ سوئیزر لینڈ کے بینک میں تمہارا کھاتہ موجود ہے؟'

میں نے کہا'' سچ بتاؤ آج تک میں نے کبھی تم سے جھوٹ کہا ہے۔''

بولی'' سو تو ہے۔ مگر یہ کھاتہ تم نے کھولا کب؟''

میں نے کہا'' چار سال پہلے جب میں یوروپ گیا تھا۔''

میرے اس جواب نے میری بیوی کو اور بھی حیرت میں ڈال دیا کیوں کہ اسے پتہ تھا کہ جب میں یوروپ کے لئے روانہ ہوا تھا تو میری جیب میں صرف بیس ڈالر تھے۔ اگرچہ حکومت نے مجھے اجازت دی تھی کہ اگر میں بیرونی زرمبادلہ حاصل کرنا چاہوں تو پانچ سو ڈالر تک خرید سکتا ہوں۔ لیکن بیرونی کرنسی خریدنے کے لئے پہلے مجھے ہندوستانی کرنسی کی ضرورت تھی۔ بیرونی کرنسی تو مجھے مل رہی تھی لیکن اصل سوال ہندوستانی کرنسی کا تھا۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی کرنسی کو حاصل کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ اتنے میں میری بیوی دُنیا کا نقشہ اُٹھا کر لے آئی اور بولی'' ذرا دکھاؤ تو سہی۔ یہ موا سوئیزر لینڈ ہے کہاں؟

اور اس میں ہمارا اکاؤنٹ کہاں رکھا ہوا ہے؟۔''

میں نے دُنیا کے نقشہ میں اسے سوئیزرلینڈ کو دکھانے کی کوشش شروع کردی۔لیکن کمبخت سوئیزرلینڈ اتنا چھوٹا نکلا کہ اس پر جب جب انگلی رکھتا تھا تو پورے کا پورا سوئیزرلینڈ غائب ہو جاتا تھا۔ بالآخر قلم کی نوک سے سوئیزرلینڈ کے حدود اربعہ اس پر واضح کئے تو بولی ''یہ تو اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی بینک کی عمارت شاید ہی سما سکے۔ ہمارے بینک اکاؤنٹ کے سمانے کا نمبر تو بعد میں آئے گا۔''

میں نے کہا ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ مجھے یاد ہے کہ میں اپنے دوست کے ساتھ جنوبی فرانس کے راستہ سے بذریعہ موٹر سوئیزرلینڈ میں داخل ہوا تھا۔اس ملک کا اتنا ذکر سنا تھا سوچا کہ ذرا اس ملک کے اندر پہنچ کر اس کا دیدار کر لیتے ہیں۔ میرا دوست موٹر بہت تیز چلاتا ہے۔تھوڑی دیر بعد سڑک پر کچھ سپاہیوں نے ہمیں روک لیا اور پوچھا ''کہاں کا ارادہ ہے۔''

عرض کیا ''اک ذرا سوئیزرلینڈ تک جانے کا ارادہ ہے۔''

سپاہیوں نے کہا ''قبلہ! آپ جہاں جانا چاہتے ہیں وہاں سے آپ واپس جا رہے ہیں۔''

چاروناچار ہمیں پھر سوئیزرلینڈ میں واپس ہونا پڑا اور موٹر کی رفتار دھیمی کرنی پڑی کہ کہیں ہم تیز رفتاری میں کسی اور ملک میں نہ نکل جائیں۔ بیوی نے کہا ''مگر تم تو سوئیزرلینڈ سیر سپاٹے کے لئے گئے تھے۔ وہاں کے پہاڑ اور قدرتی مناظر دیکھنے گئے تھے۔ یہ اکاؤنٹ کھولنے والا معاملہ کب ظہور میں آیا؟''

میں نے کہا ''بیگم! کان کھول کر سن لو۔ یہ پہاڑ اور قدرتی مناظر سب بہانے بنانے کی باتیں ہیں۔آج تک کوئی سوئیزرلینڈ صرف پہاڑ دیکھنے کے لئے نہیں گیا۔ پہاڑ کی آڑ میں وہ کچھ اور کرنے جاتا ہے۔ سوئیزرلینڈ کے پہاڑ اس لئے اچھے لگتے ہیں کہ ان کے دامن میں سوئیزرلینڈ کے وہ مشہور و معروف بینک ہیں جن میں اپنا پیسہ جمع کرانے والے کی بیوی تک کو معلوم نہیں ہوتا کہ اس میں اس کے شوہر کا پیسہ جمع ہے۔ ایک صاحب کہہ رہے تھے کہ بعض صورتوں میں تو خود بینک کے انتظامیہ کو بھی پتہ نہیں ہوتا کہ اس کے بینک میں کس کا کتنا پیسہ جمع ہے۔ ان بینکوں کو وہاں سے ہٹا لو تو سوئیزرلینڈ کے قدرتی مناظر اور پہاڑوں کی ساری

خوبصورتی دھری کی دھری رہ جائے۔ سچ تو یہ ہے کہ جس نے پہلگام اور گلمرگ اور پیر پنجال میں ہمالیہ کے پہاڑ دیکھے ہیں اسے سوئیزرلینڈ کے پہاڑ کیا پسند آئیں گے۔ رہی برف کی بات تو اسے تو ہم ہر روز اپنے ریفریجریٹر میں دیکھتے ہی ہیں۔ اب بتاؤ سوئیزرلینڈ میں کیا رہ جاتا ہے۔ ہاں کسی زمانے میں یہاں کی گھڑیاں بہت مشہور تھیں۔ اب جاپان نے اُن کی ایسی تیسی کردی ہے۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ سوئیزرلینڈ کی گھڑی اب ٹل چکی ہے۔ اب اس کے بینکوں میں پیسہ جمع کرنے والوں پر گھڑی آئی ہے۔ اس لئے یاد رکھو کہ جو کوئی سوئیزرلینڈ جائے گا وہاں وہ اپنا پیسہ جمع کر آئے گا۔'' بیوی نے کہا ''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم سوئیزرلینڈ صرف اپنا کھاتہ کھلوانے گئے تھے۔''

میں نے کہا'' اور کیا؟ پہاڑ دیکھنے تھوڑی گیا تھا۔''

بولی'' جب کھاتہ کھلوانا ہی تھا تو ہندوستان کے کسی بینک میں رقم جمع کراتے۔''

میں نے کہا'' کیا تم نہیں جانتیں کہ ہمارے بینکوں کی کیا حالت ہے۔ آئے دن تو ڈاکے پڑتے رہتے ہیں۔ لوگ بینکوں کے کھلنے کا اتنا انتظار نہیں کرتے جتنا کہ ڈاکو ان بینکوں کے بند ہونے کا انتظار کرتے ہیں۔ پھر سوئیزرلینڈ میں بینک کا کھاتہ کھولنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔''

اور یوں میں نے ایک خوش آئند مستقبل کے کچھ لمحے اپنی بیوی کو سونپ دیئے۔ اس بات کو ہوئے تین مہینے بیت گئے۔ نہ تو اس نے مجھ سے اکاؤنٹ نمبر پوچھا۔ نہ اکاؤنٹ کا خفیہ نام اور نہ ہی یہ پوچھا کہ اس اکاؤنٹ میں کتنی رقم جمع ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پچھلے تین مہینوں سے وہ بہت خوش ہے۔ اس کی زندگی میں ایک ایسا خوشگوار اعتماد پیدا ہو چکا ہے جس کی نظیر پچھلے تیس برسوں میں مجھے کبھی نظر نہ آئی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس اعتراف کے بعد میں اپنے آپ میں اعتماد کی کمی محسوس کر رہا ہوں۔

حضرات! یہ تو آپ بخوبی جانتے ہیں کہ بینکوں سے میرا کتنا تعلق ہو سکتا ہے۔ ایک محفل میں ایک مشہور و معروف ادیب سے ایک مشہور و معروف بینکر کا تعارف کرایا گیا تو بینکر نے ادیب سے کہا'' آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ میں نے آج تک آپ کی کوئی کتاب نہیں پڑھی۔''

اس پر ادیب نے کہا ''مجھے بھی آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی لیکن میری بدقسمتی یہ ہے کہ آج تک میں کسی بینک میں داخل نہیں ہوا۔''

میں اتنا بڑا ادیب تو خیر نہیں ہوں کہ کبھی کسی بینک میں قدم ہی نہ رکھ پاؤں۔ میں بینک ضرور جاتا ہوں۔ بینک میں میرا کھاتہ بھی موجود ہے۔ میری تنخواہ چونکہ چیک سے ملتی ہے اسی لئے بینک میں کھاتہ کھولنا ضروری تھا۔ یہ اور بات ہے کہ میرا کھاتہ، میرا اور میری بیوی کا ''جوائنٹ اکاؤنٹ'' ہے۔ اس جوائنٹ اکاؤنٹ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں رقم جمع کرنے کی ذمہ داری تو میری ہوتی ہے مگر اس میں سے رقم نکالنے کا خوشگوار فریضہ میری بیوی کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اندرون ملک اپنی تو یہ مالی حالت ہے کہ کوئی آفت کا مارا مجھ سے بیس پچیس روپے بھی اُدھار مانگتا ہے تو میں اس کا بے حد شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اسے رقم تو نہیں دیتا البتہ شکریہ اس بات کا ادا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس قابل تو سمجھتا ہے کہ مجھ سے بیس پچیس روپے اُدھار مانگے جاسکیں۔

اس صورتِ حال کے باوجود سوئیز رلینڈ کے بینک میں میرا کھاتہ موجود ہے اور اس معاملہ کو آپ سب کے سامنے رکھنے کی وجہ صرف اتنی ہے کہ پچھلے تین مہینوں سے میں عجیب و غریب کیفیت سے گزر رہا ہوں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ میں نے پوری رازداری اور ایمانداری کے ساتھ اپنے کھاتہ کی اطلاع اپنی بیوی کو دی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ وہ خاندان کے اس راز کو اپنے سینے میں چھپائے رکھے گی۔ مگر رفتہ رفتہ مجھے احساس ہونے لگا کہ اس راز کی روشنی میرے گھر کے اطراف دھیرے دھیرے پھیلنے لگی ہے۔ ایک مہینے پہلے کی بات ہے۔ میں محلّہ کی ایک دوکان سے موزے خریدنے گیا تھا۔ مجھے موزوں کی ایک جوڑی پسند تو آئی لیکن دُکاندار نے اس کی جو قیمت بتائی وہ ہندوستان میں میرے موجودہ بینک بیلنس کی بساط سے باہر تھی۔ دُکاندار نے مجھے آنکھ مار کر کہا ''صاحب آپ یہ موزے لے لیجئے۔ بیس پچیس روپے کے فرق پر نہ جائیے۔ باقی پیسے بعد میں دیجئے جب سوئیز رلینڈ سے آپ کا پیسہ آجائے گا۔'' تھوڑی دیر کے لئے میں چونک سا گیا لیکن سوچا کہ اُن دنوں چونکہ سوئیز رلینڈ کے بینکوں کا بہت چرچا ہے اس لئے دُکاندار نے مذاق میں یہ بات کہی ہوگی۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ محلّہ کے وہ لوگ جو مجھ سے منہ چھپاتے تھے یا مجھ سے کتراتے تھے نہ صرف اپنا منہ دکھانے

لگے ہیں بلکہ ضرورت سے زیادہ سلام بھی کرنے لگے ہیں۔ پڑوسیوں کے بارے میں تو آپ جانتے ہیں کہ یہ صرف آپ کی خوشیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اور اگر آپ کی زندگی میں دُکھ نہ ہو تو اُنہیں پیدا کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں۔ یہ پڑوسی اب مجھے عجیب وغریب نظروں سے دیکھتے ہیں۔ میرے ایک پڑوسی کپڑے کا کاروبار کرتے ہیں لیکن کاروبار کرنے کا ڈھنگ کچھ ایسا ہے جیسے سارے ملک کو ننگا کر کے چھوڑیں گے۔ پیسے کی وہ ریل پیل ہے کہ نہ جانے اتنا پیسہ کہاں رکھتے ہیں۔ بیس برسوں کے پڑوسی ہیں لیکن اُن سے تعلقات صرف پچھلے دو مہینوں میں ہی قائم ہوئے۔ ان کی بیوی اُن دنوں میری بیوی کی سب سے اچھی اور چہیتی سہیلی بنی ہوئی ہے۔ دو تین مرتبہ مجھے بھی اپنے گھر بلا چکے ہیں۔ جب بھی بلاتے ہیں میرے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں جو اہلِ غرض بے ایمان وزیروں کے ساتھ روا رکھتے ہیں۔ پچھلے ہفتہ میری بیوی نے بتایا کہ میرے پڑوسی کی بیوی اُس سے یہ جاننا چاہتی ہے کہ سوئیزر لینڈ کے بینک میں کھاتہ کھولنے کا کیا طریقہ ہے۔

میں نے کہا ''انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میرا کھاتہ سوئیزر لینڈ کے بینک میں موجود ہے۔''

بیوی نے کہا ''تم بھی کیسی باتیں کرتے ہو۔ اُنہیں کیسے پتہ چل سکتا ہے کہ سوئیزر لینڈ کے بینک میں تمہارا کھاتہ ہے۔ تم چونکہ پڑھے لکھے آدمی ہو اسی لئے تم سے کھاتہ کھولنے کا طریقہ جاننا چاہتے ہوں گے۔ بتانے میں کیا حرج ہے۔ آخر کو پڑوسی ہیں۔''

میں نے کہا ''پڑوسی تو بیس برس سے ہیں۔ لیکن پڑوسیوں کا سا سلوک صرف پچھلے دو مہینوں سے کیوں کر رہے ہیں؟'' پھر بھی میں نے کھاتہ کھولنے کا طریقہ اُنہیں بتا دیا۔ یہاں تک تو خیر ٹھیک تھا۔ پرسوں ایک عجیب وغریب واقعہ پیش آیا۔ میں صبح ڈرائنگ رُوم میں بیٹھا داڑھی بنا رہا تھا کہ ایک بھکاری حسبِ معمول میرے گھر پر آواز لگانے لگا۔ دُوسرے بھکاری نے جو میرے پڑوسی کے گھر پر کھڑا تھا میرے گھر کے سامنے کھڑے ہوئے بھکاری سے کہا ''میاں! اس گھر پر آواز لگا کر کیوں اپنا وقت اور گلا ضائع کرتے ہو۔ اُن کا تو سارا پیسہ سوئیزر لینڈ میں ہے۔ ناحق کیوں اُنہیں تنگ کرتے ہو۔'' پانی اب میرے سر سے اُونچا ہو چکا تھا۔ میں نے فوراً اپنی بیوی کو طلب کیا اور کہا ''تمہیں یاد ہوگا کہ تین مہینے پہلے میں نے تمہیں

اس راز سے واقف کرایا تھا کہ سوئیزر لینڈ کے ایک بینک میں میرا اکاؤنٹ موجود ہے۔''

بیوی نے کہا ''یادرکھنے کی بات کرتے ہو۔ میں تو دن کے چوبیسوں گھنٹے اس بات کو یادرکھتی ہوں۔ تمہیں اب اچانک اس اکاؤنٹ کی کیوں یاد آگئی۔ تم نے پہلی بار اپنے اکاؤنٹ کا جواعتراف کیا تھا کیا وہ غلط تھا؟''

میں نے کہا ''غلط تو نہیں تھا مگر میرا اعتراف ادھورا تھا۔ میں نے تمہیں اپنے کھاتے کا نمبر، کھاتے کا خفیہ نام اور کھاتے میں جمع رقم کے بارے میں کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔''

بیوی نے کہا ''میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ تمہارے کھاتے کا نمبر چار سو بیس ہے، کھاتہ کا خفیہ نام ''گوبھی کا پھول'' ہے اور یہ کہ اس کھاتے میں سوئیزر لینڈ کے صرف دس مارک جمع ہیں۔''

میں نے حیرت سے پوچھا ''تمہیں کس نے بتایا؟''

بولی ''میں نے اس سلسلہ میں ایک خفیہ ایجنسی کی خدمات حاصل کی تھیں۔ 'فیر سیکس' نام ہے اس کا۔ سوئیزر لینڈ کے کھاتوں کا سراغ اسی طرح لگایا جاتا ہے۔'' میں نے کہا ''بات دراصل یہ تھی کہ سوئیزر لینڈ میں جب مجھے دیکھنے کو کچھ بھی نہیں ملا اور وہاں سے واپس چلتے وقت میری جیب میں دس سوئس مارک بچ رہے تو میں نے سوچا کہ کیوں نہ اس رقم کو سوئیزر لینڈ کے کسی بینک میں جمع کرادوں۔ ہندوستان میں یہ سہولت ہے کہ کسی تاریخی مقام کو دیکھنے جاتے ہیں تو اس مقام پر اپنا نام بھی لکھ کر آسکتے ہیں تاکہ نہ صرف سند رہے بلکہ اپنی نشانی بھی موجود رہے۔ سوئیزر لینڈ میں مجھے یہ سہولت بھی میسر نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے نشانی کے طور پر اپنا اکاؤنٹ کھول دیا۔ یہ کوئی اہمیت کی بات نہیں ہے اور تمہیں بھی اسے اہمیت نہیں دینا چاہئے۔ اب تو میں اس اکاؤنٹ کو بند کرنے کی سوچ رہا ہوں۔''

بیوی نے کہا ''خبردار! جو اس اکاؤنٹ کو بند کیا تو۔ آج سے اسے بھی جوائنٹ اکاؤنٹ ہی سمجھو۔ اُن دنوں سماج میں عزت اُسی کی ہے جس کا سوئیزر لینڈ کے بینکوں میں اکاؤنٹ ہو۔ چار برس پہلے جب تم سوئیزر لینڈ گئے تھے تو ہندوستان میں سوئیزر لینڈ کے بینکوں کا اتنا کریز نہیں تھا۔ تم نے تو جذباتی ہوکر غفلت میں اس اکاؤنٹ کو کھولا تھا۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ کبھی تمہاری غفلت سے فائدہ بھی پہنچ سکتا ہے۔ تم یقین کرو سوئیزر لینڈ کے بینک میں جمع

کئے ہوئے تمہارے دس سوئیز مارک، ہندوستان میں دس کروڑ کے برابر ہیں۔ دیکھتے نہیں سماج میں تمہاری کتنی عزت ہورہی ہے۔ کتنی تو دعوتیں کھا چکے ہو۔ دکاندار اُدھار تک دینے لگے ہیں۔ جو لوگ برابری کے ساتھ ملتے تھے وہ اب جُھک جُھک کر ملنے لگے ہیں۔ اور تو اور محلّہ کے لیڈیز کلب کی چیئر پرسن کے طور پر آج میرا بلا مقابلہ انتخاب ہونے والا ہے۔ یہ سب کس کی بدولت ہے۔ ذرا سوچو تو۔ ملک کے سارے شرفا اب اپنے اکاؤنٹ سوئیز رلینڈ کے بینکوں میں کھولنے لگے ہیں اور تم اپنا کھاتہ بند کرنے چلے ہو۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ ایک اتفاقی غلطی سے تمہارا شمار بھی شرفا میں ہونے لگا ہے۔ ورنہ زندگی بھر یونہی جوتیاں چٹخاتے پھرتے۔ یہ میری گزارش نہیں حکم ہے کہ یہ اکاؤنٹ اب بند نہیں ہوگا۔''

یہ کہہ کر میری بیوی لیڈیز کلب کی چیئر پرسن کے انتخاب میں حصہ لینے کے لئے چلی گئی اور میں دُنیا کے نقشہ میں پھر سے سوئیز رلینڈ کو تلاش کرنے لگا۔

(آخر کار۔ ۱۹۹۷)

ابھینیتا نیتا بن گئے

ابھی نیتا اے بی سی ڈی نے جب سو فلموں میں کام کرلیا اور ملک پر سے جمہوریت کے تینتیس برس بیت گئے تو ایک دن اُس کے کانوں میں غیب سے آواز آئی ''اے، اے بی سی ڈی! اپنے چہرے سے میک اَپ اُتار اور کر دیش کی سیوا۔''

اے بی سی ڈی نے سوچا یہ فلم ڈائریکٹر کی آواز ہے۔ تینتیس برس کی جمہوریت کے بعد جب لیڈروں نے جنتا کی آواز کو سننا چھوڑ دیا ہے تو میں سو فلموں میں کام کرنے کے بعد ڈائریکٹر کی آواز کیوں سنوں؟۔ وہ انجان بن گیا تو پھر آواز آئی ''کیا تو ہماری آواز سُن رہا ہے؟۔ میں فلم کا ڈائریکٹر نہیں، سارے جگ کا ڈائریکٹر بول رہا ہوں۔ اُٹھ اور کر دیش کی سیوا۔''

اب کی بار اے بی سی ڈی نے تھر تھر کانپتے ہوئے کہا ''پربھو! آپ کا حکم سر آنکھوں پر، مگر یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں تو ساری زندگی ابھی نیتا بنا رہا، اب نیتا کیوں کر بن سکتا ہوں۔''

آواز آئی ''اے بی سی ڈی! ہماری نیتی ہی نرالی ہے۔ ہم بعض اوقات غلط آدمی سے صحیح کام اور صحیح آدمی سے غلط کام لے لیتے ہیں۔ تجھے اسی وقت اور ابھی ابھینیتا سے نیتا بننا ہوگا۔ نیتا جب دس پارٹیاں بدلتا ہے تو وہ نیتا نہیں ابھی نیتا بن جاتا ہے، اسی طرح کوئی ابھی نیتا سو فلموں میں کام کر لیتا ہے تو اُسے بھی نیتا بن جانے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔ کیا تو نہیں جانتا کہ بلّی تک سو چوہے کھانے کے بعد حج کو چلی جاتی ہے۔ تیری بھی اب سو فلمیں پوری

ہوگئیں۔اب کر دیش کی سیوا، ورنہ تیری ساری فلمیں فلاپ کرادوں گا___"

اے بی سی ڈی نے کہا" پربھو! بڑے جوردار ڈائیلاگ بول رہے ہو، سلیم جاوید کے لکھے معلوم پڑتے ہیں۔"

زور کی آواز آئی" بدتمیز! اپنی زبان کو لگام دے۔کیا تو ہمیں اپنی طرح سمجھتا ہے کہ جب تک ڈائیلاگ رائیٹر پانی مانگنے کا ڈائیلاگ نہ لکھ کر دے تب تک پانی بھی نہیں مانگ سکتا اور پیاسا رہ جاتا ہے۔"

اے بی سی ڈی نے گھبرا کر کہا" شما کیجئے پربھو! مجھ سے غلطی ہوگئی۔اب میں دیش کی سیوا کروں گا مگر یہ تو بتائیے کہ دیش کی سیوا کیسے کی جاتی ہے۔ میں تو سیاست جمہوریت اور سوشلزم اور نہ جانے کیا کیا ہوتا ہے اس کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔"

پربھو بولے" کیا تو سمجھتا ہے کہ جو نیتا لوگ ہوتے ہیں وہ سیاست اور جمہوریت کے بارے میں کچھ جانتے ہیں، ارے یہ بھی کچھ نہیں جانتے۔صرف جاننے کی ایکٹنگ کرتے ہیں۔سیاست میں جو جتنا کم جانتا ہے اتنا ہی کامیاب نیتا بنتا ہے۔آج کے نیتا لوگ گاندھی جی کے بارے میں اتنا ہی جانتے ہیں جتنا کہ ایٹن برو نے اپنی فلم" گاندھی" میں بتایا ہے۔وہ بھی ہندی میں اس فلم کو دیکھتے ہیں تو اُن کی سمجھ میں آتا ہے۔انگریزی میں دیکھیں تو اتنا بھی نہ جان پائیں۔تو نے دیکھا نہیں اب لوگ گاندھی جی کی صرف ایکٹنگ کی تعریف کررہے ہیں، دیش کے لیے اُن کی قربانی کی کوئی تعریف نہیں کرتا۔ پہلے ہم نیتا بناتے تھے تو اس کی شخصیت میں سچائی، حب الوطنی اور ایمانداری کی ملاوٹ بھی کردیتے تھے مگر بعد میں جب ہم نے دیکھا کہ ملک میں جمہوریت آگئی ہے تو سوچا کہ اب ہم کیوں نیتاؤں کو بنانے میں اپنا وقت برباد کریں۔اس معاملہ میں ہم نے غیر جانب داری کی پالیسی اپنائی۔ہم نے کہا اب جنتا اور نیتا دونوں مل کر ایک دوسرے کو بناتے رہیں۔لہٰذا پچھلے کئی برسوں سے ہم نے نیتاؤں کو بنانا چھوڑ، ابھی نیتاؤں کو بنانا شروع کردیا۔یہی وجہ ہے کہ آج فلم انڈسٹری نے اتنی ترقی کرلی ہے اور سیاست کا یہ حال ہوگیا ہے کہ بُری سے بُری فلم کی سلور جوبلی ہوجاتی ہے اور اچھی سے اچھی سرکار چند ہفتوں میں ٹوٹ جاتی ہے۔"

اے بی سی ڈی نے کہا " پربھو! اب آپ پھر سے نیتا بنانا کیوں شروع

نہیں کر دیتے؟''

پر بھو بولے'' وہی تو کر رہا ہوں، اب نئے نیتا بنانا شروع کروں گا تو وہ اٹھارہ سال میں بالغ ہوں گے اور اکیس سال بعد ووٹ دینے کے قابل ہوں گے۔ اسی لیے کام چلانے کی خاطر اس وقت تک ابھی نیتاؤں سے نیتاؤں کا کام لینا چاہتا ہوں۔''

اے بی سی ڈی نے کہا'' مگر مجھے سیاست کا کوئی تجربہ نہیں ہے؟''

پر بھو بولے'' مگر ہم نے امریکہ میں ایک ابھی نیتا کو نیتا بنانے کا کامیاب تجربہ کیا ہے، کیا تو نہیں جانتا کہ امریکہ میں ایک ابھی نیتا کی سرکار باکس آفس پر ہٹ جا رہی ہے۔ ہم نے یہ تجربہ امریکہ میں اس لیے کیا تھا کہ ہندوستان کے ابھی نیتا بھی اس کی نقل کریں۔ کیوں کہ ہندوستان کی اکثر فلمیں ہالی وڈ کی فلموں کی کاپی ہوتی ہیں۔ تجھے تو اپنے آپ ہی نیتا بن جانا چاہیے تھا۔ ہمارے یاد دلانے کی ضرورت نہیں تھی۔''

اے بی سی ڈی نے کہا'' مگر پر بھو! میری سرکار کی پالیسی کیا ہوگی اور میں کس کی سیوا کروں گا؟''

پر بھو بولے'' پالیسی کے چکر میں نہ پڑ، نیتا لوگ پالیسی بناتے ہی اس لیے ہیں کہ جنتا کو پالیسی کی بھول بھلیوں میں اُلجھا کر خود دیش کی سیوا سے بچے رہیں۔ تجھے صرف سیوا کرنا ہے اور اُن ہی لوگوں کی سیوا کرنا ہے جو تیری فلمیں تیسرے درجے میں بیٹھ کر دیکھتے ہیں اور تیری ایک ایک ادا پر سیٹیاں بجا کر داد دیتے ہیں۔ تو سیٹیاں بجانے والوں کی سیوا کرے گا تو دیش میں سوشلزم آ سکتا ہے۔ یہ لوگ تیری فلمیں دیکھتے ہی اس لیے ہیں کہ دیش میں سوشلزم نہیں آ رہا ہے۔ اگر نیتا اس دیش میں سوشلزم کو لے آتے تو تیری فلمیں سلور جوبلی اور گولڈن جوبلی نہ مناتیں۔ تجھے تو نیتاؤں کا مشکور ہونا چاہیے کہ اُن کے نکمے پن کا تجھے فائدہ مِل رہا ہے۔''

اے بی سی ڈی نے کہا'' سیاست میں تو بہت بولنا پڑتا ہے، میں کیسے بول پاؤں گا۔''

پر بھو بولے'' فکر نہ کر۔ ہم تیرے لیے ایک ڈائیلاگ رائٹر کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ اے مورکھ! کیا تجھے اتنا بھی نہیں معلوم کہ سیاست میں بھی'' بیک گراؤنڈ میوزک'' چلتی ہے، بلکہ فلموں سے کہیں زیادہ چلتی ہے۔ دُنیا کے کئی ملکوں کی طرف دیکھ کہ دیکھنے میں تو آزاد

ملک ہیں لیکن اُن کے پیچھے یا تو امریکہ کی بیک گراؤنڈ میوزک چلتی ہے یا روس کی۔ اب عالمی سیاست میں ایک نئی بیک گراؤنڈ میوزک بھی چل پڑی ہے تو نے سنی ہوگی۔ اسے ''نون الائنڈ بیک گراؤنڈ میوزک'' کہتے ہیں۔ اس میوزک کی خوبی یہ ہے کہ اس میں ہر کوئی اپنی ڈفلی بجا سکتا ہے۔''

اے بی سی ڈی نے کہا ''پربھو! آپ کی باتیں اب کچھ کچھ میرے پلّے پڑنے لگی ہیں۔ آپ کا حکم ہے کہ میں ملک میں سوشلزم کو لے آؤں مگر مجھے یہ تو بتائیے کہ سوشلزم کیا ہوتا ہے، کتنی ٹانگیں ہوتی ہیں اس کی؟ ناک کیسی ہوتی ہے؟ سوشلزم ویجیٹرین ہوتا ہے یا نان ویجیٹرین؟''

پربھو بولے ''یہ سارا لفڑا نیتاؤں نے کھڑا کیا ہے۔ سوشلزم تو سیدھی سادھی سی چیز ہے مگر نیتاؤں نے سوشلزم کے ایسے طوطا مینا بنائے کہ اب تو اُس کی ٹانگیں تک ڈھونڈنے لگا ہے۔ نیتاؤں نے اپنی کرسی کی ٹانگوں کو سلامت رکھنے کے لئے سوشلزم کے بھی ٹانگیں لگا دیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ اُنہیں سوشلزم تک چل کر جانے کی زحمت نہ ہو بلکہ سوشلزم خود چل کر اُن کے پاس آئے۔ سوشلزم کو جاننے کے لیے بڑی بڑی کتابیں بالکل نہ پڑھ، فلم ''پیاسا'' دیکھ لے۔ ''دو بیگھے زمین'' اور اسی طرح کی دو ایک فلمیں دیکھ لے اور لے آ دیش میں سوشلزم۔''

اے بی سی ڈی نے کہا ''بہت اچھا پربھو! میں یہ فلمیں پھر ایک بار دیکھ لوں گا۔ سوشلزم کا مسئلہ تو حل ہو گیا۔ یہ بتائیے میں اپنی سرکار کی کاسٹ کیسے بناؤں؟''

پربھو بولے ''ابے سرکار کی کاسٹ نہیں بلکہ کیبنٹ ہوتی ہے۔ ویسے فلم کی کاسٹ اور سرکار کی کیبنٹ میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ہر آدمی کو مناسب کام دینا پڑتا ہے۔''

اے بی سی ڈی نے کہا ''سرکار! آج ملک میں انتشار بہت پھیلا ہوا ہے۔ اگر میں اپنی سرکار بنانے میں کامیاب ہو گیا تو اپنا وزیرِ داخلہ کسے بناؤں؟''

پربھو بولے ''اسی کو وزیرِ داخلہ بنانا جو تیری فلموں میں ولن کا کام کرتا رہا ہے۔ جنتا نے اسی کو فلموں میں دیکھ دیکھ کر غنڈہ گردی اور مار دھاڑ سیکھی ہے۔ اب اسی سے کہہ کہ سماج میں اُسی کی لائی ہوئی خرابیوں کو دُور کر دے، مگر ایک بات کا خیال رکھنا، تیری فلموں میں پولیس

ہمیشہ اس وقت آتی ہے جب ہیرو دُشمن کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ تیری سرکار میں یہ بات نہیں چلے گی۔ یہاں پولیس کو پہلے آنا ہوگا اور ہیرو بعد میں آئے گا۔''

اے بی سی ڈی نے کہا'' سرکار! اس کا مطلب یہ ہوا کہ مجھے ڈشوم ڈشوم کرنے کا کوئی موقع نہیں ملے گا۔ پھر میری سرکار میں ہیرو کا کیا کام ہوگا۔''

پربھو بولے'' فلم میں ہیرو کو بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔ سیاست میں ہیرو خود کام نہیں کرتا، دوسروں سے کام کرواتا ہے۔''

اے بی سی ڈی نے پوچھا'' پربھو! میری سرکار کی ہیروئن کون ہوگی؟''

پربھو بولے'' تیری سرکار کی ہیروئن جنتا ہوگی جنتا! تجھے ہر مشکل سے اپنی ہیروئن کو بچانا ہوگا۔''

اے بی سی ڈی نے منہ بنا کر کہا'' سرکار! بڑی بُری ہیروئن ہوگی۔ کوئی اچھی شکل والی نہیں مِل سکتی۔ مجھے تو ہیروئن کے ساتھ ناچنا بھی ہوگا اور گانا بھی۔ کیا نئی ہیروئن یہ سب کرے گی۔''

پربھو بولے'' تو اپنی ہیروئن کی چند دن سیوا کر کے دیکھ لے، ارے میں تو کہتا ہوں اتنے کم معاوضہ پر اس سے اچھی ہیروئن تجھے آج تک نہ ملی ہوگی۔''

اے بی سی ڈی نے کہا__ '' جب میری سرکار کی ہیروئن ہوگی تو کیا میری سرکار میں سائڈ ہیرو، وِلن، کامیڈین اور اکسٹراز بھی ہوں گے۔''

پربھو بولے'' یقیناً ہوں گے بلکہ اس ملک میں سیاست ناکام ہی اس لیے ہوئی کہ اس میں سائڈ ہیروز، ولن اور کامیڈین کی گنجائش باقی نہیں رہ گئی تھی۔ البتہ اپنی سرکار میں اکسٹراز کو ذرا دیکھ بھال کر رکھنا۔ سیاست میں اکسٹراز کو '' چمچے'' کہتے ہیں۔ بہت دھاندلی مچاتے ہیں۔ چمچے بعد میں اتنے طاقتور ہو جاتے ہیں کہ خود سرکار کو چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

اے بی سی ڈی نے کہا'' پربھو! آپ کا حکم ہے تو میں ابھی نیتا بن جاتا ہوں لیکن یہ بتایئے میں اپنی سرکار کتنے ریل کی بناؤں۔ صرف بالغوں کے لیے بناؤں یا ایسی سرکار بناؤں جسے بچے بوڑھے سب دیکھ سکیں اور آخری بات یہ بتائیں کہ میری سرکار کا میڈ ی

ہوگی یا ٹریجڈی؟ ـ"

پربھو بولے" اے بی سی ڈی! تو بہت زیادہ سوالات پوچھتا ہے۔ پہلے تو ابھی نیتا سے نیتا بن جا۔ تو اگر سرکار بنانے میں کامیاب ہوگیا تو تب ہم تجھے بتائیں گے کہ تیری سرکار کتنے ریل کی ہوگی، انٹرول کب ہوگا، ٹریجڈی ہوگی یا کامیڈی؟ اس کا فیصلہ ہم اسی وقت کریں گے۔ اس وقت ہم جلدی میں ہیں۔ ہمیں دُنیا کے اور بھی کئی کام کرنے ہیں۔"

پربھو جانے لگے تو اے بی سی ڈی نے کہا" مجھے آشیرواد دیجئے اور جانے سے پہلے ایک وعدہ کر جایئے کہ اگر میں سرکار بنانے میں کامیاب ہوگیا تو آپ اس کے مہورت اور پریمیر میں ضرور آئیں گے۔"

پربھو نے کہا" ہم ضرور آئیں گے" ____ اور یہ کہہ کر پربھو غائب ہوگئے۔

☆

اے بی سی ڈی نے اپنے چہرے سے میک اپ اُتارا اور ابھی نیتا سے نیتا بن گیا۔ جب وہ نیتا بن گیا تو پرانے نیتاؤں نے اُس کا خوب مذاق اُڑایا۔ مگر وہ بھی دُھن کا پکّا تھا۔ اپنے آپ کو نیتا ثابت کرنے میں اُسے کئی مہینے لگ گئے۔ اُس نے بیچ میں کئی بار پربھو کو پکارا کیوں کہ اسے کئی معاملوں میں اُن کی صلاح لینی تھی مگر پربھو شاید دُوسرے کاموں میں مصروف ہوگئے۔ بالآخر ایک دن اے بی سی ڈی نے اپنی سرکار بنالی۔ ہر طرف اس کی جے جے کار ہونے لگی۔ جس دن اُس کی سرکار کا مہورت تھا اُس دن وہ بہت خوش تھا۔ اتنا خوش کہ اسے اپنی سرکار کے مہورت پر پربھو کے آنے کا وعدہ یاد ہی نہ رہا۔ اس کی سرکار کی شوٹنگ شروع ہونے والی تھی، کیمرہ مین تیار کھڑے تھے کہ اے بی سی ڈی کے کانوں میں پربھو کی آواز آئی " اے بی سی ڈی! تجھے مبارک ہو، تو اپنی سرکار بنانے میں کامیاب ہوگیا۔ ہم وعدے کے مطابق تیری سرکار کا مہورت کرنے آئے ہیں۔"

اے بی سی ڈی نے گھبرا کر کہا" پربھو آپ اتنے دن کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے آپ کو بہت آوازیں دیں مگر آپ نہیں آئے۔ آپ سے اپنی سرکار کا مہورت کروانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ مجھے اب بھی یاد ہے مگر پربھو آپ نے بہت دیر کردی۔ میں نیتا بن کر سرکار بنانے چلا تو احساس ہوا کہ فلموں کی طرح سیاست میں بھی ایک فینانسر کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں

نے آپ سے سیاست کی ساری باتیں تو پوچھ لی تھیں مگر فینانسر کے بارے میں پوچھنا بھول گیا تھا۔ ایک منزل وہ بھی آئی جب میں فینانسر کی مدد کے بغیر نیتا کی حیثیت سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا سکتا تھا۔ لہٰذا مجبور ہو کر ایک فینانسر کی مدد حاصل کی اور اس سے وعدہ کرلیا کہ اگر میں نے سرکار بنالی تو اپنی سرکار کا مہورت اُسی سے کراؤں گا۔ میں مجبور تھا پر بھو! چنانچہ اب وہ فینانسر میری سرکار کا مہورت کرنے کے لیے آ گیا ہے۔ میں آپ کو یہ چانس نہیں دے سکتا۔ اگلی بار اگر پھر سرکار بناؤں گا تو آپ کو ضرور موقع دوں گا۔''

پربھو نے غصہ سے کہا'' اے بی سی ڈی! ہمیں تجھ سے یہ امید نہیں تھی۔ تو نے بڑی غلطی کی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ تیری سرکار گولڈن جوبلی منائے مگر تو فینانسر کے چکّر میں پھنس گیا۔ اب تیری سرکار بہت جلد مارننگ شو میں لگ جائے گی۔ یہ میرا شراپ ہے۔''

اے بی سی ڈی نے کہا'' پربھو! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مجھے معاف کیجیے۔''

مگر پربھو غصہ میں آکر چلے گئے۔ وہ جانے لگے تو اُن کی نظر ایک فلم اسٹوڈیو پر پڑی جس کے آگے سارے سابق نیتا کھڑے تھے۔

پربھو نے پوچھا'' تم لوگ یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

نیتاؤں نے کہا'' ہماری سرکار چھن گئی ہے۔ اب ہم یہاں فلموں میں کام تلاش کرنے آئے ہیں۔ ہماری کچھ مدد کیجیے۔''

پربھو بولے'' میری مدد لے کر کیا کروگے؟۔ کسی فینانسر کو پکڑو۔ اب دُنیا کے سارے کام مجھ سے نہیں فینانسر سے چلتے ہیں۔ تم جو چاہو سو کرو۔ میں تو اب اس دھرتی کے کاروبار میں'' نان الائینڈ'' رہنا چاہتا ہوں۔''

یہ کہہ کر پربھو پھر سے غائب ہوگئے۔ دوستو! اب پربھو سیاست کے معاملے میں نیتاؤں اور ابھی نیتاؤں دونوں سے مایوس ہوگئے ہیں۔ کیا عجب کہ اب کی بار وہ ادیبوں کو سرکار بنانے کا موقع دیں۔ لہٰذا ادیبو! ہوشیار رہو اور ابھی سے ایک فینانسر کو پکڑ رکھو!!

(الغرض۔ ۱۹۸۷)

لوٹ پیچھے کی طرف

قاضی غیاث الدین سے پہلی بار میں کافی ہاؤس میں ملا تھا۔ کافی ہاؤس کے سوائے اُن سے کہیں اور ملاقات ہو بھی نہیں سکتی تھی کیوں کہ ناپسندیدہ اشخاص صرف کافی ہاؤس میں ہی پائے جاتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے قاضی غیاث الدین سے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا ــــ ''اِن سے ملئے۔ یہ قاضی غیاث الدین ہیں، مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ ــــ'' میں نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا تو میرے دوست نے اچک کر میرے ہاتھ کو پکڑتے ہوئے کہا: ''یہ کیا غضب کرتے ہو، کیا تمہیں نہیں معلوم کہ قاضی صاحب کسی سے مصافحہ نہیں کرتے۔ اُن کے سیدھے ہاتھ نے ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کے آخری وائسرائے اور پہلے گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے پہلا اور آخری مصافحہ کیا تھا۔ اس کے بعد سے اب تک انہوں نے اس تاریخی مصافحہ کو اپنے ہاتھ میں محفوظ رکھا ہے۔ وہ اس تاریخی اور جغرافیائی مصافحہ کو ہم جیسے نتھو خیروں کے مصافحوں سے ملوّث کرنا نہیں چاہتے۔''

میں نے قاضی غیاث الدین کے ہاتھ میں چُھپے ہوئے مصافحہ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی مگر مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔ قاضی صاحب میرا مطلب سمجھ گئے اور بولے ''میاں! یہ مصافحہ تمہیں یوں ننگی آنکھ سے دکھائی نہیں دے گا۔ اس کے لیے ایک ماہرِ آثارِ قدیمہ کی آنکھ درکار ہے۔ ایسی آنکھ جو آگے نہیں پیچھے کی طرف دیکھتی ہو۔ کہنے کو تو میں اس وقت بیسویں صدی کے اس کافی ہاؤس میں بیٹھا ہوا ہوں مگر میری اُلٹی آنکھیں پانی

پت کے میدان میں گھوڑوں کو دوڑتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ نادر شاہ کا قتلِ عام میری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ دیکھتے نہیں، میری آنکھوں میں کتنا خون اُتر آیا ہے اور یہ دیکھو کہ بابل و نینوا کی سینکڑوں برس پرانی تہذیب اب میری آنکھوں میں انگڑائی لینے لگی ہے۔'' پھر آنکھ مار کر انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے بولے__ ''وہ دیکھو، ایمفی تھیٹروں میں حسینائیں کس شان سے چہل قدمی کر رہی ہیں۔'' میں نے اُن کی اُنگلی کی سیدھ میں دیکھا، وہاں چند ہپی لڑکے اور لڑکیاں چرس اور بھنگ سے فارغ ہونے کے بعد خوش فعلیوں میں مصروف تھے۔

میں نے کہا__ ''قاضی صاحب! آپ کی یہ اُلٹی بینائی تو بہت تیز ہے، ایک ہی نظر میں پانی پت کے میدان، بابل و نینوا کی تہذیب اور روم کے ایمفی تھیٹروں کو بھگتا لیتی ہے۔''

بولے ''میاں! اس مخصوص بصارت کو حاصل کرنے کے لیے آدمی کو بڑا ریاض کرنا پڑتا ہے۔ ع این بصارت بزورِ بازو نیست۔''

یہ کہہ کر قاضی غیاث الدین نے اپنی آنکھوں پر سے وہ عینک اُتار دی جس کے فریم میں سوڈے کی بوتلوں کے پیندے جُڑے ہوئے تھے۔ عینک کے اُترنے کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوا کہ اب کی بار میری بصارت ٹھیک ہوگئی اور اُن کی ایک مصنوعی آنکھ مجھے صاف دکھائی دینے لگی۔

میں نے بات کا رُخ موڑتے ہوئے کہا ''قاضی صاحب! کافی پینے کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

میرے دوست نے پھر مداخلت کرتے ہوئے کہا: ''دیکھتے نہیں! قاضی صاحب کے سامنے کافی کا وہ پیالہ رکھا ہوا ہے جو اُنہوں نے صبح میں منگوایا تھا۔ قاضی صاحب ماہرِ آثارِ قدیمہ ہیں نا، اسی لیے صبح کافی ہاؤس آتے ہی وہ کافی منگوا لیتے ہیں اور اسے اس وقت تک نہیں پیتے جب تک کہ کافی میں ''آثارِ قدیمہ'' نمودار نہ ہو جائیں۔''

اور میں نے کافی کے پیالہ میں جھانک کر دیکھا، وہاں سچ مچ آثارِ قدیمہ نمودار ہوگئے تھے اور کافی کی سطح پر تاریخ کی ایک دبیز اور سیاہ تہہ جم گئی تھی۔

اس ملاقات کے بعد قاضی صاحب سے پھر ہر روز ملاقات ہونے لگی۔ قاضی

صاحب کے ساتھ مشکل یہ تھی کہ وہ نئے دوستوں کو منہ نہیں لگاتے تھے اور پرانے دوست اُن کو منہ نہیں لگاتے تھے۔ تاہم اُن کے دوست اُن سے گھبراتے بہت تھے کیوں کہ مشہور تھا کہ اُن کے ایک دوست نے ایک دن اُن کی بُرائی کی اور دُوسرے ہی دن قاضی صاحب نے یہ انکشاف کیا کہ اُن کے اس دوست کا گھر جس قطعہ اراضی پر واقع ہے اس کے نیچے چندر گپت موریا کے عہد کی کچھ باقیات دبی ہوئی ہیں، جنہیں کھدائی کے ذریعہ باہر نکالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ چند ہی دنوں میں اپنے دوست کے گھر کی کھدائی کا بندوبست کرلیا۔ اگرچہ اس کھدائی میں کچھ بھی نہ نکلا مگر قاضی صاحب کی حسرت نکل گئی۔

وہ ہر پرانی اور بوسیدہ چیز پر یُوں جھپٹتے تھے جیسے باز اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ سنا ہے کہ قاضی صاحب نے بیس سال کے عرصہ میں دو شادیاں کی تھیں۔ دوسری شادی کے بعد وہ پہلی بیوی پر ضرورت سے کچھ زیادہ ہی مہربان رہنے لگے تھے۔ یوں بھی فطری طور پر اُنہیں کھنڈرات ہی زیادہ بھلے لگتے تھے۔ سارا وقت پہلی بیوی کے ساتھ گزارتے اور دُوسری بیوی کو انہوں نے یہ کہہ کر ٹرخا دیا تھا کہ ابھی اس کے حُسن کو تاریخ اور زمانہ کی گرمی میں تپنا ہے اور تپ کر کُندن بننا ہے۔ تپ کر کندن بننے سے اُن کی مراد یہ تھی کہ اس کے چہرے پر جھرّیاں پڑ جائیں اور وقت اُس کی کمر کو دوہرا بنا دے۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ بے چاری کندن بنتی کسی منچلے نے اسے قاضی صاحب کے گھر سے کھود نکالا اور موجودہ تاریخ کے دھارے میں بہا دیا ع

حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن مرجھائے کھل گئے

زندگی کے ہر شعبہ میں قاضی صاحب کا یہی رویہ تھا۔ کسی نئی عالی شان عمارت کو دیکھتے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہتے: ”میاں! زندگی آنی جانی چیز ہے۔ اس چار روزہ زندگی میں مجھے یہ موقع کبھی نہ مل سکے گا کہ میں اس عمارت کو کھنڈر بنتا ہوا دیکھوں۔ تاریخ کے مضمون سے مجھے محض اس لیے دلچسپی ہے کہ تاریخ نے دُنیا کو بڑے بڑے کھنڈرات دیئے ہیں، جنگ کے میدان دیئے ہیں اور سننے کو بڑی دلچسپ کہانیاں دی ہیں۔ اب یہی دیکھو کہ ایک بار جب میں سفر کرتا ہوا پانی پت کے میدان سے گزرا تو پانی پت کی ساری جنگیں بیک وقت میرے اندر لڑی جانے لگیں۔ وہ گھمسان کا رن پڑا کہ کنڈکٹر سے منت سماجت کر کے بس رُکوائی، سفر منقطع کیا۔ لیکن اس ملک کی بدقسمتی دیکھو کہ جس میدان نے ہندوستان کی تاریخ کا رُخ موڑ

دیا تھا وہاں مجھے جا بجا بھینسیں گھومتی ہوئی دکھائی دیں۔'' پھر ایک آہ بھر کر کہا ''اصل میں ہم لوگ اپنے ماضی کا احترام کرنا نہیں جانتے۔'' میں نے کہا: ''ماضی کے احترام سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ پانی پت کے میدان میں اب بھی جنگیں لڑی جائیں؟''

بولے: ''جنگ لڑنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور مقام نہیں ہے۔''

میں نے کہا'' قاضی صاحب! آپ کی یہ منطق میرے پلّے نہیں پڑی کہ محض چونکہ ہمارے پاس ایک میدان ہے، اس لیے ہم جنگیں لڑتے رہیں۔ تاریخ میں جنگیں اس لیے لڑی گئیں کہ اُن کے لڑے جانے کے بارے میں پہلے سے فیصلہ ہو چکا تھا۔ ہر جنگ اپنے مقررہ وقت پر ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد تیسری جنگِ عظیم لڑی نہیں گئی بلکہ دُوسری جنگِ عظیم ہی لڑی گئی۔''

قاضی غیاث الدین بولے: ''میاں! تمہارے ساتھ مشکل یہ ہے کہ تم ہمیشہ بھٹک جاتے ہو۔ میں بڑی جنگ کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں اصل میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ جو ہم آئے دن اپنے گھر کے افراد اور دوستوں سے چھوٹی موٹی لڑائیاں لڑتے رہتے ہیں، اُنہیں پانی پت کے میدان میں جا کر لڑا جائے۔ اس میدان میں لڑنے کا لطف ہی کچھ اور ہے۔ اس طرح ہم اپنے ماضی کو بھی تازہ کرتے رہیں گے اور پانی پت کے میدان کی اہمیت بھی بنی رہے گی۔ انگریز کو دیکھو کہ وہ اپنے ماضی کی کس طرح حفاظت کر رہا ہے۔''

میں نے کہا: ''تبھی تو اس کے پاس اب صرف ماضی ہی ماضی رہ گیا ہے۔''

قاضی صاحب پر تاریخ کے ایسے دَورے اکثر پڑتے رہتے ہیں۔ اپنی اُفتادِ طبع کے باعث اُنہیں بیسویں صدی کے واقعات اور بیسویں صدی کے انسان سے مطلق دلچسپی نہیں ہے۔ اُن کی دلچسپی اٹھارویں صدی کے اُس پَرے سے شروع ہوتی ہے اور اُلٹی چلتی ہوئی زمانہ ماقبل تاریخ میں پہنچ جاتی ہے۔ حد ہو گئی کہ ۱۸۵۷ء کے انقلاب کو بھی وہ خاطر میں نہیں لاتے۔ کہتے ہیں: ''بھئی! یہ تو کل کی بات معلوم ہوتی ہے۔ دُنیا نے دو بڑی جنگیں لڑیں لیکن وہ اب بھی راجہ پورس اور سکندرِ اعظم کی جنگ میں جُتے ہوئے ہیں۔''

ایک دن مجھے ایک بھالا دکھا کر کہنے لگے: ''یہ وہی بھالا ہے جسے راجہ پورس نے

سکندرِ اعظم پر پھینکا تھا مگر راجہ پورس کا نشانہ خطا ہو گیا۔''

''اور یہ آپ کے لگ گیا۔'' میں نے فوراً کہا۔

بولے: '' آپ مذاق نہ کیجئے۔ اگر اس بھالے کا نشانہ خطا نہ ہوتا تو آج ہندوستان کی تاریخ مختلف ہوتی۔''

ایک دن قاضی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ تنگ و تاریک گلیوں سے جب ہم گزرنے لگے تو مجھے یُوں محسوس ہوا جیسے ہم ہڑپا دموہنجوداڑو کے صدیوں پُرانے راستوں سے گزر رہے ہیں۔ قاضی صاحب کا گھر گھر نہیں بلکہ اچھا خاصا مقبرہ تھا۔ جب یہ مجھے اندر لے جانے لگے تو میں نے پوچھا: '' قاضی صاحب! یہاں کون مدفون ہے؟'' بولے'' مدفون ہے! بھائی صاحب یہ میری رہائش گاہ ہے۔''

میں نے رہائش گاہ کو چھو کر دیکھنے کی کوشش کی تو مجھ پر تھوڑی سی رہائش گاہ آن گری۔ قاضی صاحب نے مجھے فوراً پَرے کھینچتے ہوئے کہا: '' برخوردار! آثارِ قدیمہ کو اس طرح نہیں دیکھا جاتا، اس کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں۔''

میں نے پوچھا: '' قاضی صاحب! کیا آپ نے اس گھر کو بھی کھود نکالا ہے؟''

بولے: '' یہ گھر میرے دادا کے پردادا نے اس وقت بنایا تھا جب اورنگ زیب نے گولکنڈہ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اُس وقت سے اب تک اس گھر کی کہیں کوئی مرمت نہیں کی گئی۔ یہ خالص آثارِ قدیمہ والی عمارت ہے۔ گولکنڈہ کے قلعہ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی مگر اس گھر کی بنیادیں اب بھی مضبوط ہیں۔''

ہم لوگ ذرا اور آگے بڑھے تو چھت میں سے آثارِ قدیمہ کا کچھ حصہ میرے سر پر آگرا۔ میں نے چھت کی طرف دیکھا تو وہاں چند چمگادڑیں قاضی صاحب کی بینائی کی طرح اُلٹی لٹکی ہوئی تھیں۔

پھر وہ مجھے ایک بڑے کمرے میں لے گئے جسے وہ بار بار دیوان خانہ کہہ رہے تھے۔ اس میں پہنچ کر مجھے یوں لگا جیسے میں سینکڑوں برس پہلے کی دنیا میں پہنچ گیا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ جب مصوری نے ترقی نہیں کی تھی تو اس وقت انسان چینی مٹی کی بنی ہوئی رکابیاں اور اسی قماش کے دیگر برتن تزئین و آرائش کی خاطر دیواروں پر لگاتا تھا۔ قاضی

صاحب کے دیوان خانہ میں چاروں طرف دیواروں پر رکابیاں ٹنگی ہوئی تھیں۔ حالانکہ اُن کا صحیح مقام ڈائننگ ٹیبل ہونا چاہیے تھا، جو قاضی صاحب کے پاس نہیں تھا مگر بعد میں مجھے احساس ہوا کہ قاضی صاحب نے دیواروں پر اُن رکابیوں کا پلاستر چڑھا کر ٹھیک ہی کیا تھا کیوں کہ جہاں جہاں پلیٹ ٹنگی تھی، وہاں وہاں تاریخ نے دیوان خانے کی دیوار میں سوراخ ڈال دیئے تھے۔ میں بڑی دیر تک ان رکابیوں کو دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگر قدرت نے قاضی غیاث الدین کو کھانے پینے کی نعمتوں سے نوازا ہوتا تو پھر یہ رکابیاں دیوار پر اُلٹی نہ لٹکی رہتیں۔ دیوان خانے کے چاروں کونوں میں چند بے ترتیب پتھر پڑے تھے۔ ان پتھروں کے بارے میں قاضی صاحب کا کہنا تھا کہ یہ وہی پتھر ہیں جو کبھی بابل ونینوا کی عمارتوں میں جڑے ہوئے تھے۔ ان پتھروں نے کئی تہذیبیں دیکھی ہیں، کئی انقلابات دیکھے ہیں اور کئی جلیل القدر ہستیاں دیکھی ہیں۔''

''اور اب آپ کو دیکھ رہے ہیں۔'' میں نے فوراً کہا۔

دیوان خانے میں ایک الماری بھی رکھی ہوئی تھی جو لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ اُس الماری کے پٹ میں کبھی شیشے بھی لگے ہوں گے مگر اب یہ ٹوٹ چکے تھے، مگر اُن میں رکھی ہوئی چیزوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ قاضی صاحب اُن ٹوٹے ہوئے پٹوں کو مقفل کرتے تھے۔ وہ مجھے الماری میں رکھی ہوئی چیزیں دکھانے کے لیے لے گئے تو ایک چوہا اس میں سے نکل کر بھاگنے لگا۔

قاضی صاحب بولے: ''آپ جس چوہے کو دیکھ رہے ہیں وہ کوئی معمولی چوہا نہیں ہے۔ اس چوہے کے ایرانی آبا و اجداد دُرّہ خیبر کے راستے سے ہندوستان آئے تھے۔ ایسے نجیب الطرفین چوہے آپ کو عام طور پر دکھائی نہیں دیں گے۔''

میں الماری میں رکھی ہوئی عجیب وغریب چیزوں کو دیکھ ہی رہا تھا کہ قاضی صاحب نے ایک پیالہ اپنے ہاتھ میں اُٹھالیا اور بولے: ''لیجیے میں آپ کو ایک نادر چیز دکھاؤں۔ ذرا اس پیالے کو غور سے دیکھیے۔ یہ وہی پیالہ ہے جس میں آج سے سینکڑوں برس پہلے سقراط کو زہر پیش کیا گیا تھا۔''

میرا تجسّس بڑھ گیا۔ میں نے فوراً پیالے کو ہاتھ میں لے لیا اور اُسے اُلٹ پلٹ کر

دیکھنے لگا۔ پھر اُسے روشنی میں لے گیا۔ پیالہ چونکہ پُرانا تھا اس لیے اس پر جابجا میل کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔ میں نے ایک جگہ میل کو صاف کیا تو مجھے ایک تحریر صاف دکھائی دینے لگی اور آپ یقین کریں کہ وہ تحریر یونانی زبان میں نہیں انگریزی زبان میں لکھی ہوئی تھی اور پیالہ پر نہایت چھوٹے حروف میں لکھا ہوا تھا:

"MADE IN ENGLAND"

قاضی صاحب اس پیالے کے بارے میں ایک لمبا چوڑا لیکچر دیتے رہے اور میں انگریزوں کی سفاکی کے بارے میں سوچتا رہا کہ سقراط کو زہر دینے کے پیچھے بھی انگریزوں کا ہاتھ تھا۔

(بالآخر۔ ۱۹۸۲)

میرے پتے سے لوگوں کو........

مجھے پنڈت پربھاکر دویدی سے ملنا تھا۔ رات کے دس بج چکے تھے مگر کام کچھ ایسا اہم تھا کہ میرے لیے اتنی رات کو بھی پربھاکر دویدی کے گھر جانا ضروری ہوگیا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ مجھے اُن کے گھر کا پتہ نہیں معلوم تھا۔ البتہ اُن کے ایک دوست پروفیسر گھوش سے پوچھا تو اُنہوں نے فلسفہ کی کسی گتھی کو سلجھانے کے انداز میں مجھ سے کہا: ''آپ قرول باغ چلے جائیے۔ وہاں آپ کو بائیں ہاتھ پر ایک بینک ملے گا۔ اس بینک کے سامنے والی سڑک پر چلے جائیے۔ یہ سڑک آپ کو ایک اسپتال پر پہنچادے گی بس اس اسپتال کے سامنے پربھاکر دویدی کا گھر ہے۔''

بینک، اسپتال اور پربھاکر دویدی ان تینوں چیزوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینے کے بعد میں قرولباغ کی جانب روانہ ہوگیا۔ قرولباغ پہنچا تو ایک راہ گیر سے میں نے پوچھا ''کیوں بھئی، اس سڑک کے بائیں ہاتھ پر جو بینک ہوا کرتا ہے وہ اس وقت کہاں ہوگا؟''

راہ گیر نے بڑی مشکوک نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا ''اس سڑک کے بائیں ہاتھ پر ویسے تو پانچ بینک ہیں لیکن میں آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ ان پانچوں بینکوں پر رات کے وقت مسلح چوکیدار رہتے ہیں۔ رات کے گیارہ بجے ہیں۔ اس وقت آپ کا وہاں جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ اپنے منصوبہ کو کسی اور وقت کے لئے اُٹھا رکھیئے۔ پھر آپ تو اچھے خاصے ہٹے کٹے آدمی ہیں، محنت کرکے زندہ کیوں نہیں رہتے۔''

اب سوال بینک کا نہیں میرے کردار کا ہوگیا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے کردار پر روشنی

ڈالنے کی غرض سے کہنا شروع کیا: ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے، میں ادیب ہونے کے باوجود ایک شریف آدمی ہوں۔ لہٰذا مجھے بینک سے کیا لینا دینا۔ میں نے آج تک کسی بینک میں قدم نہیں رکھا ہے۔ میری شرافت کا آپ کو اس سے زیادہ اور کیا ثبوت چاہئے۔ میں تو اصل میں اس بینک کے سامنے والی اس سڑک پر جانا چاہتا ہوں جس کے بائیں ہاتھ پر ایک اسپتال ہے اور اس اسپتال کے سامنے میرے دوست پربھاکر دویدی کا گھر ہے۔''

اس پر راہ گیر بولا ''دیکھئے حضور، یہاں بینک تو پانچ ہیں۔ جہاں تک اسپتال کا تعلق ہے مجھے اسپتال سے کیا لینا دینا۔ میں نے آج تک کسی اسپتال میں قدم نہیں رکھا۔ پیشے کے اعتبار سے پہلوان ہوں اور اتنی اچھی صحت رکھتا ہوں کہ کبھی کسی اسپتال کا پتہ پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ تاہم اسپتال تک پہنچنے کا آسان راستہ یہ ہے کہ آپ کسی بھی بینک میں زبردستی داخل ہونے کی کوشش کیجئے۔ اس کے بعد بینک کا چوکیدار اور محلّہ کے لوگ آپ کی اچھی طرح تواضع کرنے کے بعد آپ کو اسپتال پہنچا دیں گے بلکہ ہوسکتا ہے کہ آپ کو ایمبولنس میں پہنچا دیں۔ اسپتال پہنچنے کے بعد اپنے دوست کا پتہ پوچھ لینا۔ اس میں ایسی کونسی دُشواری ہے۔''

یہ کہہ کر راہ گیر اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا آگے کو نکل گیا۔ تن بدن میں آگ لگ گئی مگر رات کے وقت میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ تھوڑی دُور چپ چاپ چلتا رہا، اتنے میں ایک بینک مجھے نظر آ گیا۔ اس کے سامنے والی سڑک پر میں مُڑ گیا۔ تھوڑی دُور اور چلا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ کیوں کہ مجھے ایک اسپتال نظر آ گیا۔ اسپتال کو دیکھ کر شاید ہی کوئی اتنا خوش ہوا ہوگا۔ اسپتال کے سامنے پہنچ کر میں نے ایک مکان پر دستک دی۔ اندر سے ایک صاحب آنکھیں ملتے ہوئے نکلے۔ میں نے پوچھا ''کیا پربھاکر دویدی یہیں رہتے ہیں؟'' وہ بولے ''جی نہیں یہاں ایک ایسے چترویدی رہتے ہیں جو پربھاکر نہیں ہیں۔'' یہ کہہ کر اُن صاحب نے بڑے زور سے دروازہ بند کر دیا۔ میں نے سوچا کہ شاید میں غلط دواخانے پر آ گیا ہوں۔ اس خیال کے آتے ہی میں نے ایک راہ گیر سے پوچھا ''کیوں بھئی! اس علاقہ میں کوئی اور اسپتال بھی ہے؟'' اس نے اس سوال کے پوچھتے ہی میری کلائی پکڑ کر میری نبض پر اُنگلی رکھ دی۔ پھر اپنی جیب سے اسٹیتھسکوپ نکالتے ہوئے بولا ''اجی کسی اور اسپتال کی کیا

ضرورت ہے۔ میں خود ایک اچھا ڈاکٹر ہوں۔ آپ کے جملہ امراض بشمول پوشیدہ امراض کا شرطیہ علاج کر سکتا ہوں۔ چلیے اسی بات پر اپنی زبان تو باہر نکالیے۔"

میں نے اپنی کلائی کو ایک جھٹکے کے ساتھ اُس کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے کہا: "ڈاکٹر صاحب! میری بات تو سنئے، میں علاج کے لیے اسپتال کی تلاش میں نہیں ہوں بلکہ اصل میں مجھے ایک ایسے اسپتال کی تلاش ہے جس کے سامنے میرے دوست پربھاکر دویدی کا گھر ہے، مجھے اُن سے ملنا نہایت ضروری ہے۔"

اس کے ساتھ ہی راہ گیر ڈاکٹر کے چہرے پر ایسے آثار نمودار ہوگئے جو عموماً مرگی کے مریض کے چہرے پر مرض کے حملے کے وقت نمودار ہوتے ہیں۔ وہ بولا: "بندہ نواز اس علاقہ میں اتنے اسپتال ہیں کہ یہاں مریض اسپتال کی تلاش نہیں کرتے، بلکہ اسپتال خود مریضوں کو تلاش کرتے ہیں۔" یہ کہہ کر اُن صاحب نے اسٹتھسکوپ کو پھر سے اپنی جیب میں رکھ لیا اور سامنے والی گلی میں چلے گئے۔ میں بڑی دیر تک اس چلتے پھرتے اسپتال کو گلی کے اندھیرے میں غائب ہوتے ہوئے دیکھتا رہا۔ پھر سڑک پر میں اکیلا رہ گیا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں بینکوں، اسپتالوں اور پربھاکر دویدیوں سے مایوس ہو چکا تھا۔ اتنے سارے بینکوں اور اتنے سارے اسپتالوں کے ڈھیر میں دبے ہوئے پربھاکر دویدی کو کھوجنا میرے لیے اب کوئی آسان بات نہیں تھی۔ لہٰذا چپ چاپ گھر واپس آگیا۔

اس واقعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچ گیا ہوں کہ کسی کا پتہ بتانا اور اس پتہ کو سمجھنا دونوں ہی بڑے مشکل کام ہیں۔ پھر ادھر جب سے انسان نے بڑے بڑے شہر اور بڑی بڑی کالونیاں بسانی شروع کی ہیں تب سے کسی انسان کا پتہ چلانا بہت دُشوار ہو گیا ہے۔ شہروں کے اس جنگل میں کون آدمی کہاں رہتا ہے یہ کسی کو پتہ نہیں ہوتا۔ وہ بھی کیا دن تھے کہ آدمی منٹوں میں اپنے گھر کا پتہ بتا دیتا تھا۔ اور دوسرا آدمی اس سے بھی کم وقت میں اس کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ ہمارے قصبہ میں ایک شاعر صاحب رہا کرتے تھے۔ جب بھی کوئی اُن سے اُن کے گھر کا پتہ پوچھتا تو فرماتے: "بھئی! میرے گھر کا پتہ بہت آسان ہے۔ پولیس تھانہ سے جو سڑک جاتی ہے اس پر سیدھے چلے جاؤ۔ تھوڑی دیر بعد نیم کا ایک پیڑ نظر آئے گا۔

اس پیڑ کے نیچے دس بارہ بچے آپ کو کھیلتے ہوئے ملیں گے۔ اُن میں سے کسی بھی بچے سے آپ میرا پتہ پوچھ لیجئے، وہ میرا ہی بچہ ہوگا۔ پھر وہ آپ کو میرے گھر لے آئے گا۔'' اور واقعی ہوتا بھی ایسا ہی تھا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ہم نے نیم کے پیڑ کے نیچے کھیلنے والے کسی بچہ سے شاعر صاحب کا پتہ پوچھا ہو اور وہ اُن کا بچہ نہ نکلا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے یہ شاعر صاحب بچہ کو پیدا کرتے ہی اسے نیم کے پیڑ کے نیچے چھوڑ آتے تھے کہ بیٹا اب یہاں ساری زندگی کھیلتے رہو۔ اس اثنا میں، میں تمہارے ایک اور بھائی کو ''زیورِ طبع'' سے آراستہ کروں گا۔ سارا سارا دن ان کی ''تخلیقات'' اس نیم کے پیڑ کے نیچے انواع واقسام کے کھیل کھیلنے میں مصروف رہتی تھیں۔

ہمارے ایک اور دوست اپنے گھر کا پتہ لوگوں کو یوں بتایا کرتے تھے ''بھئی! تم بس ڈپو کے برابر والی گلی میں مڑ جانا۔ اس گلی میں مڑتے ہی تمہیں بڑی دُور سے کسی کے کھانسنے کی آواز آئے گی۔ تم اس کھانسی کی طرف آگے بڑھتے چلے جاؤ۔ یہاں تک کہ یہ کھانسی تمہارے قریب آجائے گی۔ پھر جس گھر میں سے کھانسی کی آواز آرہی ہو اس میں داخل ہو جاؤ۔ وہاں میری ساس آپ کو کھانستی ہوئی ملے گی۔'' وہ کہا کرتے تھے کہ کسی اور داماد کو ساس سے فائدہ پہنچا ہو یا نہ پہنچا ہو مگر مجھے میری ساس سے یہ فائدہ ضرور پہنچا ہے کہ میں اس کی کھانسی کے حوالہ سے لوگوں کو اپنے گھر کا پتہ بتا دیتا ہوں۔ سنا ہے کہ بعض اوقات ان کی ساس کی کھانسی کم ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ اسے مسلسل کھانستے رہنے پر مجبور کرتے تھے کہ بھٹکے ہوئے لوگوں کو راستہ مل جائے۔ اصل میں وہ اپنی ساس کی کھانسی کو اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے ایک ''مشعلِ راہ'' سمجھتے تھے۔

گھروں کے پتہ کے سلسلہ میں ایسی نشانیاں بڑی کارآمد اور مفید ہوتی ہیں۔ جب تک واضح نشانیاں موجود نہ ہوں تب تک کسی کے گھر پہنچنا بہت دُشوار ہوتا ہے۔ خود ہماری مثال لیجئے کہ جب کوئی ہم سے ہمارے گھر کا پتہ پوچھتا ہے تو اس کے لیے ہم ''دیواری اشتہاروں'' کا سہارا لیتے ہیں۔ پتہ کچھ اس طرح کا ہوتا ہے کہ ہمارے محلہ کے بس اسٹانڈ پر پہنچتے ہی آپ کو ایک حکیم صاحب کا اشتہار نظر آئے گا جس میں آپ کو یہ مژدہ سُنایا جائے گا کہ آپ کے پیٹ کے جملہ امراض کا شرطیہ علاج کیا جائے گا۔ اگر آپ پیٹ کے کسی مرض میں مبتلا ہیں تو حکیم صاحب سے دوا حاصل کیجئے۔ دوا لینے کے بعد آپ اپنے پیٹ کو پکڑ کر اس گلی

میں آگے کی طرف آیئے۔ وہاں آپ کو ایک دیوار پر سردی زکام سے متعلق ایک دوا کا اشتہار نظر آئے گا۔ اس اشتہار کے بائیں بازو والی گلی میں آپ مُڑ جایئے۔ کچھ دُور چلنے کے بعد آپ کو ایک دیوار پر پوشیدہ امراض کے شرطیہ علاج سے متعلق ایک اشتہار لکھا ہوا ملے گا۔ بس اسی دیوار میں لگے ہوئے دروازہ پر دستک دیجیے، انشاء اللہ ہم آپ کو اس گھر میں ''پوشیدہ'' ملیں گے۔ ہم نے اتنے سارے دوستوں کو اپنے گھر پہنچنے کا یہ پتہ بتا رکھا ہے کہ جب کبھی مکانوں کے مالک سال میں ایک بار اپنی دیواروں پر سفیدی کرواتے ہیں اور یہ دیواری اشتہارات نیست و نابود ہو جاتے ہیں تو ہم اپنے خرچ سے اپنے پینٹر کے ذریعہ ان اشتہارات کو دوبارہ لکھوا دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ اشتہارات اب ہماری ذات کا حصہ بنتے جا رہے ہیں اور شاید اُن کے بغیر ہماری شناخت ادھوری رہ جائے گی ورنہ پوشیدہ امراض سے ہمارا کیا تعلق؟۔

ادھر جب سے آدمی بڑی بڑی کالونیوں میں ایک ہی صورت شکل والے مکانوں میں رہنے لگا ہے تب سے اس کا پتہ سینکڑوں بلاکوں اور نمبروں میں بٹ گیا ہے۔ ایسے مکانوں کے ساتھ مشکل یہ ہوتی ہے کہ ہر مکان پر اپنے مکان کا گمان ہوتا ہے۔ ہمیں ایک بار کچھ عرصہ کے لیے ایسی ہی ایک کالونی میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ ہماری کمزوری یہ ہے کہ ہمیں نمبر بالکل یاد نہیں رہتے۔ کتنی ہی بار نمبروں کو یاد کیجیے مگر حافظہ سے اُتر جاتے ہیں۔ اُن دنوں ہماری حالت یہ تھی کہ ہم کالونی کے ہر گھر میں بے دھڑک گھس جاتے تھے اور بعد میں بڑی بے عزتی کے ساتھ بری ہوتے تھے۔ ایک بار تو یوں بھی ہوا کہ ایک گھر میں پہنچ کر ہم نے اپنا لباس تبدیل کر دیا، غسل خانہ میں جا کر غسل کیا، پھر جب بیگم کو چائے لانے کے لیے آواز دی تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری بیگم کی جگہ ایک خوبصورت اور حسین و جمیل عورت ہاتھ میں چائے کی ٹرے لیے چلی آ رہی ہے۔ یوں لگا جیسے ہماری بیگم کی ''اوور ہالنگ'' کر دی گئی ہو۔ جی تو بہت چاہا کہ ان خوبصورت ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے پی لی جائے مگر عاقبت کا خیال آڑے آ گیا اور وہاں سے ہم بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس کے بعد سے ہمارا یہ حال ہو گیا تھا کہ خود اپنے ہی گھر پر پہنچ کر پہلے باہر سے آواز لگاتے تھے ''بھئی سُننا! کیا مجتبیٰ حسین صاحب یہیں رہتے ہیں؟۔'' اندر سے آواز آتی ''جی ہاں! یہیں رہتے ہیں مگر اس وقت گھر پر نہیں ہیں۔ آپ بعد میں آیئے۔''

اس پر ہم کہتے "بیگم سُننا، ہم آگئے ہیں، خدا کے لیے دروازہ کھولو۔"

نمبروں کے اُلٹ پھیر سے تنگ آ کر ہم نے اس کالونی کو خیر باد کہا اور اب ہم اس دیواری اشتہار والے مکان میں رہتے ہیں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ ہمارا مکان اب ہمیں بڑی آسانی سے مل جاتا ہے۔

(بالآخر۔ ۱۹۸۲)

آم اب عام نہیں رہے

قدرت کے کھیل بھی بڑے نرالے ہیں۔ اس نے آم کو ہندوستان میں پیدا کیا بہت اچھا کیا لیکن اس کو کھانے کا طریقہ امریکہ اور یورپ کے باسیوں کو سکھا دیا۔ آم کو ہم بچپن سے کھا رہے ہیں لیکن جب تک ہم نے ہالی ووڈ کی فلمیں نہیں دیکھی تھیں جن میں ہیروئنیں اور ہیرو بات بات پر ایک دوسرے کو آم سمجھ لیتے ہیں اور سلوک بھی ایسا ہی کرتے ہیں ،تب تک ہمیں بھی معلوم نہیں تھا کہ آم کو کھانے کا اصل طریقہ کیا ہے۔ بعد میں جب ہم یورپ اور امریکہ گئے تو ہم نے وہاں آم کھانے کی باضابطہ ٹریننگ بھی حاصل کی۔ کیا کریں ہم ہندوستانیوں کی مجبوری یہ ہے کہ آم کھانے سے لے کر انجینئرنگ اور میڈیسن کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے تک ہر کام کو سیکھنے کے لئے ہمیں امریکہ اور یورپ جانے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ بہر حال ہم نے وہاں آم کھانے میں وہ مہارت حاصل کی کہ آج ہم کبھی آم کھاتے ہیں تو ہمارے ایک دوست ،جو ہماری ہی عمر کے ہیں ،اکثر کہتے ہیں کہ "میاں جب تم دسہری اور چوسہ کھاتے ہو تو نہ جانے کیوں مجھے جینا لولو بریجید ا اور صوفیہ لارین کی بے ساختہ یاد آجاتی ہے۔" اپنی عمر کے حساب سے وہ ہمیشہ پچھلے موسموں کے پھلوں کو ہی یاد کرتے ہیں۔ ہم نے ایک امریکی دوست سے کہا بھی تھا کہ "بھیا! یہ جو تمہاری فلموں میں بات بات پر ندیدہ پن نظر آجاتا ہے تو اس کی جگہ تم لوگ سیدھے سیدھے آم کیوں نہیں کھا لیتے؟"

بولے "میاں! پہلی بات تو یہ ہے کہ آم ہمارے ملک میں نہیں ملتا اور اگر ملتا بھی

ہے تو بہت مہنگا ملتا ہے۔ ہم ٹھہرے کاروباری لوگ۔ ہم تو سستی چیز کے پیچھے ہی بھاگتے ہیں''
۔ہم نے کہا'' مگر ذائقہ بھی تو ایک چیز ہے۔''

بولے'' جن ملکوں میں آم نہیں ہوتا وہاں کے لوگ اپنا ذائقہ آپ بنا لیتے ہیں۔ آپ بھی کس چکر میں پڑ گئے۔ آپ آم کھانے سے مطلب رکھئے۔ پیڑوں کو کیوں گنتے ہیں۔''

حضرات! معاف کیجئے۔ ہم خواہ مخواہ ہی پیڑوں کو گننے میں لگ گئے۔ ہمیں تو آموں کے بارے میں کچھ کہنا تھا اور ہم بلا وجہ ہی اس کے کھانے کے طریقوں میں اُلجھ گئے۔ جب ہالی وڈ میں فلمیں نہیں بنتی تھیں تب بھی اس ملک میں لوگ جیسے تیسے آم کھا لیا کرتے تھے۔ یہ اور بات ہے کہ ناتجربہ کاری کی وجہ سے آموں کا رس پوری طرح چوسا نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن اس کی کس کو پرواہ تھی کیوں کہ اس زمانہ میں آم بھی تو بہت ہوتے تھے اور میٹھے بھی ہوتے تھے۔

دوستو! آم ہمارا قومی پھل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کیا بچہ اور کیا بوڑھا ہر کوئی اسے پیڑ سے گرانے کے لئے پتھر مارتا رہتا ہے۔ ہم ہندوستانیوں کی عادت ہے کہ جس چیز کو بھی قومی بنا دیتے ہیں اسے مارنے کو دوڑتے ہیں۔ آم تو خیر'' راشٹریہ پھل'' ہے۔ ہم نے تو اپنے '' راشٹر پتا'' کو بھی نہیں چھوڑا۔ آپ نے ہمیں آموں کے سلسلہ میں ہونے والی اس محفل میں بُلا کر سچ مچ ہمارے سینہ پر ایک تیر مارا ہے۔ کیوں کہ ہم اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں جس کے آموں کے باغ کسی زمانہ میں بڑی شہرت رکھتے تھے۔ پھر زندگی نے ہمیں کچھ ایسے سبز باغ دکھائے کہ ان باغوں کو چھوڑ کر شہروں میں رہنے لگے۔ آموں کا موسم آتا تھا تو آم کے پیڑوں پر آم کم لٹکتے ہوئے دکھائی دیتے تھے اور ہم ہی اُن کی ٹہنیوں پر زیادہ لٹکتے ہوئے پائے جاتے تھے۔ غرض جب سے ہمارے آموں کے باغ چھن گئے ہیں تب سے ہمارا اشمار بھی عوام میں ہونے لگا ہے۔ یوں بھی آم ہیں اور عوام میں بہت زیادہ فرق نہیں ہوتا کیوں کہ دونوں ہی چوسنے کے کام آتے ہیں۔ سرکار، افسر، بیوپاری، پونجی پتی کون ہے جو عوام کو نہیں چوستا۔ آم کو چوسنے کے بعد کم از کم اس کی گٹھلی تو چھوڑ دی جاتی ہے مگر عوام کو ایسی بیدردی سے چوسا جاتا ہے کہ بعض اوقات تو اُن کی استھیاں بھی نہیں مل پاتیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ عوام کا ذائقہ بھی آم کی طرح لذیذ ہوتا ہے۔ جو لوگ عوام کو چوستے ہیں وہ جانتے ہیں کے عوام کا

ذائقہ پانچ سال میں ایک مرتبہ اس وقت بہت تلخ ہو جاتا ہے جب عوام ووٹ دینے کے لئے آتے ہیں۔ لیکن جب سے ووٹوں اور نوٹوں میں تال میل پیدا ہو گیا ہے تب سے عوام کے ذائقہ کی تلخی بھی کم ہوتی جارہی ہے۔ اسی لئے تو کہاوت مشہور ہے کہ ''عوام کے عوام ووٹوں کے دام''۔

چاہے کچھ بھی ہو ہر کوئی آم کا رسیا ہے۔ آدمی تو پھر آدمی ہے۔ مرزا غالبؔ بھی آموں کے دیوانے تھے۔ ایک ریسرچ اسکالر نے تو یہاں تک کہا ہے کہ غالب آم کے موسم میں شعر نہیں کہتے تھے صرف آم ہی کھاتے رہتے تھے۔ ایسے میں کوئی انہیں ڈسٹرب کرتا تو اس پر اپنے شعروں سے حملہ نہیں کرتے تھے۔ گٹھلی پھینک کر مارتے تھے۔ آم ہی ایک ایسا پھل ہے جس میں ایک ہتھیار چھپا ہوتا ہے۔ کہتے ہیں غالب کے ایک دوست کو آموں سے چڑ تھی۔ ایک دن دونوں بازار سے گزر رہے تھے تو دیکھا کہ گلی میں پڑے ہوئے ایک آم کو ایک گدھے نے پہلے تو سونگھا۔ کچھ سوچا۔ پھر اسے کھائے بغیر آگے کو نکل گیا، اس منظر کو دیکھ کر مرزا غالبؔ کے دوست نے کہا'' دیکھئے صاحب! گدھا بھی آم نہیں کھاتا۔'' اس پر غالبؔ نے کہا'' حضور! میں جانتا ہوں کہ گدھا ہی آم نہیں کھاتا۔''

مگر یہ پرانی بات تھی جب گدھے کسی وجہ سے آم نہیں کھاتے تھے۔ مگر آج حالات اتنے بدل گئے ہیں کہ ہم جس آدمی کو بھی آم کھاتا ہوا دیکھ لیتے ہیں تو اسے گدھا سمجھنے لگتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے ایک دوست نے ہماری آنکھوں کے سامنے پورے سو روپیوں میں ایک بڑا الفانسو آم خرید لیا تو ہمیں اس کا ثبوت بھی مل گیا۔ گدھا بڑا ہوشیار جانور ہے۔ اس نے ایک صدی پہلے ہی بھانپ لیا تھا کہ ایک دن آم پینتالیس پچاس روپے فی کلو کے حساب سے بکے گا۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی ہی سب سے بڑا گدھا ہے اور گدھا ہی سب سے بڑا انسان ہے۔ آموں کی مہنگائی کی وجہ سے ہی ہم آم تو نہیں خریدتے لیکن اُن کے دام ضرور پوچھ لیتے ہیں۔ ایک فروٹ مرچنٹ سے ہم لگاتار چھ دنوں تک آم کے دام پوچھتے رہے۔ ساتویں دن ہم اس کی دکان پر گئے تو اس سے دام تو نہیں پوچھا البتہ بڑی دیر تک للچائی نظروں سے صرف آموں کو دیکھتے رہ گئے۔ اس پر دُکاندار نے پہلے تو اپنے آموں کو کپڑے سے اچھی طرح ڈھک لیا۔ پھر بولا'' آپ دام پوچھیں گے یا میں ہی آپ کو بتادوں۔؟''

ہم نے کہا ''میاں! ہمیں تو ایک ایسے پھل کی تلاش ہے جس کے بارے میں سنا ہے کہ بہت میٹھا ہوتا ہے، لوگ اسے صبر کا پھل کہتے ہیں۔ مل جائے گا تمہارے پاس؟''

دُکاندار بولا ''اب تمہیں زیادہ دن صبر نہیں کرنا پڑے گا۔ ساٹھ پینسٹھ کے تو لگتے ہی ہو۔ دو چار برس اور صبر کرلو تو صبر کا یہ پھل تمہیں دوسری دُنیا میں جلد ہی ملے گا۔ اس دنیا میں تو یہ نہیں ملتا۔ اس وقت تو لنگڑے سے کام چلالو ورنہ اپنا راستہ ناپو۔''

اسی لئے تو ہم کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میں آم صرف دو قسم کے ہوتے تھے۔ کاٹنے کے اور چوسنے کے۔ اب دیکھنے کے آم بھی ہونے لگے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ ذائقہ اور صورت شکل کے اعتبار سے آموں کی بھی اتنی ہی قسمیں ہوتی ہیں جتنی کہ عورتوں کی ہیں۔ پھر لطف کی بات یہ کہ دونوں میں بہت سی باتیں ایک جیسی بھی پائی جاتی ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعض بہت خوبصورت اور حسین عورتیں اندر سے بہت تلخ، ترش اور کڑوی کسیلی ہوتی ہیں۔ صورت اور سیرت میں جو فرق ہوتا ہے اس کا اندازہ ہمیں آم کھانے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ جو لوگ آم اور عورت کی خوبی کا اندازہ اس کی صورت سے لگاتے ہیں وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی آم کی صورت تو ہمیں بہت خراب لگی لیکن جب کھایا تو طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ یہ بات ہم ذاتی تجربہ کی بنا پر کہہ رہے ہیں کیوں کہ پچھلے چالیس برسوں سے ہم ایک ایسے ہی آم کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔

یہ بھی بتاتے چلیں کہ ہم چوسنے کے آم ہی کھانا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ کاٹنے والے آم اس لئے نہیں کھاتے کہ تین آم کھانے ہوں تو ڈیٹول کی پوری ایک شیشی خرچ کرنی پڑتی ہے۔ آموں کے سینکڑوں نام بھی ہوتے ہیں۔ بڑے کیوٹ (Cute) اور مزیدار۔ بعض نام تو ان آموں کے قلمی نام (Pen Name) معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ہمیں تو لنگڑا بہت پسند ہے۔ کسی نے اُس کی شکل وصورت کو دیکھ کر مذاق میں اس کا نام لنگڑا رکھ دیا تھا۔ لیکن اس آم نے اُلٹا نام رکھنے والے کا مذاق اُڑانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ اب یہ آم جتنا چلتا ہے کوئی اور آم نہیں چلتا بلکہ اسے تو آموں کا ملکھا سنگھ بھی کہا جاسکتا ہے۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض قصبے صرف آموں کی وجہ سے بڑی شہرت رکھتے ہیں۔ ملیح آباد کو ہی لیجئے۔ اگر یہاں آم نہ ہوتے تو بھلا بتایئے ملیح آباد کو کون جانتا۔ یہ ضرور ہے

کہ ایک زمانہ میں جوشؔ ملیح آبادی نے یہ چاہا تھا کہ ملیح آباد کی شہرت اُن کے نام کی وجہ سے بھی ہو۔ لیکن زمانہ کی دوڑ میں ملیح آباد کے آم پھر آگے کو نکل گئے اور حضرت جوشؔ ملیح آبادی پیچھے رہ گئے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ جوشؔ ملیح آبادی جب پاکستان گئے اور وہاں اُن کا تعارف پاکستان کے اس وقت کے صدر اسکندر مرزا سے کرایا گیا کہ ان سے ملئے یہ جوشؔ ملیح آبادی ہیں تو اسکندر مرزا نے چھوٹتے ہی کہا ''اچھا تو آپ ملیح آباد کے رہنے والے ہیں جہاں کے آم بڑے مشہور ہیں۔'' اس کے بعد اسکندر مرزا نے جوشؔ ملیح آبادی سے ملیح آباد کے آموں کے بارے میں تو بہت کچھ پوچھا لیکن اُن کی شاعری کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا۔

آخر میں ہم الہ آباد کے حوالہ سے ہی اپنی بات کو ختم کرنا چاہیں گے۔ پچپن چھپن برس پرانی بات ہوگی جب جواہر لال نہرو الہ آباد کے آنند بھون میں رہا کرتے تھے۔ یہی گرمیوں کے دن تھے۔ بلکہ مہینہ بھی شاید یہی تھا۔ ہوسکتا ہے تاریخ بھی یہی رہی ہو۔ اندرا گاندھی فیروز گاندھی سے شادی کرنے کے بعد ہنی مون منانے کے لئے کشمیر گئیں تو وہاں کی ٹھنڈی ہواؤں نے اُنہیں مسحور کر دیا۔ ایسے میں انہیں اچانک نہرو جی کا خیال آیا کہ وہ تو الہ آباد کی سخت گرمی میں پریشان ہوں گے۔ لہٰذا انہوں نے ہمدردی کے طور پر نہرو جی کو لکھا کہ کاش میں آپ کے لئے کشمیر کی کچھ ٹھنڈی ہوائیں الہ آباد بھیج سکتی۔ اس پر جواہر لال نہرو نے اندرا جی کو لکھا ''بیٹی! مجھے تو تم پر ترس آرہا ہے۔ کشمیر میں بھلے ہی ٹھنڈی ہوائیں تمہارے ساتھ ہوں گی لیکن تمہارے پاس دسہری اور ثمر بہشت تو نہیں ہیں۔''

اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اتنے برس گزر جانے کے بعد آج نہ تو کشمیر میں ٹھنڈی ہوائیں ہیں اور نہ ہی الہ آباد میں دسہری اور ثمر بہشت نظر آتے ہیں۔

(میرا کالم۔ ۱۹۹۹)

قصّہ ایک ہم شکل کا

بعض اوقات کچھ ایسے واقعات پیش آجاتے ہیں کہ اُن واقعات کے پیش آجانے کے باوجود آپ لوگوں کو یہ یقین نہیں دلا سکتے کہ یہ واقعہ آپ کے ساتھ پیش آیا تھا۔

پچھلے دنوں میں بذریعہ ٹرین دہلی سے حیدرآباد جارہا تھا۔ ایک حیدرآبادی دوست بھی میرے ہم سفر تھے۔ ناگپور کے اسٹیشن پر گاڑی بڑی دیر تک ٹھہرتی ہے۔ ہم دونوں سفر کی بوریت کو ختم کرنے کے لئے پلیٹ فارم پر اُترے تو اچانک ایک شخص بڑی گرم جوشی کے ساتھ میری طرف آیا اور مجھ سے بغل گیر ہوتے ہوئے بولا ''یار! دیپک سکسینہ کیسے ہو؟ کہاں جارہے ہو؟''۔ میں نے کہا ''حیدرآباد جارہا ہوں۔'' پوچھا ''تو کیا اب حیدرآباد میں بھی تم نے اپنا بزنس شروع کردیا ہے؟'' میں نے کہا ''شروع تو نہیں کیا ہے۔ شروع کرنے کی سوچ رہا ہوں۔'' کہنے لگا۔ ''بہت اچھا خیال ہے۔ یہ بتاؤ گھر پر سب کیسے ہیں؟۔'' میں نے کہا ''سب اچھے ہیں۔ مہندر انجینئرنگ کرنے کے بعد باہر چلا گیا ہے۔ سرلا اپنی سسرال میں خوش ہے۔ ویریندر کے بارے میں تو تم جانتے ہوگے کہ اُس نے اب پلاسٹک کی چیزیں بنانے کا اپنا ایک کارخانہ کھول لیا ہے۔'' اس شخص نے کہا۔ ''اچھا مجھے پتہ نہیں تھا۔ اتنا بڑا ہوگیا ہے۔ وہ ذہین پہلے ہی سے تھا۔ کاروبار میں تم سے یقیناً آگے جائے گا۔''

میں نے کہا ''بس تمہارا آشیرواد چاہیے۔''

پھر اس شخص نے پوچھا ''اور بھابی کا کیا حال ہے؟'' میں نے کہا ''بھگوان کی کرپا

سے بالکل اچھی ہیں۔ وہ جو اپنے الٰہ آباد کے مشہور وید پنڈت پربھا کردویدی ہیں نا۔ اُن کے علاج سے بڑا فائدہ ہوا ہے۔ جوڑوں کا درد بالکل جاتا رہا ہے۔''

اُس شخص نے حیرت سے کہا ''اچھا تو وید جی اب تک زندہ ہیں۔ بہت بوڑھے ہوگئے ہوں گے۔ کیا اسی پرانے مکان میں رہتے ہیں؟''۔ میں نے کہا ''ہاں وہی گھاس منڈی والے مکان میں رہتے ہیں۔'' بولا ''اچھا کیا تم نے بتادیا۔ انہیں خط لکھتا ہوں۔ پچھلے کچھ دنوں سے میں بھی جوڑوں کے درد میں مبتلا ہوں۔ حیدرآباد سے الٰہ آباد کب واپس جاؤ گے؟'' میں نے کہا ''ایک ہفتہ میں واپس ہو جاؤں گا۔''

بولا ''یار تمہاری دُکان کی مٹھائیاں اور نمکین چیزیں بہت یاد آتی ہیں۔ کئی برس ہوگئے الٰہ آباد آئے ہوئے۔ اب کے آؤں گا تو ضرور ملوں گا! اور ہاں تمہیں یاد ہوگا کہ الٰہ آباد سے چلتے وقت میں نے تم سے سو روپے اُدھار لئے تھے۔ پورے چھ سات برس بیت گئے۔ ہمیشہ خیال آیا کہ تمہیں منی آڈر کردوں لیکن فرصت ہی نہیں ملی۔ اب رکھ لو''۔ یہ کہہ کر اُس نے مجھے سو روپے کا نوٹ دیا۔ میں نے پوچھا ''مگر یہ تو بتاؤ کہ تم ناگپور میں کیا کر رہے ہو۔ اپنا پتہ تو دو۔'' اس اثناء میں ٹرین نے چلنے کی تیاری شروع کردی۔ اس شخص نے اپنا وزیٹنگ کارڈ مجھے دیا اور ٹرین کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے کہنے لگا ''الٰہ آباد کی صحبتیں بہت یاد آتی ہیں۔۔ سارے دوستوں کو میری طرف سے پوچھنا اور بھابی کو نمستے کہنا۔ بچوں کو پیار اور ہاں حیدرآباد سے واپس ہوتے وقت دو ایک دن ناگپور میں رک جاؤ۔ اب میرے حالات اچھے ہوگئے ہیں۔ پہلے کی سی بات نہیں رہی۔''

گاڑی آگے کو نکل گئی اور وہ بڑی دیر تک پلیٹ فارم پر ہاتھ ہلاتا رہ گیا۔ جب ہم ڈبہ میں واپس ہوئے تو میرے حیدرآبادی دوست نے کہا ''یار مجتبیٰ کمال ہے۔ تم تو عملی مذاق بھی خوب کرلیتے ہو۔ یہ تم مجتبیٰ سے دیپک سکسینہ کیسے بن گئے۔ یہ الٰہ آباد۔ یہ گھاس منڈی اور پربھا کردویدی۔ یہ سب کیا ہے۔ اور یہ تمہارا بیٹا مہندر کہاں سے آگیا اور یہ دیویندر نے پلاسٹک کا کارخانہ کب کھول لیا۔ اور ہاں بھابی تو کبھی جوڑوں کے درد میں مبتلا نہیں ہوئیں۔'' میں نے ہنس کر کہا ''اس شخص سے سو روپے لینے کے لئے یہ کہنا ضروری تھا۔'' میرے دوست نے کہا ''مگر تم نے تو اسے کبھی سو روپے نہیں دیئے تھے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر دیپک سکسینہ نے

تو دیئے تھے۔'' میرے دوست نے پوچھا'' کیا مذاق کرتے ہو۔کون ہے یہ دیپک سکسینہ؟''
میں نے کہا'' وہی جو الہ آباد میں رہتا ہے۔رانی منڈی میں اس کی کنفکشنری کی دُکان ہے اور
جس کی بیوی جوڑوں کے درد کی مریض ہے۔'' میرے دوست نے کہا'' تب تو یہ سو روپے اُس
دیپک سکسینہ کے ہوئے۔تم نے کیوں وصول کر لیے؟۔''میں نے کہا'' اور وہ جو میرے مزاحیہ
مضامین کی داد ہر ایک سے وصول کرتا رہتا ہے تو یہ داد کس کھاتے میں جائے گی۔''

میرے دوست نے جھنجھلا کر کہا'' یار یہ معمہ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔کھل کر
تو بتاؤ کہ معاملہ کیا ہے؟''

اور میں نے جو بات اپنے حیدرآبادی دوست کو بتائی وہ اب آپ سب کو بھی بتائے
دیتا ہوں۔بات دراصل یوں ہوئی کہ آج سے سات آٹھ برس پہلے میں دہلی کے کناٹ پلیس
کی ریگل بلڈنگ کے سامنے کھڑا تھا کہ ایک شخص نے اچانک پیچھے سے میری پیٹھ پر ایک
گھونسہ رسید کرتے ہوئے کہا'' ابے دیپک سکسینہ تو یہاں کیا کر رہا ہے؟ کب آیا الہ آباد
سے؟''میں نے اپنی پیٹھ کو سہلاتے ہوئے کہا'' معاف کیجئے۔میں دیپک سکسینہ نہیں ہوں۔
آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔''وہ شخص بولا'' ابے لفنگے! مجھ سے مذاق کرتا ہے۔بچپن کا دوست اور
مجھے'' آپ'' کہہ کے شرمندہ کر رہا ہے۔اچھا یہ تو بتا کب آیا الہ آباد سے؟''

میں نے قدرے بلند آواز میں اس سے کہا'' دیکھئے جناب۔آپ کو غلط فہمی ہوئی
ہے۔میں دیپک سکسینہ نہیں ہوں اور نہ ہی الہ آباد سے میرا تعلق ہے۔خواہ مخواہ میرا وقت برباد
کرنے کا کیا فائدہ۔اس پر وہ شخص بپھر گیا اور غصہ سے بولا'' اب میں سمجھا کہ تو کس بات پر خفا
ہے۔یہی نا کہ میں نے تیری دُکان سے ڈھائی تین سو روپیوں کی مٹھائی اُدھار لی تھی۔یہ لے
پانچ سو روپئے اور رکھ اپنی جیب میں۔تیری پائی پائی چکا دونگا۔تو سمجھتا کیا ہے اپنے آپ کو۔
بہت دنوں سے الہ آباد نہیں آیا تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تیرے پیسے ہڑپ کرنا چاہتا تھا۔
میں نہیں جانتا تھا کہ تو پیسے کے لئے اتنا گر جائے گا۔آج سے تیری میری دوستی ختم۔''اس شخص
نے غصہ سے پانچ سو روپیوں کا نوٹ میرے شرٹ میں ٹھونس دیا اور میرے منع کرنے کے
باوجود آگے کو نکل گیا۔

اس واقعہ کے بعد بہت دنوں تک وہ پانچ سو روپے میری جیب میں پڑے رہے۔

چار برس پہلے کسی ادبی محفل کے سلسلہ میں مجھے لکھنؤ جانا پڑا۔ لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن کے دو چار دوستوں کے ساتھ میں امین آباد پارک سے گزر رہا تھا کہ اچانک ایک صاحب نے پیچھے سے پکارا" بھئی دیپک سکسینہ ! کیسے ہو یار؟۔ دیکھ کر بھی انجان بنے چلے جا رہے ہو۔ مٹھائیاں اچھی بناتے ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ پرانے دوستوں کو بھی بھول جاؤ۔" دیپک سکسینہ کا نام سن کر مجھے اچانک کناٹ پلیس والا واقعہ یاد آگیا۔ قبل اس کے کہ میں اس کی غلط فہمی دور کرتا میرے ریڈیو کے دوستوں نے اس سے کہا" معاف کیجئے۔ یہ دیپک سکسینہ نہیں مجتبیٰ حسین ہیں۔ دہلی سے آئے ہیں۔" مگر میں نے بیچ میں مداخلت کرتے ہوئے اس شخص سے کہا۔ "حضور ان کی باتوں میں نہ آیئے۔ میں ہی دیپک سکسینہ ہوں الٰہ آباد والا۔ آپ نے میری دوکان سے جو مٹھائی لی تھی اس کے پیسے اب تک نہیں دیئے۔ میں آپ کو کیسے نہیں پہچانوں گا۔"

اس پر اس شخص نے ندامت سے کہا۔" ہاں بھئی دیپک ابھی پچھلے مہینے تو تم نے سو روپے کی مٹھائی اُدھار دی تھی۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ اگلے ہفتے الٰہ آباد آرہا ہوں۔ پیسے دے دونگا۔"

تب میں نے اس شخص پر اپنی اصلیت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا" حضور! مجھے اس دیپک سکسینہ کا ذرا پتہ بتایئے۔ میں اس سے ملنا چاہتا ہوں۔ یہ کیسا آدمی ہے کہ ہر ایک کو اُدھار مٹھائی دے دیتا ہے اور پھر بھی اس کا کاروبار چل رہا ہے۔"

بہر حال میں نے اس شخص سے دیپک سکسینہ کا پورا پتہ حاصل کیا۔ اتفاق سے اس واقعہ کے پورے ایک سال بعد ایک ادبی محفل کے سلسلہ میں الٰہ آباد جانا پڑ گیا تو میں دیپک سکسینہ کی کنفکشنری کی دکان پر گیا۔ دیپک سکسینہ کو دور سے دیکھا تو یوں لگا جیسے میں خود دکان پر بیٹھا ہوا مٹھائیاں بیچ رہا ہوں۔ جیسے ہی میں اس کی دکان پر گیا دیپک سکسینہ نے مجھے ایک نظر دیکھا۔ پھر زور سے بولا" السلام وعلیکم مجتبیٰ صاحب ! کب آئے آپ دہلی سے الٰہ آباد؟۔ مجھے یقین تھا کہ آپ ایک نہ ایک دن میری دکان پر ضرور آئیں گے۔" میں نے کہا

"یار دیپک سکسینہ! تمہیں میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

بولا" کمال کرتے ہیں آپ بھی۔ جیسے آپ کو میرا نام معلوم ہو گیا ویسے ہی مجھے بھی آپ کا نام معلوم ہو گیا۔ دو ایک بار دہلی گیا تو جگہ جگہ لوگوں نے مجھے "مجتبیٰ حسین" سمجھ کر پکڑ لیا۔ آپ کے ایک دوست نے تو مجھے بے پناہ گالیاں بھی دیں کہ رات کھانے کی دعوت پر آنے کا وعدہ کر کے میں اُن کے ہاں نہیں پہنچا۔"

دیپک سکسینہ سچ مچ میرا ہم شکل تھا۔ مجھ سے مل کر وہ بہت خوش تھا۔ مجھے خوشی خوشی اپنے گھر لے گیا۔ بیوی بچوں سے ملایا۔ شام کو مجھے الٰہ آباد کی ایک ادبی محفل میں شرکت کرنی تھی۔ سو میں نے دیپک سکسینہ کو بھی ادبی محفل میں شرکت کی دعوت دے دی۔ کسی وجہ سے میں ادبی محفل میں دیر سے پہنچا تو دیکھا کہ ادبی محفل کے منتظمین اسے زبردستی پکڑ کر ڈائس پر بٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تو اچھا ہوا کہ میں نے بروقت بیچ بچاؤ کیا ورنہ اس دن دیپک سکسینہ کو پتہ چلتا کہ ہوٹنگ کس کو کہتے ہیں۔

منتظمین بھی ہم دونوں کی مشابہت سے پریشان تھے۔

بہرحال جب میں الٰہ آباد سے دہلی واپس جانے لگا تو دیپک سکسینہ میرے لئے مٹھائی کے کئی ڈبے لے کر آ گیا۔ میں نے اس کے کناٹ پلیس والے دوست کے دیئے ہوئے پانچ سو روپے دینے کی کوشش کی تو دیپک نے کہا۔ "مجتبیٰ صاحب! آپ بھی کمال کرتے ہیں۔ آپ کی تصویریں ہندی رسالوں میں چھپتی رہتی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر بھی آپ اکثر آتے رہتے ہیں۔ آپ کو کیا پتہ کہ میں نے آپ کے مزاحیہ مضامین کی جتنی داد وصول کی ہے اس کے آگے ان پانچ سو روپیوں کی کیا حیثیت ہے۔ انہیں اپنے پاس ہی رکھئے۔"

میں نے پوچھا۔" دیپک سکسینہ یہ سب تمہیں کیسا لگتا ہے۔"

بولا" بہت اچھا لگتا ہے۔ لیکن کبھی کبھی اس ملک میں جب فرقہ وارانہ دنگے ہونے لگتے ہیں تو میں آپ کے تعلق سے تشویش میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔"

میں نے کہا" دیپک! تم میرے لئے تشویش میں مبتلا ہو جاتے ہو اس بات کی مجھے

خوشی ہے مجھے اور کیا چاہئے۔ مگر مجھے تم سے ہمدردی بھی ہے۔ حالانکہ تمہارا کاروبار ٹھیک چل رہا ہے لیکن لوگوں کو اُدھار میں مٹھائی تو نہ دیا کرو۔'' بولا ''مجتبیٰ صاحب۔ آپ بھی تو لوگوں کو اُدھار میں ہنساتے رہتے ہیں۔ یہ سماج آپ کی باتوں پر ہنس تو لیتا ہے لیکن اس کی قیمت آپ کو کہاں ادا کرتا ہے۔''

دیپک سکسینہ کی بات سن کر مجھے یوں لگا جیسے میں مٹھائی فروش ہوں اور وہ مزاح نگار ہے۔

(میرا کالم۔۱۹۹۹)

ہمارے گھر پر چھاپہ

کل رات ہم نے ایک عجیب وغریب خواب دیکھا۔اس خواب کی تفصیل آپ کو بھی سنائے دیتے ہیں۔ملاحظہ فرمائیں۔

ہم رات کے پچھلے پہر اپنے کمرہ میں گہری نیند سے لطف اندوز ہورہے تھے کہ ہماری بیوی نے ہمیں جگاتے ہوئے کہا "ذرا سنئے، دیکھئے تو سہی ہمارے گھر چھاپہ مارنے والے آگئے ہیں۔"ہم نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا "ان سے کہو معاف کریں اور آگے جائیں۔"

بیوی نے کہا "آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔یہ وہ لوگ نہیں ہیں جو معاف کر دیتے ہیں۔یہ تو چھاپہ مارنے والے ہیں۔ان کا معافی سے کیا تعلق؟"

ہم نے ایک اور کروٹ بدلتے ہوئے کہا "کون سے چھاپہ مارنے والے؟ ان دنوں چھاپہ مارنے والے بھی کئی قسم کے ہوگئے ہیں۔انکم ٹیکس کے چھاپہ مار، سی بی آئی کے چھاپہ مار، انفورسمنٹ ڈائریکٹوریٹ، کمرشیل ٹیکس اور نہ جانے کس کس کے چھاپہ مار۔پہلے پتہ تو کرو کہ کس ڈپارٹمنٹ سے آئے ہیں۔"

ہماری بیوی نے کہا "تم خود جا کر پوچھ لو۔میں پوچھوں گی تو کہیں واپس نہ چلے جائیں۔مجھے تو صورت سے یہ چھاپہ مارنے والے کم اور......!"

اس وقت تک ہم نیند کے خمار سے نکل آئے تھے۔جب ہمیں پتہ چلا کہ ہمارے گھر سچ مچ چھاپہ مارنے والے آئے ہیں تو ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہا ہم نے بیگم سے کہا

''میں نہ کہتا تھا ایک دن ہمارا شمار بھی بڑے آدمیوں میں ہوگا۔ خدا کا شکر ادا کرو کہ آج اس نے ہمیں یہ اعزاز بخشا ہے۔ اگرچہ لکشمی کبھی ہمارے گھر نہیں آئی لیکن چھاپہ مارنے والے تو آ گئے ہیں، تم جلدی جلدی ان سارے احباب اور رشتہ داروں کو اس خوش خبری کی اطلاع دے دو جو ہمیں دیکھ دیکھ کر بلاوجہ حسد کی آگ میں جلتے رہتے ہیں۔ انہیں مزید جلانے کا اس سے بہتر کوئی اور موقعہ نہیں ہو سکتا۔'' بیگم نے کہا ''کیسے اطلاع دوں۔ ٹیلی فون کا بل بروقت ادا نہ کرنے کی وجہ سے آج ہی تو ہمارا ٹیلی فون کٹا ہے۔ کتنی بار تم سے کہا کہ ہمارے ٹیلی فون کا یوں بار بار کٹ جانا اچھا نہیں۔ کوئی بھی ایمر جنسی آ سکتی ہے۔''

ہم نے کہا ''تم پڑوسی کے ہاں جا کر ٹیلی فون کرو۔ میں اتنی دیر میں چھاپہ مارنے والوں سے نمٹتا ہوں۔''

ہم دیوان خانہ میں آئے تو دیکھا کہ چار پانچ اصحاب دیوان خانہ کی ہر چیز کو نہایت غور سے دیکھ رہے ہیں اور دیکھنے سے زیادہ انہیں پرکھ رہے ہیں۔ اُن کے افسرِ اعلیٰ نے ہم سے کہا ''معاف کیجئے ہم آپ کے گھر چھاپہ مارنے کے لئے آئے ہیں۔''

ہم نے کہا ''زہے نصیب۔ ضرور چھاپہ ماریئے۔ ہمیں تو آپ ہی کا انتظار تھا۔''

افسر نے کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کو ہماری آمد کا پہلے ہی سے پتہ تھا۔''

ہم نے کہا ''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ اگر آپ کی آمد کا پہلے سے پتہ ہوتا تو ہم آپ کو یوں سوتے ہوئے ملتے۔ ہم تو آپ کے خیر مقدم کے لئے گھر پر چراغاں کرتے اور گلی کے نکڑ پر ایک خیر مقدمی کمان تو کھڑی کر دیتے۔''

افسرِ اعلیٰ: ''دیکھئے مذاق بند کیجئے۔ پہلے ہم آپ کے گھر کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔''

ہم: ''ضرور لیجئے مگر ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ پہلے چائے وغیرہ تو پیجئے۔ ہم نے اپنے کچھ صحافی دوستوں اور فوٹو گرافروں کو فون پر اطلاع دینے کے لئے کہا ہے کہ وہ جلد از جلد یہاں آ جائیں۔ وہ آ جائیں تو تلاشی شروع کر دیجئے۔''

افسرِ اعلیٰ: ''آپ نے صحافیوں اور فوٹو گرافروں کو کیوں بلایا۔ آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ لوگ تو چھاپے کی اطلاع کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔''

ہم: ’’یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ہمارے گھر چھاپہ پڑے اور اس کی اطلاع اخباروں میں نہ آئے۔ پھر چھاپہ روز روز تو پڑنے سے رہا۔ اخبار والے آجائیں تو ذرا مزہ آجائے گا۔ ہمارے گھر سے اگر کوئی چیز نہ بھی ملے تو اخبار والے اپنی خبر میں نکال لیں گے۔ اس طرح ہماری عزت اور احترام میں اضافہ ہوگا۔‘‘

چھاپہ مار ٹیم کا افسر ہم سے یہ بات چیت کر ہی رہا تھا کہ اچانک کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ٹیم کے ایک کارندے نے ہماری وہ لاقیمت اور بے مثال دیواری گھڑی گرادی ہے جو ہمیں اپنے والد سے اور ہمارے والد کو اُن کے والد سے ورثہ میں ملی تھی۔ یہ گھڑی فرانس کے ایک گھڑی ساز نے ۱۸۵۷ء میں اس وقت تیار کی تھی جب ہندوستان کی پہلی جنگِ آزادی لڑی جارہی تھی۔ ہمارے پاس یہ گھڑی پچھلے پچاس برسوں سے تھی۔ اس سے پہلے یہ ہمارے والد کے پاس تھی۔ ان کا بیان تھا کہ اُن کے پاس یہ گھڑی کبھی نہیں چلی۔ لگ بھگ سو برس سے یہ گھڑی دس بج کر پینتیس منٹ بجارہی تھی۔ یہ معلوم نہیں تھا کہ دن کے دس بج کر پینتیس منٹ بجارہی تھی یا رات کے۔ البتہ مشہور یہ تھا کہ جس وقت ہمارے دادا کا انتقال ہوا تھا عین اس وقت ہمارے ایک تایا نے اس گھڑی کو چلنے سے روک دیا تھا۔ گویا پچھلے سو برس سے وہ ہمارے اہلِ خاندان کو ہمارے دادا کے مرنے کا وقت بتارہی تھی۔ ہمارے والد صاحب کہا کرتے تھے کہ بھلے ہی یہ گھڑی نہ چلے لیکن اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ دن میں دو دفعہ بالکل صحیح وقت بتاتی ہے۔ دیگر گھڑیوں کی طرح بالکل نہیں تھی جو دن کے کسی بھی وقت میں صحیح وقت نہیں بتاتیں۔ تاہم اس گھڑی میں ہم وقت نہیں دیکھتے تھے بلکہ اپنے اسلاف کے کارناموں کو ڈھونڈتے تھے۔ جیسے ہی یہ دیواری گھڑی گری ہمارے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ ہم نے کارندے کو جا کر پکڑا کہ میاں جب تک اس گھڑی کا معاوضہ ہمیں ادا نہیں کیا جاتا تب تک ہم تمہیں کسی اور چیز کو ہاتھ لگانے نہیں دیں گے اور مزید تلاشی کی اجازت نہیں دیں گے۔ افسرِ اعلیٰ نے مداخلت کرتے ہوئے کہا ’’آپ اطمینان رکھیں آپ کو اس گھڑی کا معاوضہ مل جائے گا۔‘‘

ہم نے کہا ’’مگر معاوضہ کیا ہوگا۔ پہلے یہ تو طے کیجئے۔‘‘

افسرِ اعلیٰ نے گھڑی کے ٹوٹے ہوئے پرزوں کا جائزہ لینے کے بعد کہا ’’آپ کو اس

کے پچاس روپے مل جائیں گے۔"

ہم نے چیخ کر کہا "کیا کہا پچاس روپے۔ بھائی صاحب میں اس گھڑی کے پچاس لاکھ روپے سے کم نہیں لونگا۔ آپ نے اس گھڑی کو کیا سمجھا ہے۔ ہمارے باپ دادا کی نشانی ہے۔ جس فرانسیسی کاریگر نے یہ گھڑی بنائی تھی اگر اس کے اہل خاندان کو اس گھڑی کا پتہ چل جائے تو وہ کروڑوں روپیوں میں اسے ہم سے خرید لیں گے۔" ہم یہ بحث کر ہی رہے تھے کہ کچھ صحافی حضرات اور فوٹو گرافر وہاں آگئے۔ ہم نے اُنہیں سارا ماجرا کہہ سنایا اور بتایا کہ اس قدیم گھڑی کے دام پر ہم میں اور چھاپہ مارنے والوں میں اختلاف رائے پیدا ہو گیا ہے۔ وہ ہمیں پچاس روپے دینا چاہتے ہیں اور ہم اس کے پچاس لاکھ سے کم نہیں لینا چاہتے۔ وہ تو اچھا ہوا کہ ایک جہاندیدہ صحافی نے اس گھڑی کے ٹوٹے ہوئے کل پرزوں کا بغور جائزہ لینے کے بعد کہا کہ اس کا دام آسانی سے ایک کروڑ روپے بھی تعین کیا جا سکتا ہے لیکن جب تم نے پچاس لاکھ روپے طے کر دیا ہے تو چلو یہی سہی۔ اس گھڑی کی قیمت اس کے کل پرزوں سے نہیں بلکہ اس کی عمر سے لگائی جانی چاہئے۔ بھلے ہی وہ بیسویں صدی میں ایک منٹ کے لئے نہیں چلی لیکن اُس نے پوری ایک پر آشوب صدی کو گزرتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس گھڑی سے تمہارے ارکان خاندان کا جو جذباتی رشتہ ہے وہ ایسا بیش قیمت ہے کہ اس کا معاوضہ تو کوئی ادا کر ہی نہیں سکتا۔ پھر بھی تم نے کہہ دیا ہے تو پچاس لاکھ روپے لے کر معاملہ کو رفع دفع کرو۔

اس استدلال کے بعد افسرِ اعلیٰ نے اپنی ٹیم کے کارندوں سے کہا کہ وہ چھاپہ مارنے کی مہم روک دیں۔ کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔ ہم نے چھاپہ مارنے والوں کے یہ تیور دیکھے تو کہا "حضور! آپ کو اب چھاپہ تو مارنا ہی پڑے گا۔ اب تو صحافی اور فوٹو گرافر بھی آ چکے ہیں۔ ہم آپ کو یوں جانے نہیں دیں گے۔ پھر آپ کی ٹیم نے تو ابھی اس گراموفون کو نہیں دیکھا ہے جو ہمیں اپنے نانا کی طرف سے ورثہ میں ملا ہے۔ بخدا ایسا تاریخی اور یادگار گراموفون ہے کہ آپ اسے دیکھیں گے تو حیران رہ جائیں گے۔ کچھ لوگوں کا تو یہاں تک کہنا ہے کہ یہ گراموفون اس وقت کا بنا ہوا ہے جب ابھی سائنسدانوں نے خود گراموفون کو ایجاد نہیں کیا تھا۔ اگر خدا کرے یہ کسی طرح ٹوٹ جائے تو ہمارے خاندان کو کم سے کم ایک کروڑ روپے

ضرور دلا سکتا ہے۔ ہماری بات کو سن کر افسرِ اعلیٰ نے پہلے تو ہم سے یہ پتہ کیا کہ گراموفون مذکور کہاں رکھا ہوا ہے۔ اور جب اس کے محل وقوع کا پتہ چل گیا تو اس نے اپنے کارندوں سے کہا کہ ''خبردار! جو کوئی اس گراموفون کے قریب گیا تو۔ یہ ایک عجیب وغریب گھر ہے کہ یہاں ٹوٹنے سے پہلے کسی چیز کا دام تو پچاس روپے ہوتا ہے۔ لیکن یہی جب ٹوٹ جائے تو اس کا دام پچاس لاکھ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا چھاپہ مارنا بند کرو۔!''

ہمارے بچوں نے کہا ''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آپ چھاپہ نہ ماریں۔ آپ کو چھاپہ تو مارنا ہی پڑے گا۔ ہم تو کب سے آپ کا انتظار کر رہے ہیں'' ایک بچہ نے کہا ''میرا ایک بال پین پچھلے ایک ہفتہ سے غائب ہے۔ آپ کو تلاشی میں ملے تو واپس کر دینا۔'' ہماری بیوی نے کہا ''اور ہاں۔ ہماری پوتی کی ایک انگوٹھی کہیں گر گئی ہے۔ بہت تلاش کیا لیکن پتہ نہیں چلا۔ آپ لوگ تو ماہر ہیں۔ آپ کو یہ انگوٹھی ملے تو ضرور دے دیں۔'' ہم نے کہا ''ہماری بھی بعض ضروری چیزیں غائب ہیں۔ یہ فہرست ہم آپ کو بعد میں دیں گے۔ لیکن پہلے وہ دیواری گھڑی کا معاوضہ طے ہو جائے۔''

ہماری بات معقول تھی اس لئے ہمارے صحافی دوستوں نے بھی اصرار کرنا شروع کر دیا کہ جب تک دیواری گھڑی کی قیمت طے نہیں ہو جاتی تب تک چھاپہ مار ٹیم کو یہاں سے جانے نہ دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی چھاپہ مار ٹیم کے ارکان نے بھاگنا شروع کر دیا۔ دوسرے دن اخباروں میں ہمارے گھر پر چھاپہ کی تفصیلی خبریں شائع ہوئیں۔ جگہ جگہ ہمارے چرچے ہونے لگے اور لوگ ہمیں مبارکباد دینے لگے کہ اس چھاپہ کے عوض انکم ٹیکس والے تمہیں پچاس لاکھ روپئے ادا کر رہے ہیں۔ ایسا تاریخی چھاپہ آج تک کہیں نہیں پڑا ہوگا۔ اس کے بعد اچانک ہماری آنکھ کھل گئی۔ دیکھا تو دور دور تک کسی کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ ہم نے بیوی سے پوچھا ''چھاپہ مارنے والے کہاں چلے گئے؟'' بیوی نے ہمیں ڈانٹتے ہوئے کہا ''کوئی خواب دیکھا ہے کیا؟۔ کیسا چھاپہ اور کہاں کا چھاپہ؟۔'' ابھی میں نے تمہارے پرس پر چھاپہ مارا تھا صرف دو روپئے نکلے۔ یہ منہ اور مسور کی دال'' اور یہ سن کر ہم اپنی آنکھیں ملنے میں مصروف ہو گئے۔

(میرا کالم۔۱۹۹۹)

چوتھا کندھا

صبح صبح فون کی گھنٹی بجے تو میں بہت پریشان ہو جاتا ہوں کیوں کہ میرے دوستوں اور قریبی رشتہ داروں کو پتہ ہے کہ صبح کا وقت میری گہری نیند کا ہوتا ہے۔ اچھے اور حسین خواب بھی صبح کے وقت ہی دیکھتا ہوں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ انسان کا شمار پرندوں اور چوپایوں میں محض اس لئے نہیں ہوتا کہ پرندے اور چوپائے علی الصبح جاگ جاتے ہیں اور انسان صبح ہونے کے باوجود دیر تک سوتے رہنے کی زبردست صلاحیت رکھتا ہے۔ میں نے اپنے کتّے کے سوائے کسی اور چوپائے کو صبح کے وقت سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ میرا کتا بھی محض اس لئے سوتا ہے کہ میری صحبت میں رات کو دیر تک جاگتا ہے اور اشرف المخلوقات کی سی حرکتیں کرتا ہے۔

ہاں تو میں فون کی گھنٹی کا ذکر کر رہا تھا۔ میں نے سوچا یہ فون ضرور کسی ایسے شخص کا ہوگا جو مجھے نہیں جانتا اور اگر جانتا بھی ہے تو پھر ضرور کوئی ایسی اطلاع دینا چاہتا ہوگا جسے میں نہیں جانتا اور جسے جاننے میں مجھے دیر نہیں کرنی چاہئے۔ میں نے گھبراہٹ میں فون کا ریسیور اُٹھایا تو دوسری طرف سے آواز آئی ''میں معزز علی بول رہا ہوں۔'' میں نے دماغ پر بہت زور ڈالا کہ یہ کون معزز علی ہے۔ پچھلے دس بارہ برسوں میں کسی معزز علی سے ملنا تو بہت دُور کی بات ہے کسی معزز آدمی سے بھی میرا واسطہ نہیں پڑا تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچ کر کہا'' آپ معزز ہیں تو میں بھی کچھ کم معزز نہیں ہوں۔ لیکن یہ تو فرمایئے کہ اتنی صبح کو آپ کو اپنے معزز ہونے کا

اعلان کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔‘‘

دوسری طرف سے آواز آئی ’’بھئی! میں چودھری معزز علی بول رہا ہوں۔تم نے شاید مجھے نہیں پہچانا۔‘‘

چودھری معزز علی کا نام سنتے ہی فون کا ریسیور میرے ہاتھ سے گرتے گرتے بچا۔ کیوں کہ دس گیارہ سال پہلے چودھری معزز علی کا جب بھی فون آتا تھا تو ریسیور میرے ہاتھ سے گر جاتا تھا۔اتنے لمبے عرصہ بعد نہ جانے کیوں چودھری معزز علی نے مجھے فون کیا تھا۔

میں نے کہا ’’چودھری معزز علی صاحب! کئی برس بعد آج اچانک آپ کو میری یاد کیسے آگئی؟‘‘

چودھری معزز علی بولے ’’یاد تمہاری اکثر آتی ہی رہتی ہے لیکن فون کرنے کی توفیق آج ہوئی ہے میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔یہ بتاؤ کب ملاقات ہوگی؟‘‘ میں نے کہا ’’میں آج شام آپ کے گھر آجاؤں گا۔کیا آپ ابھی تک پرانے مکان میں ہی ہیں؟‘‘

بولے ’’پچھلے دس برس میں پندرہ مکان بدل چکا ہوں۔تم کون سے مکان کی بات کرتے ہو؟‘‘

میں نے کہا ’’تو پھر آپ اس مکان کا پتہ بتا دیجئے جس میں آج شام تک آپ کے موجود رہنے کا امکان ہو۔‘‘ چودھری معزز علی نے مجھے اپنے رائج الوقت مکان کا پتہ سمجھایا اور میں نے آنے کا وعدہ کر کے فون رکھ دیا۔

میں سوچنے لگا چودھری معزز علی کو ریٹائر ہوئے دس گیارہ برس بیت گئے۔اب اُنہیں اچانک مجھ سے کیا کام پڑ گیا۔اب وہ ستر برس کے تو ہو گئے ہوں گے۔پھر چودھری معزز علی جس قماش کے آدمی ہیں ان کا ریٹائر ہونے کے بعد دس گیارہ برس تک زندہ رہنا ایک معجزہ ہی ہے۔

پندرہ برس پہلے ایک دفتر میں اُن سے میرا واسطہ پڑا تھا۔دفتر کے عہدوں کی سیڑھی میں مجھ سے ایک قدم اوپر تھے۔جب میرا تقرر اُن کے سیکشن میں ہوا تو دفتر کے لوگوں نے مجھے یوں دیکھا جیسے میں ایک خونخوار شیر کے پنجرے میں جا رہا ہوں۔معزز علی کا شمار دفتر کے نہایت غیر معزز عہدیداروں میں ہوتا تھا۔اُنہیں وہی لوگ سلام کرتے تھے، اور وہ بھی بحالت

مجبوری، جن کا اُن سے کوئی کام پڑتا تھا۔ معزز علی خود سے کسی کو سلام کرنے کو اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی اُنہیں غلطی سے سلام کر لیتا تو بعد میں بڑی دیر تک پچھتاتا رہتا تھا۔ دفتر کے عہدہ کو وہ عہدہ کے طور پر نہیں بلکہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ عہدہ کیا تھا ننگی تلوار تھی جس کے ذریعہ وہ اپنے ساتھیوں اور اہل غرض کو حسب استطاعت زخمی کرتے رہتے تھے۔ غصہ اُن کی ناک پر رہتا تھا جو پلک جھپکتے میں زبان پر منتقل ہو جایا کرتا تھا۔ ہر کسی پر غصہ کرنے کے بعد اپنے عہدہ سے اسے مطلع کرنے کی غرض سے پوچھ لیا کرتے تھے۔ ''جانتے ہو میں کون ہوں؟'' اور مخاطب کو مجبوراً کہنا پڑتا تھا ''جی آپ اس دفتر کے انڈر سکریٹری ہیں۔'' وہ دن میں دس بارہ مرتبہ مختلف افراد سے یہ سوال ضرور پوچھ لیا کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے اُنہیں خود اس بات کا یقین نہیں ہے کہ وہ انڈر سکریٹری ہیں۔ تب ہی تو وہ ہرایرے غیرے سے یہ سوال پوچھ کر اپنے عہدہ کی تصدیق کرلیا کرتے تھے۔ ایک سادہ لوح چپراسی تو اُن کے پاس ایسا بھی آیا تھا جسے جب اُن کی اس عادت کا پتہ چلا تو ایک دن اُن کے پوچھے بغیر ہی گھبرا کر کہہ بیٹھا ''حضور! آپ اس دفتر کے انڈر سکریٹری ہیں۔'' معزز علی اس پر بہت ناراض ہوئے کہ اُس نے اُن کی توہین کرنے کی غرض سے اُن کے عہدہ کا ذکر کیا تھا۔ معاملہ اوپر تک گیا۔ معزز علی کی خواہش تھی کہ چپراسی کو سخت سزا دی جائے بلکہ ہو سکے تو اسے دفتر سے برطرف کر دیا جائے۔ مگر اس معاملہ میں ڈائرکٹر بھی معزز علی کی کچھ مدد نہ کر سکا کیوں کہ سادہ لوح چپراسی ہر بار یہی بیان دیتا رہا کہ معزز علی اس دفتر کے انڈر سکریٹری ہیں اور اگر میں نے ایک انڈر سکریٹری کو انڈر سکریٹری کہا ہے تو کون سا قصور کیا ہے۔ بالآخر سچ کی فتح ہوئی اور چپراسی باعزت بری ہو گیا۔ اس واقعہ کے بعد معزز علی کی ایذا رسانی کی صلاحیت میں کچھ اور بھی اضافہ ہو گیا۔ کوئی اہل غرض اُن سے ملنے کے لئے آتا تو ملنے سے پہلے اسے گھنٹوں انتظار کراتے تھے۔ بعض اہلِ غرض تو اُن سے ملنے کے لئے اپنے ساتھ بستر بھی لے آتے تھے کہ موت اور نیند کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا۔ معزز علی نے یہ فطرت کیوں پائی تھی۔ کیسے پائی تھی اس کے بارے میں کوئی سوچنے کو تیار نہیں تھا۔ دفتر والوں کا کہنا تھا کہ کسی نے آج تک اُن کے چہرے پر ہنسی نہیں دیکھی تھی۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اُنہیں اپنے مزاج کے اعتبار سے دفتر میں نہیں بلکہ فوج میں ملازم ہونا چاہئے تھا۔ شکل ہمیشہ یوں بنائے رکھتے جیسے ارنڈی کا تیل پی

رکھا ہو۔ وہ زندگی بھر اپنے اندر غصہ کو یوں پالتے رہے جیسے کوئی مالی کسی نفیس پودے کی نگہداشت کرتا ہے۔ دفتر میں ہر کسی سے اُن کا جھگڑا ہوتا رہتا۔ فائلوں پر اپنے ماتحتین اور اپنے افسرانِ بالا دونوں سے چومکھی لڑائی لڑتے رہتے تھے۔ نتیجہ میں اُن کی صحت تو خراب ہوتی جاتی تھی لیکن فائلوں کی جسامت اور صحت دونوں بہتر ہوتی جاتی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ پہلی بار جب میں اُن کے کمرہ میں گیا تو کسی فائل کی جسامت اور صحت دونوں میں اضافہ کرنے میں لگے ہوئے تھے۔ میں چپ چاپ کھڑا رہ گیا۔ بڑی دیر بعد جب اُنہوں نے نظریں اُٹھائیں تو میں نے اپنا تعارف کرایا۔ بولے "آپ بیٹھتے کیوں نہیں۔ کھڑے کیوں ہو؟" میں نے کہا "حضور! آپ انڈر سکریٹری ہیں اور میں ایک ادنیٰ سا سیکشن آفیسر۔ میری کیا مجال کہ آپ کے سامنے بیٹھ سکوں۔" زبان سے تو کچھ نہیں کہا لیکن یوں لگا جیسے بات اُن کے دل کو لگ گئی ہو۔ اس کے بعد اُنہوں نے مجھے کبھی اپنے کمرہ میں نہیں بلایا البتہ دفتر کے ساتھیوں سے میرے بارے میں کہتے تھے کہ یہ آدمی دفتری آداب کو خوب جانتا ہے۔ میں اسے اپنے کمرہ میں اس لئے نہیں بلاتا کہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میری عافیت بھی اسی میں تھی کہ اپنی شکل سے اُنہیں اور اُن کی شکل سے اپنے آپ کو دور رکھوں۔ دفتر والوں کا کہنا تھا کہ میں دفتر کا واحد آدمی تھا جس سے معزز علی کی کبھی لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ چار پانچ برس بعد معزز علی ریٹائر ہوئے تو اُن کا وداعی جلسہ دھوم دھام سے منایا گیا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ آج تک کسی عہدیدار کو اتنا خوشی خوشی وداع کیا گیا ہو۔ یوں لگتا تھا جیسے سارا دفتر برسوں سے اُن کے وداعی جلسہ کا انتظار کر رہا ہو۔ اس کے بعد نہ کوئی معزز علی سے ملا اور نہ ہی معزز علی نے دفتر کے کسی آدمی سے ملنے کی کوشش کی۔ پورے گیارہ سال بعد اُن کا فون میرے پاس آیا تو انکشاف ہوا کہ انڈر سکریٹری کے عہدہ سے ریٹائر ہونے کے باوجود ابھی تک بقیدِ حیات ہیں۔ میں مقررہ وقت پر اُن سے ملنے کے لئے گیا تو معزز علی میرے منتظر تھے۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے تھے۔ مکان چھوٹا سا تھا جس کے دروازہ پر تختی لگی تھی "معزز علی۔ ریٹائرڈ انڈر سکریٹری۔" مجھے اس تختی کو دیکھ کر ہنسی آ گئی۔ میں نے معزز علی سے یہ نہیں پوچھا کہ ریٹائرمنٹ کے بعد انہوں نے کیسے زندگی گزاری ہے۔ گھر میں اکیلے رہتے تھے۔ پتہ چلا کہ ریٹائرمنٹ کے ایک دو مہینہ بعد ہی اُن کی بیوی اس دنیا سے چل بسی تھیں کیوں کہ وہ جانتی

تھیں کہ اُن کی شادی معزز علی سے نہیں بلکہ دفتر کے ایک انڈر سکریٹری سے ہوئی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کے تین بیٹے ہیں جو اپنی اپنی بیویوں کے ساتھ اسی شہر میں رہتے ہیں۔ کبھی کبھار اپنے باپ کی مزاج پرسی کے لئے آجاتے ہیں۔ کمرہ میں وہ تصویر نمایاں طور پر آویزاں تھی جو اُن کے وداعی جلسہ کے وقت دفتر میں کھینچی گئی تھی۔ تصویر کا رنگ چونکہ اُڑتا جارہا تھا اس سے یہ احساس ہوتا تھا کہ معزز علی کا زیادہ تر وقت اس تصویر کو دیکھنے میں صرف ہوتا ہے۔

معزز علی نے میرا زیادہ وقت نہیں لیا اور نہ ہی میں اپنا وقت اُنہیں دینا چاہتا تھا۔ معزز علی نے دُنیا کی بے ثباتی کے بارے میں دو چار جملے کہے جو مجھے اب یاد نہیں رہے۔ سماج اور سماجی تعلقات کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ پھر بولے ''یہ جان تو آنی جانی چیز ہے۔ آدمی کو اپنے پیچھے کم از کم چار آدمی تو ایسے چھوڑنے چاہئیں جو اس کے جنازے کو کندھا دے سکیں۔ آپ سے اتنے برس بعد سماجی تعلق قائم کرنے کی وجہ بھی یہی ہے۔ میرے تین بیٹے تو ہیں ہی جو اگرچہ ناخلف ہیں لیکن میرے مرنے کے بعد کندھا دینے کے لئے تو آہی جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ چوتھا کندھا آپ کا ہو۔''

معزز علی نے یہ بات اتنی سنجیدگی سے کہی کہ مجھے اندر ہی اندر ہنسی آنے لگی۔ جس آدمی نے زندگی بھر اپنے غصہ سے ہر سماجی تعلق کو توڑا تھا اسے اب پھر سے سماجی تعلق کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ میں نے معزز علی سے کہا ''آپ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں۔ ابھی تو آپ کئی برس زندہ رہیں گے۔'' بولے ''اب زندہ رہنے کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اتنے برس زندہ رہ گیا یہ بھی بہت ہے۔''

میں معزز علی سے مل کر گھر واپس آگیا۔ اس ملاقات کے ایک ہفتہ بعد صبح صبح پھر میرے فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں صبح صبح فون کی گھنٹی بجے تو میں پریشان ہوجاتا ہوں۔ میں نے سوچا کہیں معزز علی کا فون نہ ہو۔ ریسیور اُٹھایا تو پتہ چلا کہ فون معزز علی کا نہیں اُن کے بیٹے کا تھا۔ اُن کے بیٹے نے کہا ''رات جناب معزز علی ریٹائرڈ انڈر سکریٹری کا انتقال ہوگیا۔ اُن کی آخری خواہش کے مطابق آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔'' اور میں چوتھے کندھے کے طور پر اُن کی آخری رسومات میں شرکت کے لئے روانہ ہوگیا۔

(آخرکار۔ ۱۹۹۷)

تعزیتی جلسے

تعزیتی جلسے اُن جلسوں کو کہتے ہیں جو کسی کے مرنے کی مسرت میں منعقد کیے جاتے ہیں۔ ان جلسوں کے منعقد ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں ہوتا کیوں کہ موت وقت اور موسم دیکھ کر نہیں آتی۔ اسی لیے تعزیتی جلسے اچانک یوں منعقد ہو جاتے ہیں جیسے آسمان پر یکایک قوسِ قزح نکل آتی ہے۔ اِن جلسوں کے انعقاد کے لئے ایک مشہور مردہ شخصیت، دو چار زندہ مقررین، ایک پلیٹ فارم، ایک مائیکروفون اور چند سامعین کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ بعض اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ آخری ساری شرائط تو بہت پہلے سے پوری کر لی جاتی ہیں اور صرف پہلی شرط یعنی کسی مشہور شخصیت کے مرحوم ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے۔ یہ انتظار بڑا جان لیوا ہوتا ہے، کیوں کہ آپ جانتے ہیں کہ بعض مشہور شخصیتیں بڑی مشکل سے مرتی ہیں بلکہ اُنہیں تو باضابطہ مارنے کی نوبت تک آ جاتی ہے۔ پہلے یہ اطلاع ملتی ہے کہ فلاں مشہور شخصیت عارضۂ قلب میں مبتلا ہو گئی ہے۔ اس اطلاع کے ساتھ ہی تعزیتی جلسوں کا کاروبار کرنے والے منتظمین میں زندگی کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ تعزیتی جلسوں کے سارے انتظامات مکمل کر لئے جاتے ہیں اور اس کے بعد اُس مشہور شخصیت کی موت کے لیے خفیہ طور پر دعائیہ جلسے منعقد کیے جاتے ہیں۔ اگر تب بھی یہ شخصیت مرنے کا نام نہ لے تو حالتِ مایوسی میں کسی دوسری مشہور شخصیت کی جانب حسرت بھری نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اس لیے کہ موت برحق ہو یا نہ ہو انتظامات کے مکمل

ہو جانے کے بعد تعزیتی جلسے کا انعقاد ضرور برحق ہو جاتا ہے۔

مشہور شخصیتوں کے بارے میں ہم نے سن رکھا ہے کہ اُن کی موت اس وقت تک مکمل نہیں ہوتی جب تک کہ اُن کی یاد میں کوئی تعزیتی جلسہ منعقد نہ کیا جائے۔ کسی مشہور شخصیت کی موت پر تعزیتی جلسہ منعقد نہ ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ شخصیت بے موت ماری گئی ہو ــــ گویا تعزیتی جلسہ مرنے والے کے تابوت میں آخری کیل کا درجہ رکھتا ہے۔ بڑی شخصیتوں کو اچھی طرح مارنے کے لیے تعزیتی جلسہ کا حربہ استعمال کرنا ضروری ہے ورنہ اندیشہ لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ شخصیت پھر زندہ نہ ہو جائے۔ اس لئے مشہور شخصیت کی موت اور تعزیتی جلسے کے انعقاد میں زیادہ فاصلہ نہیں رکھا جاتا بلکہ اکثر اوقات تو یوں بھی ہوتا ہے کہ مرحوم کی زندگی کا خاتمہ اور تعزیتی جلسہ کا آغاز دونوں ساتھ ساتھ واقع ہوتے ہیں۔ ایک تعزیتی جلسہ تو ہم نے ایسا بھی دیکھا تھا کہ سامعین اور مقررین سب کے سب موجود تھے لیکن جلسہ شروع ہونے کا نام نہ لیتا تھا ــــــ ہم نے سرگوشی کے انداز میں ایک صاحب سے پوچھا۔ ''کیوں صاحب جلسہ کے شروع ہونے میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے؟''

ارشاد ہوا ''جی کچھ نہیں، مرحوم کے مرنے کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ سنا ہے دو چار سانسیں اور باقی رہ گئی ہیں۔''

ہم نے کہا ''خدا پر بھروسہ رکھ کر جلسہ تو شروع کیجیے۔ جلسہ کے اختتام تک بقیہ دو چار سانسیں بھی اُکھڑ جائیں گی۔''

اسی اثنا میں اطلاع آئی کہ وہ چل بسے اور جلسہ میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔

ہر شہر میں بعض ایسی انجمنیں ہوتی ہیں جو صرف تعزیتی جلسے منعقد کرنے کا کاروبار کرتی ہیں۔ اُن کے نام اس وقت سامنے آتے ہیں جب کوئی مشہور شخصیت مرتی ہے۔ اگر مشہور شخصیتیں مرنا ترک کر دیں تو یہ انجمنیں اپنی موت آپ مر جائیں گی۔ اِدھر کوئی مشہور شخصیت اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گننے لگتی ہے اور اُدھر یہ انجمنیں چیلوں اور گدھوں کی طرح اپنے شکار کے اطراف منڈلانے لگتی ہیں۔

تعزیتی جلسے کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں مرحوم کے سوائے ہر کوئی موجود ہوتا

ہے۔ یہ بڑی عجیب وغریب ریت ہے، جس شخص کے لیے یہ سارا اہتمام ہوتا ہے وہی ''مقامِ واردات'' سے غائب رہتا ہے۔ ایک تعزیتی جلسے میں ایک سامع نے ہم سے پوچھا تھا'' بھئی جن صاحب کے اعزاز میں یہ جلسہ منعقد ہو رہا ہے آخر وہ کہاں بیٹھے ہیں، ذرا مجھے بتایئے تو۔''

آپ اسے مبالغہ نہ سمجھیں کہ ہمیں ایک بار جیتے جی خود اپنے تعزیتی جلسہ میں شریک ہونے کا موقعہ ملا تھا۔ ایسا زرّین موقعہ تاریخ میں شاید ہی کسی کو ملا ہو ــــــ ہوا یوں کہ ہمارے کسی دُشمن نے اخبار میں یہ خبر شائع کرادی کہ ہم انتقال کر گئے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ایک انجمن کی جانب سے ہمارے اعزاز میں تعزیتی جلسہ کے انعقاد کا اعلان ہوا۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ پہلے ہم تعزیتی جلسہ میں شرکت کریں، کیوں کہ ایسے مواقع ہر کس وناکس کو نہیں ملتے اور اس کے بعد نہ صرف اپنے انتقال کی بلکہ جلسہ میں ہونے والی تقریروں کی تردید بھی کر دیں۔ سو ہم بھیس بدل کر اس تعزیتی جلسہ میں گئے۔ جلسہ میں ہمارے وہ سارے دُشمن جمع تھے جن سے ہمیں ازلی بَیر رہ چکا ہے۔ ایک مقرر صاحب ہمارے بازو بیٹھے تھے۔ انہوں نے بڑی متانت کے ساتھ ہم سے رومال مانگا...... ہم نے پوچھا'' کس لئے ؟''

ہمیں آنکھ مارتے ہوئے اور اپنے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ کو دباتے ہوئے بولے۔ ''اسٹیج پر تقریر کے دوران میں مجھے رونا پڑے گا نا اس لیے۔''

اور ہم نے اپنا رُومال نکال کر اُنہیں دے دیا۔

اس جلسہ میں شرکت کے بعد ہمیں پہلی مرتبہ پتہ چلا کہ ہمارے ازلی دُشمن ہمارے تعلق سے بڑے اچھے نظریات رکھتے ہیں، جو لوگ ہمیں زندگی بھر دھوکہ باز اور دغا باز سمجھتے رہے، اس دن اچانک ہماری شرافت، ہماری دیانت داری اور نیک نفسی کے گن گانے لگے۔ بعض مقررّین نے تو ایسے واقعات بھی ہم سے منسوب کئے جن سے ہماری ذات کا کوئی تعلق نہیں تھا۔ مثال کے طور پر ایک مقرر نے نہایت رِقّت کے ساتھ ہمارے بارے میں کہا'' مرحوم (یعنی ہم) بڑے خوددار آدمی تھے۔ زندگی بھر کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ مرنے سے پہلے مرحوم کی مالی حالت کافی خراب ہوگئی تھی۔ دو دن تک گھر

میں چولہا نہیں جلا تھا۔ مگر واہ ری خودداری کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ مسلسل دو دنوں تک جب اُن کا لڑکا چولہا جلانے کے لیے میرے گھر آگ مانگنے نہیں آیا تو مجھے اُن کی اس حالت کا پتہ چلا۔ چپکے سے پانچ سو روپے لے کر اُن کے گھر پہنچا۔ جب میں نے رقم اُن کے ہاتھ میں رکھی تو زار و قطار رونے لگے۔ بولے تم نے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ابھی دُنیا میں چند ایسے لوگ باقی ہیں جن سے دوستی کی جا سکتی ہے۔''

مقرّر صاحب ہمارے بارے میں یہ اظہارِ خیال کر کے یوں رونے لگے جیسے اُنہیں ہمارے مرنے کا نہیں بلکہ اپنی رقم کے ڈوب جانے کا غم کھائے جا رہا ہے۔ قطع کلام معاف۔ ہم یہ عرض کر دیں کہ ایک بار ہم نے اپنی خودداری کو بالائے طاق رکھ کر مقرر موصوف سے پانچ روپئے اُدھار مانگے تھے تو اس کے جواب میں انہوں نے اپنی پانچ سو پریشانیوں کا ذکر کیا تھا۔ ہم بڑی دیر تک صبر و سکون کے ساتھ اپنے اوصاف حمیدہ و غیر حمیدہ کے بارے میں سنتے رہے مگر جب ایک مقرر نے جنہیں ہم نے آج تک نہیں دیکھا تھا یہ انکشاف کیا کہ میٹرک کے امتحان میں ناکام ہو جانے کے بعد ہم نے خودکشی کے ارادہ سے سمندر میں چھلانگ لگائی تھی اور مقرر موصوف نے اپنی جان پر کھیل کر ہماری جان بچائی تھی تو ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ہم میں اپنے تعزیتی جلسہ کو برداشت کرنے کی تاب نہیں تھی، کیوں کہ ہمیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے ہم اپنے نہیں بلکہ کسی اور کے تعزیتی جلسے میں چلے گئے ہیں۔ اس لیے ہم فوراً وہاں سے نکل آئے اور دوسرے دن نہ صرف اپنے انتقال کی تردید کر دی بلکہ اس امر کی بھی تردید کر دی کہ ہم کبھی بھی اتنے خوددار نہیں رہے کہ گھر میں دو دن چولہا نہ جلے اور ہم کسی سے پانچ روپئے نہ مانگیں۔ ہم نے اپنی روایتی شرافت اور دیانتداری کی تردید کرتے ہوئے یہ بھی اعلان کیا کہ یہ سارے الزامات ہمارے دُشمنوں کے لگائے ہوئے ہیں، جن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔

اس واقعہ کے بعد سے ہمیں دوسروں کے تعزیتی جلسوں میں شرکت کرتے ہوئے بڑی مسرّت ہوتی ہے۔ ہم بطورِ خاص اُس گفتگو میں گہری، دلچسپی لیتے ہیں جو تعزیتی جلسوں سے پہلے ہوتی ہے۔

ایک صاحب کہتے ہیں ''مجھے تو مرحوم کے مرنے کا یقین نہیں آتا —— پرسوں

ہی میں نے انہیں عابد روڈ پر ایک رکشا والے سے حُجت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔"

دوسرا کہتا ہے "آپ پرسوں کی بات کر رہے ہیں۔ میں نے کل ہی انہیں چوری چُھپے اپنے پڑوسی کی مرغی کو پکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔"

ایک صاحب پوچھتے ہیں "مرحوم نے کوئی جائداد بھی چھوڑی ہے؟"

دُوسرا جواب دیتا ہے "جائداد کیا چھوڑیں گے۔ زندگی بھر اپنے خُسر کی جائیداد بیچ بیچ کر کھاتے رہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ وہ اپنے قرض خواہوں کے سوائے کوئی اور چیز اس دنیا میں نہیں چھوڑ گئے ہیں۔"

کوئی صاحب مصنوعی آہ بھر کر کہتے ہیں "مگر یہ مرحوم کے مرنے کے دِن نہیں تھے۔"

دوسرا کہتا ہے "بجا فرمایا آپ نے۔ ابھی مرحوم نے دُنیا کی تکلیفیں کہاں سہیں تھیں۔ ابھی تو اُن کے گھر پر قرقی نہیں آئی تھی۔ ابھی ابھی تو مرحوم کی زندگی میں پریشانیوں کا آغاز ہوا تھا۔ چند روز اور جی لیتے تو ہمیں مزہ آتا۔"

کسی گوشے میں یہ سرگوشی بھی سنائی دیتی ہے "بھئی میرا مشورہ تو یہ ہے کہ مرحوم کی یاد میں ایک میموریل کمیٹی تشکیل دی جائے۔ تم اس کے معتمد بن جاؤ، میں خازن بن جاتا ہوں، جو بھی آمدنی ہوگی، ہم دونوں ففٹی ففٹی بانٹ لیں گے۔ مرحوم کی زندگی سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا، کم از کم اُن کی موت سے تو ہمیں فائدہ اُٹھانا چاہیئے۔"

تعزیتی جلسوں میں عموماً بوڑھے ہی شریک ہوا کرتے ہیں۔ نوجوان اگر شرکت کریں تو وہ جلسہ کے دوران بڑے بے چین نظر آتے ہیں۔ چنانچہ ایک تعزیتی جلسہ میں ایک نوجوان نے دوسرے نوجوان سے شکایت کے انداز میں کہا تھا "یار! یہ تعزیتی جلسہ تو بڑا بور چل رہا ہے۔ میں نے تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا۔ اس کے بجائے اگر ہم کوئی پکچر دیکھنے چلے جاتے تو لطف آجاتا۔ آج کی ساری شام تو بس یوں ہی برباد ہوگئی۔"

ہر تعزیتی جلسہ کے بعد دو منٹ کی خاموشی بھی منائی جاتی ہے۔ جس میں بچوں کے رونے کی آواز نہایت صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔ اگر جلسہ میں خواتین موجود ہوں تو وہ اس اعلان سے دو منٹ پہلے ہی ہال سے باہر چلی جاتی ہیں، کیوں کہ خواتین کے لئے دو

منٹ کی خاموشی اختیار کرنا، دو سال کی قیدِ بامشقت کو برداشت کرنے کے برابر ہوتا ہے۔اس لیے ایک بار جب ہمیں ایک تعزیتی جلسہ کا کنوینر بنایا گیا تو ہم نے دو منٹ کی خاموشی سے پہلے یہ اعلان بھی کیا تھا کہ ''حضرات! دو منٹ بعد دو منٹ کی خاموشی منائی جائے گی۔لہٰذا خواتین سے گزارش ہے کہ وہ اس اثنا میں ہال سے باہر چلی جائیں۔''

مرد البتہ دو منٹ کی خاموشی میں بڑے جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں اور اس دو منٹ کی خاموشی میں وہ عموماً اپنے خانگی مسائل کی بابت غور کرتے ہیں۔کیوں کہ موجودہ دور اس قدر مصروفیت اور افراتفری کا ہے کہ آدمی کو غور کرنے کے لئے دو منٹ بھی بہت مشکل سے ملتے ہیں۔اسی لیے جب ہمیں کسی مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوتا ہے تو ہم کسی تعزیتی جلسے میں چلے جاتے ہیں اور دو منٹ کی خاموشی سے فائدہ اُٹھا کر اپنے مسائل کو حل کر لیتے ہیں۔اَب آپ سے کیا چھپائیں کہ ہم نے اپنی شادی کا فیصلہ خود ایک تعزیتی جلسے کی دو منٹ کی خاموشی میں کیا تھا۔یہ اور بات ہے کہ یہ دو منٹ کی خاموشی اب پھیل کر ہماری زندگی میں مستقل شور و غل، اور لڑائی جھگڑے کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔

(بہر حال۔ 1974)

ٹوکیو میں یادابنِ انشاء کی

ناظرین کرام! ہم اس وقت دُنیا کے سب سے بڑے اور سب سے مہنگے شہر میں ہیں۔ مہنگائی کا یہ عالم ہے کہ اس شہر میں ہمیں اپنے سوا کوئی اور سستی چیز نظر نہیں آتی۔ ٹوکیو کے نریتا ایرپورٹ پر جب ہم اُترے تھے تو تب ہی ہماری آنکھیں کھل گئی تھیں۔ جب ہم ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈویژن کی سربراہ مسز آسانو کے ساتھ ٹوکیو گرین ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے تو ہماری آنکھیں مزید کھلتی چلی گئیں۔ صاف شفاف اور کشادہ سڑکیں روشنی میں اس طرح نہا رہی تھیں کہ اگر سوئی بھی سڑک پر گری ہو تو صاف نظر آ جائے۔

سجے سجائے بازاروں پر حیرت کی نظر ڈالتے ہوئے ہم ٹوکیو گرین ہوٹل پہنچے۔ یہ ہوٹل مرکزی ٹوکیو میں واقع ہے۔ مسز آسانو نے ہمیں یہ خوشخبری بھی سنائی کہ شہنشاہ جاپان کا محل بھی پڑوس ہی میں واقع ہے۔ ہم نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ زندگی بھر ہمیں ایک اچھے پڑوسی کی تلاش رہی ہے جو کبھی میسر نہ آ سکا۔ شہنشاہ جاپان کے پڑوسی بن کر کچھ دن آرام سے گزار لیں گے۔ ٹوکیو گرین ہوٹل کئی منزلہ عمارت ہے۔ ہمیں اس کی چوتھی منزل میں ایک کمرہ ملا۔ نام چونکہ گرین ہوٹل ہے۔ اس لیے بڑا سرسبز و شاداب ہوٹل ہے۔ یہاں کی ہر چیز ہری ہے۔ کچھ دن بعد ہمیں اپنا رنگ بھی طوطے کی طرح ہرا نظر آنے لگا تھا۔ ٹوکیو کے بارے میں ہی کیا بلکہ سارے جاپان کے بارے میں یہ عرض کر دیں کہ جاپان کے اسّی فی صد علاقے پر پہاڑ پھیلے ہوئے ہیں۔ بیس فی صد علاقہ میدانی ہے جس پر سارے جاپانی مل جل کر رہتے ہیں۔ وہ تو اچھا ہے کہ جاپانیوں کا قد چھوٹا ہوتا ہے ورنہ ان سب کا مل جل کر رہنا دُشوار ہو جاتا۔ ادب

میں ہمارا قد جو کچھ بھی ہے اس کے بارے میں آپ بخوبی جانتے ہیں۔ لیکن ہمارا جسمانی قد پھر بھی اتنا بلند نہیں ہے، بس ۵ فٹ ۱۱ انچ کا قد ہے۔ پھر بھی ٹوکیو کی سڑکوں پر ہم نکلتے ہیں تو اپنی قد آور شخصیت کے باعث لوگوں کی توجہ کا مرکز بن جاتے ہیں۔ کچھ جاپانی دوستوں کا کہنا ہے کہ جب سے ہم ٹوکیو آئے ہیں ٹوکیو بھرا بھرا سا نظر آنے لگا ہے۔ حالانکہ آبادی اور علاقہ کے لحاظ سے یہ دُنیا کا سب سے بڑا شہر ہے۔ ٹوکیو کی آبادی ایک کروڑ سے زیادہ ہے۔ اور ہر دسواں جاپانی ٹوکیو میں رہتا ہے۔ رہنے کی جگہ کی قلت کے باعث جاپانی اپنی زمین کے ایک ایک انچ کا فائدہ اٹھاتا ہے۔ جاپانیوں کی ہر چیز چھوٹی ہوتی ہے، سوائے کردار کے۔ ہم جس ہوٹل میں ٹھہرے ہیں خود اس کا حال سُن لیجئے کہ جب ہم اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ اس میں ہر سہولت موجود ہے۔ ٹیلی ویژن ہے، ٹیلیفون ہے، کمرے سے ملحق باتھ روم بھی ہے، باتھ روم میں نہانے کا ٹب بھی موجود ہے۔ پھر پورا کمرہ ایرکنڈیشنڈ بھی ہے۔ اس میں لکھنے پڑھنے کے لئے ایک چھوٹی سی میز بھی ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ایک کرسی بھی موجود ہے۔ بس ایک تکلیف یہ ہے کہ جب بھی ہم صبح اُٹھ کر اپنے بستر میں بھرپور انگڑائی لیتے ہیں (جس کی عادت ہمیں برسوں سے ہے) تو ہماری انگڑائی کبھی ٹیلی ویژن سے ٹکرا جاتی ہے اور کبھی اس انگڑائی میں ٹیلیفون اٹک جاتا ہے۔ دو تین دن تک اپنی انگڑائی کے ذریعے ٹیلیفون کے ریسیور کو گرانے کے بعد ہم نے اب یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ آنکھ کھلتے ہی لپک کر ہوٹل کے کاریڈور میں چلے جاتے ہیں اور دو چار بھرپور انگڑائیاں لے کر پھر اپنے کمرے میں واپس آجاتے ہیں۔ صرف پینتیس دنوں تک ٹوکیو میں رہنے کی خاطر ہم اپنی برسوں کی انگڑائی سے دستبردار ہونے سے تو رہے۔ اس ہوٹل کی تنگ دامانی کا حال کبھی ہم بعد میں بیان کریں گے۔ کیوں کہ اس حال کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کرنے کے بعد ایشیائی ثقافتی مرکز کے ڈائرکٹر جنرل مسٹر ریو جی ایٹو نے ہمیں مزاح نگار تسلیم کر لیا تھا (آپ نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا ہے تو ہمیں اس کی کوئی فکر نہیں ہے ٹوکیو والوں نے تو اُردو جانے بغیر ہی ہمیں مزاح نگار مان لیا ہے، جاپانی بڑے مردم شناس ہوتے ہیں) آپ یہ نہ سمجھیں کہ ہم کسی معمولی ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ روزانہ پانچ ہزار ''ین'' (جاپانی سکہ) ادا کرتے ہیں اور وہ بھی صرف رہنے کا (یہ کرایہ بھی یونیسکو کے مہمان کی حیثیت سے ہم سے رعایت کے ساتھ وصول کیا جاتا ہے۔) کھانا ہم

ہوٹل بس کم ہی کھاتے ہیں۔ کیوں کہ ہمیں اپنی بھوک اتنی پیاری نہیں جتنی کہ عزت ہے۔ اور باتیں بعد میں ہوں گی، پہلے مسز آسانو کا حال سنئے جو ایشیائی ثقافتی مرکز کے بک ڈویژن کی سربراہ ہیں، اور جو ہمارے خیر مقدم کے لئے بہ نفسِ نفیس تشریف لے آئی تھیں۔ مسز آسانو سچ مچ جہاندیدہ خاتون ہیں۔ ساری دُنیا گھوم چکی ہیں۔ ہندوستان بھی کئی بار تشریف لا چکی ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتی ہیں۔ انہوں نے ہی ہمیں ہندوستان کے بارے میں یہ بتایا کہ ہندوستان میں چیزیں بہت سستی ہیں۔ (ہمیں یہ بات جاپان جانے تک معلوم نہیں تھی، آپ میں سے بہتوں کو اب بھی معلوم نہیں ہوگی۔) مسز آسانو نے پہلے پہل ہمیں بتایا کہ ہندوستانی بڑے مہذب، شائستہ اور ایماندار ہوتے ہیں۔ اگر خدانخواستہ مسز آسانو سے ملاقات نہ ہوتی تو ہمیں اپنے وطن عزیز کے بارے میں اتنی اہم معلومات کہاں سے حاصل ہوتیں۔ ہم تیرہ گھنٹوں کے ہوائی سفر کے بعد ٹوکیو پہنچے تھے اور یہ ہماری خوش نصیبی تھی کہ مسز آسانو ہمارے استقبال کے لئے آئی تھیں۔ ہوٹل میں ہمارا سامان رکھوانے کے بعد بولیں ''آج رات کا کھانا آپ ہمارے ساتھ کھائیں گے۔'' اس وقت رات کے آٹھ بجے تھے۔ ہم نے کہا ''مسز آسانو! مانا کہ ٹوکیو میں اس وقت رات کے آٹھ بجے ہیں مگر وطن عزیز میں اس وقت شام کے پانچ بجے ہوں گے۔ یہ وقت تو ہمارے چائے پینے کا ہے۔ یوں بھی طیارے میں ہم خوب ڈٹ کر کھا چکے ہیں۔ اب کھانے کی حاجت نہیں ہے۔''

بولیں ''ٹوکیو میں آپ کی پہلی شام میرے ساتھ گزرے گی۔ چاہے آپ چائے پئیں یا ڈنر کھائیں''۔

ہم نے مذاق میں کہا ''مسز آسانو! کیا آپ کو پتہ ہے کہ اُردو میں آپ کے نام کے کیا معنی ہوتے ہیں؟''

ہنس کر بولیں ''مجھے پتہ ہے کہ میرا نام آسانو ہے، اور آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں ہر مشکل آسان کر دیتی ہوں''۔

ہم نے حیرت سے کہا ''سچ مچ بتایئے آپ کو اپنے نام کے یہ اُردو معنی کس نے بتائے تھے۔''

اپنے چہرے پر اچانک سنجیدگی طاری کر کے بولیں۔ ''آپ ہی کی زبان کے ایک

پاکستانی ادیب ہوا کرتے تھے جو ہمارے ایشیائی ثقافتی مرکز کے سیمناروں میں شرکت کے لئے آیا کرتے تھے۔ کئی بار وہ ٹوکیو آئے۔ بڑے زندہ دل آدمی تھے۔ نام اُن کا ابن انشاء تھا۔ آپ نے اُنہیں ضرور پڑھا ہوگا۔''

ہم نے کہا'' مسز آسانو! ابن انشاء ہمارے محبوب اور پسندیدہ ادیب رہ چکے ہیں۔ ملاقات اُن سے کبھی نہیں ہوئی۔ ہمارے بڑے بھائی ابراہیم جلیس کے جگری دوست تھے۔ اتنے جگری دوست تھے کہ دونوں دو تین مہینوں کے وقفہ سے آگے پیچھے اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔''

بولیں'' بڑے زندہ دل آدمی تھے، میں تو سمجھتی تھی کہ اُنہوں نے صرف مذاق میں اور مصلحتاً میرے نام کے یہ اُردو معنی تراش رکھے تھے۔ اب آپ نے بھی میرے نام کے یہی معنی بتائے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ ابن انشاء نے میرے نام کا کوئی مزاحیہ ترجمہ نہیں کیا تھا۔ پھر آپ کا بھی کیا بھروسہ، آپ بھی تو مزاح نگار ہیں۔''

ہم نے حیرت سے کہا'' مسز آسانو! آپ کو کس نے بتایا کہ ہم مزاح نگار ہیں۔''

بولیں'' آپ ہی نے تو اپنے BIO-DATA میں سب کچھ لکھا ہے۔ میں آپ کے بارے میں سب کچھ جانتی ہوں کہ آپ سور کا گوشت نہیں کھاتے۔ آپ کی تاریخِ پیدائش بھی مجھے زبانی یاد ہے'' ہم مسز آسانو کی عام معلومات سے اس قدر متاثر ہوئے کہ فوراً اُن کے ساتھ ڈنر کھانے کے لئے چلے گئے۔

وہ بولیں'' آج رات آپ کو جاپانی ریستوراں میں نہیں ایک چینی ریستوراں میں لے جاؤں گی۔ ابھی تو آپ آئے ہیں۔ آتے ہی آپ کے جوتے کھلوانا نہیں چاہتی۔'' جاپانی ریستورانوں میں نیچے بیٹھنے کا رواج ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے حیدرآباد کے چوکی ڈنروں میں حصہ لیا ہے وہ اپنے تئیں یہ سمجھیں کہ وہ جاپانی ریستوران میں کھانا کھا چکے ہیں۔ مینو البتہ مختلف ہوتا ہے۔ ہم ٹوکیو کے جس علاقہ میں ٹھہرے ہیں اسے سوئیدو باشی کہتے ہیں۔ باشی جاپانی میں پل کو کہتے ہیں اور سارے جاپان میں آپ کو کئی باشی مل جائیں گے۔ ایک علاقہ کا نام تو شاباشی سے ملتا جلتا ہے۔ ٹوکیو کا پہلا کھانا ہم نے ایک چینی ریستوران میں کھایا۔

مسز آسانو نے پہلے تو ہمارے لئے سنگترے کا رس منگوایا۔ دہلی میں قیام کے بعد

سے ہماری عادت یہ ہوگئی ہے کہ جب بھی سنگترے کا رس پیش کیا جاتا ہے تو اس میں کالی مرچ اور نمک ضرور ملا لیتے ہیں۔ جیسے ہی ہم نے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا شروع کیا تو مسز آسانو نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا ''حسین صاحب! عجیب اتفاق ہے کہ ابن انشاء بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے تھے۔ کیا اُردو میں مزاح نگاری کرنے کے لئے سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملانا ضروری ہوتا ہے۔''

ہم نے کہا ''مسز آسانو! کہاں ابن انشاء اور کہاں ہم! ہم میں اور اُن میں ایک قدر مشترک یہی ہے کہ اُن کی طرح ہم بھی سنگترے کے رس میں کالی مرچ اور نمک ملایا کرتے ہیں۔ اس کے سوائے ہمیں کچھ نہیں آتا۔ ہم صرف رس میں نمک ملاتے ہیں۔ ابن انشاء اپنی تحریروں میں جتنا نمک مرچ ملاتے تھے وہ گر ہمیں نہیں آتا۔''

مسز آسانو پھر یادوں میں کھوگئیں اور بولیں ''شاید آپ کو پتہ نہیں ابن انشاء پہلے پہل ٹوکیو میں ہی بیمار ہوئے تھے۔ یہیں اُن کا میڈیکل چک اپ ہوا تھا۔ پھر وہ یہاں سے گئے تو ایسے گئے کہ کبھی نہیں آئے۔''

مسز آسانو کی اس بات سے ہم اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ ٹوکیو میں جب بھی ہمارے سامنے سنگترے کا رس آیا تو اس میں کبھی نمک نہیں ملایا۔

مسز آسانو نے اس رات دُنیا جہاں کی باتیں کیں۔ کئی ہندوستانی دوستوں کا ذکر کیا۔ کھانے کا بل آیا تو ہم نے دیکھا کہ مسز آسانو نے بڑی آسانی کے ساتھ ہنستے کھیلتے چار ہزار ین کی رقم ادا کردی اور ہمیں آٹے دال کے بھاؤ سے آگاہ کردیا۔

ہم ڈنر کھا کر ہوٹل پر واپس ہوئے تو دس بج رہے تھے۔ دوسرے دن پبلشنگ کا کورس اور سیمینار شروع ہونے والا تھا۔ مسز آسانو نے وعدہ کیا کہ وہ سیمینار میں ہمیں لے جانے کے لئے صبح آجائیں گی۔ اسی وقت ہماری ملاقات تھائی لینڈ کی نمائندہ مس پرینیا سے ہوئی جو اسی شام تھائی لینڈ سے پہنچی تھیں۔ ہم دس بجے اپنے کمرے میں پہنچے تو افسوس ہوا کہ اے کاش ہماری اہلیہ محترمہ آج یہاں موجود ہوتیں۔ وہ دس بجے ہمیں اپنے کمرے میں دیکھ کر کتنا خوش ہوتیں اس کا اندازہ کچھ ہم ہی لگا سکتے ہیں۔ کچھ دیر ٹیلی ویژن سے دل بہلاتے رہے۔ تاہم آدھے گھنٹے سے زیادہ جی نہیں بہلا سکے۔ کیوں کہ سارے پروگرام جاپانی میں

ہو رہے تھے۔ ہم نے سوچا کہ جب ساری زندگی رات دیر گئے لوٹنے میں گزار دی ہے تو ٹوکیو میں اس شریفانہ وضعداری سے کیوں انحراف کیا جائے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم اپنے کمرے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ مس پرینیا اپنے کمرے کے باہر کھڑی ہیں۔ پوچھا ''خیریت تو ہے''۔

بولیں ''تھائی لینڈ'' میں اس وقت آٹھ بجے ہوں گے اور مجھے اتنی جلدی سونے کی عادت نہیں ہے۔ بس بور ہوئی جا رہی ہوں۔''

ہم نے کہا '' آپ کے ہاں تو آٹھ بجے ہوں گے ہمارے ہاں تو ابھی سات ہی بج رہے ہیں۔ یوں بھی ہم شب بیدار قسم کے آدمی ہیں۔ لہٰذا ٹوکیو کی سڑکیں ناپنے باہر جا رہے ہیں۔''

بولیں '' آپ اجازت دیں تو میں بھی آپ کے ساتھ چلتی ہوں''۔ ہم دونوں ٹوکیو گرین ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ طے کیا کہ سڑکوں کی نشانیاں ذہن میں محفوظ کر کے چلتے ہیں تاکہ واپسی میں آسانی ہو۔ ہوٹل کے کاؤنٹر سے ٹوکیو گرین ہوٹل کا کارڈ بھی اپنی جیب میں رکھ لیا۔ پہلے ایک ٹیلی فون بوتھ کی نشانی ذہن میں محفوظ رکھی کہ اس کے برابر والی گلی میں مڑنا ہے۔ بیس قدم کے بعد ایک اور بوتھ ملا۔ جاپان میں ہر سڑک پر قدم قدم پر آپ کو ٹیلی فون بوتھ ملیں گے۔

ٹوکیو اس اعتبار سے خالص ایشیائی شہر نظر آیا کہ یہ ساری رات جاگتا ہے۔ تقریباً ساری رات ہوٹلیں کھلی رہتی ہیں (حیدر آباد والے پتھر گٹی کو اپنے ذہن میں رکھیں) سڑکوں پر ٹریفک برابر جاری رہتا ہے۔ ہم بڑی دیر تک ٹوکیو کی سڑکوں پر گھومتے رہے۔ دو گھنٹوں بعد واپس ہوئے تو ہم سچ مچ تھک چکے تھے۔ جب ہم اپنے کمرے کی طرف جانے لگے تو مس پرینیا نے انگریزی آداب کے مطابق ہم سے کہا'' آج رات کوئی اچھا سا خواب دیکھئے۔'' ہم نے کہا'' مس پرینیا کیا کریں کمرہ اتنا چھوٹا ہے کہ اس میں کسی خواب کے داخل ہونے کی گنجائش ہی نہیں ہے۔''

مس پرینیا نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ بعد میں انہوں نے ہمارے اس جملے کو سیمینار کے شرکاء میں اس قدر مقبول کیا کہ بالآخر اس کی اطلاع

ہوٹل کے انتظامیہ تک پہنچ گئی اور انتظامیہ کے ایک فرد نے ہم سے ازراہِ مذاق یہاں تک کہا کہ اگر آپ کو خواب دیکھنے کے لئے بڑے کمرے کی ضرورت ہے تو وہ آپ کو مل جائے گا۔ دس ہزار ین کرایہ دینا ہوگا۔

(جاپان چلو، جاپان چلو۔ ۱۹۸۳)

جنابِ صدر

بچپن میں جب پہلی بار ہمیں ایک جلسہ میں شریک ہونے کا موقع ملا تو دیکھا کہ جلسہ کا ہر مقرر 'جناب صدر' 'جناب صدر' کی گردان کر رہا ہے اور وقت بے وقت 'جناب صدر' کی اجازت سے ایسی باتیں کہہ رہا ہے جن کے کہنے کے لیے بظاہر کسی بھی اجازت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنے طور پر یہ پتہ چلانے کی کوشش کی کہ آخر یہ 'جناب صدر' کون ہے اور کہاں واقع ہے۔ ایک شخص کو دیکھا جو بڑی مستعدی کے ساتھ جلسہ گاہ کے آخری حصے میں دریاں بچھا رہا ہے اور پٹرومکسوں کو اِدھر اُدھر منتقل کر رہا ہے۔ چونکہ اُس وقت یہ شخص جلسہ کا سب سے کارکرد اور اہم شخص نظر آر ہا تھا، اس لیے ہم نے سوچا کہ ہو نہ ہو یہی شخص "جنابِ صدر" ہے۔ ہم اس کے قریب گئے اور پوچھا "بھئی کیا جنابِ صدر تم ہی ہو؟"

وہ شخص اچانک بپھر گیا اور بولا "ذرا منہ سنبھال کے بات کرو، کسے جنابِ صدر کہتے ہو؟۔ کیا میں تمہیں ناکارہ، مفلوج اور بیکار آدمی نظر آتا ہوں، جو تم مجھے "جنابِ صدر" کہہ رہے ہو۔ ابھی تو میرے قویٰ اچھے ہیں، میں اپنی روزی خود کماتا ہوں۔ میں ابھی اتنا اپاہج بھی نہیں ہوا کہ تم مجھے "جنابِ صدر" کہو۔ جناب صدر تو وہ ہے جو ڈائس پر اپنے سامنے پھولوں کے ہار رکھے یوں بیٹھا ہے جیسے شیر اپنے مارے ہوئے شکار کو سامنے رکھتا ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اُس نے اُس شخص کی طرف اشارہ کیا جو کرسیِ صدارت پر تقریباً اونگھ رہا تھا۔

اُس دن کے بعد سے آج تک ہم بے شمار جلسوں میں شرکت کر چکے ہیں بلکہ دو ایک جلسوں کی تو صدارت کا آفر بھی ہمیں آیا تھا لیکن جب ہم نے اس آفر کو قبول کرنے کے بارے میں غور کیا تو ہمیں اس شخص کی بات یاد آ گئی اور ہمیں احساس ہوا کہ ابھی تو ہم اپنی روزی خود کما سکتے ہیں اور ہم ابھی اتنے اپاہج بھی نہیں ہوئے کہ ''جنابِ صدر'' بننے کا اعزاز حاصل کریں۔

آپ نے بہت سے صدر دیکھے ہوں گے، اور آپ کو اس بات کا یقین بھی آ چکا ہوگا کہ ہر صدر دُوسرے صدر سے ملتا جلتا ہوتا ہے۔ خُدا نے انسان کے ایک ہاتھ کی پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں بنائی ہیں، لیکن تعجب ہے کہ اُس نے سارے صدر ایک جیسے کس طرح بنائے۔ اُن کی سرگرمیاں مشترک ہوتی ہیں، اُن کی حرکتیں مشترک ہوتی ہی اور اُن کے کاروبار بھی مشترک۔

''جنابِ صدر'' کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ کرسیٔ صدارت پر گوند لگا کر بیٹھ جائے اور کبھی ''کرسی'' سے ہٹنے کی کوشش نہ کرے۔ اُسے صرف اتنی رعایت حاصل ہوتی ہے کہ اگر ایک ہی رُخ پر مسلسل بیٹھنے کی وجہ سے اس کے اعضاء میں درد ہونے لگے یا کرسیٔ صدارت میں سے کوئی کھٹمل نکل کر ''جنابِ صدر'' کو بے تاب کرنے لگے، تب وہ صرف اپنا پہلو بدل سکتا ہے لیکن کرسی سے اپنا پہلو نہیں بچا سکتا۔ بعض صدور کو صدارت کی کرسی پر اتنی دیر تک بیٹھنا پڑتا ہے کہ ایک منزل وہ بھی آتی ہے جب کرسی اور صدر میں کوئی فرق باقی نہیں رہ جاتا۔ حاضرینِ جلسہ کو یہ اندازہ لگانے میں دُشواری پیش آتی ہے کہ کرسی کہاں ختم ہو رہی ہے اور ''جنابِ صدر'' کہاں سے شروع ہو رہے ہیں۔ ''کرسی'' اور ''صدر'' یک جان دو قالب بن جاتے ہیں۔ ہمیں اس وقت اُس بچہ کی یاد آ رہی ہے، جس نے کُرسیٔ صدارت پر ایک صدر کو لگاتار دو گھنٹوں تک دیکھتے رہنے کے بعد اپنے باپ سے پوچھا تھا: ''ڈیڈی! کیا جنابِ صدر کی چھ ٹانگیں ہوتی ہیں؟''

اس پر باپ نے بڑے پیار سے بیٹے کو سمجھایا تھا ''نہیں بیٹے! ان چھ ٹانگوں میں سے دو ٹانگیں جنابِ صدر کی ہیں اور بقیہ چار ٹانگیں ''کرسیٔ صدارت'' کی ہیں۔''

اگرچہ مثل مشہور ہے کہ ''صدر ہر جا کہ نشیند صدر است''، لیکن اس کے باوجود

''صدارت'' کے لیے ''کرسیِ صدارت'' کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ بلکہ ایک صاحب کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ''صدارت'' میں ''کرسیِ صدارت'' کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کرسی ہٹا لیجئے تو صدارت خود بخود غائب ہو جائے گی۔ کرسیِ صدارت پر بیٹھنے کے لیے بڑے تجربہ اور مہارت کی ضرورت ہوتی ہے بلکہ ہم تو سمجھتے ہیں کہ پیشہ ور صدر اس فن میں باضابطہ تربیت بھی حاصل کرتے ہیں، کیوں کہ ایک ہی کرسی پر خواہ مخواہ گھنٹوں بیٹھے رہنا بھی تو آخر کرتب کا درجہ رکھتا ہے۔ بعض ماہر جنابِ صدر تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو ''کرسیِ صدارت'' پر کچھ اس طرح جم کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ''صدارت'' کی کرسی آیۃ الکرسی پڑھنے لگتی ہے اور بالآخر ٹوٹ جاتی ہے، مگر جنابِ صدر نہیں ٹوٹتے۔ ایسے ''کرسی توڑ صدر'' کے لئے تابڑ توڑ نئی کرسیِ صدارت منگوانی پڑتی ہے اور ہوشیار منتظمین جلسہ ہمیشہ ایک فاضل کرسیِ صدارت ریزرو میں رکھتے ہیں کہ آفت کی گھڑی جنابِ صدر کی اجازت لے کر نہیں آتی۔

جنابِ صدر دو اقسام کے ہوتے ہیں۔ ایک پیدائشی صدر اور دُوسرا نمائشی صدر۔ ویسے ایک صاحب کا کہنا ہے کہ یہ تقسیم بھی کچھ مناسب نہیں ہے، کیوں کہ صدر چاہے پیدائشی ہو یا نمائشی، وہ ہر حالت میں نمائشی ہوتا ہے اور پھر دونوں ہی اقسام کے صدر ایک ہی قسم کی حرکتیں کرتے ہیں۔

اُن کی حرکتوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ جب مقرر تقریر کر رہا ہو تو وہ ٹکٹکی باندھے مقرر کو گھورتے رہیں اور وقت بے وقت اپنی گردن بھی ہلایا کریں۔ یہ گردن بھی اس لیے ہلائی جاتی ہے کہ کہیں حاضرینِ جلسہ یہ نہ سمجھ بیٹھیں کہ ''کرسیِ صدارت'' پر ''صدر جلسہ'' کے بجائے صدر جلسہ کا مجسمہ بیٹھا ہوا ہے۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے ''صدرِ جلسہ'' کو اور بھی بہت سے فرائض انجام دینے پڑتے ہیں۔ یعنی کبھی جلسہ کے سکریٹری کو بلایا جاتا ہے اور اس کے کان میں پوچھا جاتا ہے ''کیا آپ نے کسی فوٹو گرافر کا انتظام نہیں کیا ہے۔ جلسہ کی کارروائی بڑی بے جان سی چل رہی ہے۔ فوراً کسی فوٹو گرافر کو پکڑ کر لائیے۔'' میز پر رکھے ہوئے پیڈ کو صدر اپنے سامنے کھینچ لیتا ہے اور مقرر کی طرف دیکھ دیکھ کر کچھ لکھنے لگتا ہے۔ حاضرین سمجھتے ہیں کہ وہ ضرور کوئی اہم پوائنٹ لکھ رہا ہے لیکن آپ غلط فہمی میں مبتلا نہ رہیں۔ کیوں کہ وہ اس وقت اصل میں ان ہاروں کا حساب لکھنے میں مصروف رہتا ہے جو اُسے

پہنائے گئے۔ اس کے بعد وہ پیڈ کو آگے بڑھا دیتا ہے۔ پھر حاضرین پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالتا ہے، اُن کی تعداد کا اندازہ لگاتا ہے اور دل ہی دل میں خوش بھی ہوتا ہے۔ بعض صدور جلسہ اپنے ساتھ اپنی بیویوں کو بھی لے آتے ہیں تاکہ بیویوں پر اُن کی دھونس جمی رہے۔ وہ تھوڑے تھوڑے وقفہ سے اپنی بیوی کی طرف کچھ ایسی نگاہوں سے دیکھتا ہے جیسے وہ اپنی بیوی کو پہلی بار دیکھ رہا ہو یا جیسے وہ اُسے پہچانتا ہی نہ ہو صدر جلسہ کی بیوی جلسہ گاہ میں بیٹھی پیچ و تاب کھاتی ہے مگر کچھ کر نہیں سکتی، اس لئے کہ کرسیٔ صدارت تک اُس کی رسائی ممکن نہیں ہوتی اور صدرِ جلسہ بھی جانتا ہے کہ جب تک وہ کرسیٔ صدارت پر براجمان ہے، اس وقت تک وہ ساری آفات اور خود اپنی بیوی سے ہر طرح محفوظ ہے۔

عام طور پر جلسوں میں وہ منظر بڑا دِل نشین ہوتا ہے جب صدرِ جلسہ کو ہار پہنائے جاتے ہیں اور جلسوں کی روایت کے مطابق پہلے صدر کو ہار پہنائے جاتے ہیں، اور تب کہیں جلسہ کی کارروائی شروع ہوتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ روایت بھی ''صدر جلسہ'' کی طرف سے ہی ڈالی گئی ہے کیوں کہ جلسہ سے پہلے ہار پہنا دیئے جائیں تو دِل کو بڑا سکون رہتا ہے ورنہ یہ اندیشہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ جلسہ کے بعد منتظمین، ہاروں کے معاملے میں بالکل ہی خاموش اور انجان بن جائیں کہ غرض نکل جانے کے بعد کون کسی کی ضرورت کے بارے میں سوچتا ہے۔ لہٰذا ''صدور'' پہلے ہار پہنتے ہیں اور بعد میں جلسہ شروع کرتے ہیں۔ ویسے ہار پہننے کے بعد کم از کم ''صدر جلسہ'' کے لیے تو جلسہ تقریباً برخاست ہوجاتا ہے۔ وہ تو بس تکلفاً بیٹھا رہتا ہے، جب اُسے ہار پہنائے جاتے ہیں فوٹو گرافر کی موجودگی نہایت ضروری ہوتی ہے۔ جب تک فوٹو گرافر نہ آئے اس وقت تک ''صدر جلسہ'' ہاروں میں اپنی گردن نہیں ڈالتا۔ ہم ایک جلسہ کے عینی شاہد ہیں، جس میں صدر جلسہ کی گردن ہار کی طرف بڑھ رہی تھی اور ہار گردن کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک فوٹو گرافر کے کیمرہ میں کوئی خرابی پیدا ہوگئی۔ جب صدر جلسہ کو اس خرابی کا پتہ چلا تو اُنہوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ اپنی گردن ہار میں سے نکال لی۔ لیکن جلسہ کا سکریٹری برابر اُن کی گردن کا تعاقب کررہا تھا۔ یقین مانئے کہ ''صدر مذکور'' نے ہار پہننے کے معاملہ میں اُس دن ایسی ہی حرکت کی جیسے کوئی اڑیل گھوڑا منہ میں لگام ڈالنے کے وقت کرتا ہے۔ بالآخر جب کیمرہ دُرست ہوگیا تو ''صدر جلسہ'' کو چمکار کر ہار کی طرف لایا گیا

اور جب کیمرہ کا فلش بلب جَل اُٹھا تو لوگوں نے دیکھا کہ صدر کی گردن ہار میں داخل ہوگئی ہے۔ صدر جب ہار پہن لیتا ہے تو اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے اور یہ دیکھ کر اُسے پہنائے گئے ہاروں کے پھول خود بخود مُرجھا جاتے ہیں۔

صدر جلسہ اس وقت بہت خوش ہوتا ہے جب جلسہ کا صدر استقبالیہ اپنی خیر مقدمی تقریر میں ''صدر جلسہ'' کی اعلیٰ صفات کا ذکر کرتا ہے۔ جب اس کی تعریف ہونے لگتی ہے تو ''صدر جلسہ'' جان بوجھ کر چھت کی طرف دیکھنے لگتا ہے اور اگر جلسہ زیرِ سماں ہو رہا ہو تو تارے گننے میں مصروف ہو جاتا ہے، اُس کی نظر تو اوپر ہوتی ہے لیکن کان صدرِ استقبالیہ کی طرف مڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ واضح رہے کہ ہر صدر بڑا مصروف رہتا ہے اور وہ اپنی گوناگوں مصروفیات میں سے تھوڑا سا وقت بڑی مشکل سے نکالتا ہے، حالانکہ جناب صدر کے قریبی حلقے بخوبی جانتے ہیں کہ جنابِ صدر کے سامنے وقت کا ایک وسیع سمندر ہمیشہ ٹھاٹھیں مارتا رہتا ہے اور اس سمندر میں ''صدارتوں'' کی حیثیت اُن جزیروں کی سی ہوتی ہے، جہاں ''جنابِ صدر'' تھوڑی دیر کے لیے ستالیتا ہے۔

سب سے آخر میں جب ''جنابِ صدر'' اپنی صدارتی تقریر کے لیے اُٹھ کھڑا ہوتا ہے تو پہلے اپنی گھڑی کی طرف دیکھتا ہے اور حاضرین کو یہ موقعہ عطا کرتا ہے کہ اس کے کرسیٔ صدارت سے اُٹھ کر مائیکروفون کے قریب پہنچنے تک وہ تالیاں بجا سکیں۔ پھر وہ بڑی سادگی کے ساتھ صدر استقبالیہ کی تقریر کے خلاف ایک تردیدی بیان جاری کرنے لگتا ہے کہ آپ نے میرے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ صرف ذرّہ نوازی ہے۔ ورنہ خاکسار تو اس قابل بھی نہیں کہ اُسے کسی جلسہ میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ وہ اپنی تقریر میں منتظمین کو جلسہ کے انعقاد پر مبارکباد دیتا ہے اور مستقبل میں بھی ایسی غلطیوں کا ارتکاب کرنے کا پُر خلوص مشورہ دیتا ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہتا ہے کہ وہ ہر وقت منتظمین سے تعاون کرنے کے لیے تیار ہے۔ اس تعاون کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ اگلی بار بھی صدارت کرنے کے لیے تیار ہے۔

صدر جلسہ کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ ہر موضوع پر اظہارِ خیال کر سکتا ہے۔ وہ کسی جلسہ میں ''پولٹری فارمنگ'' پر اظہارِ خیال کرتا ہے تو دُوسرے جلسہ میں ''ماہی گیری کی اہمیت'' پر روشنی ڈالتا ہے۔ کہیں ''دیا سلائی بنانے کی صنعت کے فوائد'' بیان کرتا ہے تو کہیں ''صابن

سازی'' کے موضوع پر اظہارِ خیال کرتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ آدمی جب ایک بار ''صدر جلسہ'' بن جاتا ہے تو پھر زندگی بھر وہ ''صدر جلسہ'' ہی برقرار رہتا ہے۔ کرسیٔ صدارت اس سے چمٹ کر رہ جاتی ہے اور معاملہ وہی ہوتا ہے کہ میں کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔

یاد رکھئے کہ صدر جلسہ ہمیشہ جلسہ میں دیر سے آتا ہے۔ اس کے دیر سے آنے کی کئی وجوہات ہوتی ہیں۔ وہ لوگوں کو اپنے انتظار میں مبتلا کر کے اپنی اہمیت اُن پر واضح کرنا چاہتا ہے۔ حالانکہ وہ صبح ہی سے شام کے جلسہ کی ''صدارت'' کی تیاریاں شروع کر دیتا ہے۔ کپڑوں پر استری کرواتا ہے، جوتوں کے ساتھ ساتھ خود اپنی صدارتی تقریر کو پالش کرواتا ہے۔ آئینہ کے سامنے ٹھہر کر ''کرسیٔ صدارت'' پر بیٹھنے کے مختلف ''پوزوں'' کا جائزہ لیتا ہے لیکن اس کے باوجود جلسہ میں دیر سے پہنچتا ہے۔ ہمیں اس وقت اُس ''صدر جلسہ'' کا لطیفہ یاد آرہا ہے جسے زندگی میں پہلی بار ''صدر جلسہ'' بننے کا موقعہ ملا تھا اُس نے اپنی صدارت کے لیے خوب سارا اہتمام کیا لیکن جلسہ میں بہت دیر سے پہنچا۔ منتظمین نے کافی دیر تک انتظار کرنے کے بعد ایک ''ریڈی میڈ صدر'' کی خدمات حاصل کیں اور صدارت کے فرائض اُسے سونپ دیئے۔ پہلا صدر اس بات پر بہت برہم ہوا۔ منتظمین نے جب اس سے دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو وہ بولا'' بھائی میں دراصل جلسہ کے کاموں میں ہی مصروف تھا۔ چونکہ یہ جلسہ میری صدارت میں ہو رہا تھا، اس لیے میں دن بھر جلسہ کے پوسٹر شہر کی دیواروں پر چسپاں کرتا رہا۔ پوسٹر لگانے سے اب فرصت ملی ہے تو جلسہ میں آیا ہوں۔''

ہر جگہ آپ کو چند شخصیتیں ایسی ضرور مل جائیں گی جو ''صدارت'' کا کاروبار کرتی ہیں اور جہاں ''صدر جلسہ'' کی آبادی بہت زیادہ ہوتی ہے وہاں صدارت کے مسئلے پر جھگڑے بھی اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ صدر جلسہ کی بہتات اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک کی آبادی بڑھ رہی ہے اور ''صدور جلسہ'' کی بیروزگاری کو دُور کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ایک شہر کے لیے ''دو یا تین صدر بس'' کے اُصول پر عمل کریں۔

(بہر حال۔ ۱۹۷۴)

تجھے اے جنوری ہم دُور سے پہچان لیتے ہیں

بزرگوں سے سن رکھا ہے کہ سال کے بارہ مہینے ہوتے ہیں اور ہر سال کا آغاز جنوری کے مہینے سے ہوتا ہے۔ بزرگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے، مگر ہم نے جب حساب لگایا تو پتہ چلا کہ سال میں صرف گیارہ مہینے ہوتے ہیں اور ہمارا شخصی اور اصلی سال جنوری سے نہیں فروری سے شروع ہوتا ہے۔ حساب کا یہ گھپلا کئی برس سے چلا آرہا ہے۔ جنوری کی آمد کے خوف سے ہم دسمبر ہی میں گھبرانے لگتے ہیں۔ اور ہمارے دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے کیوں کہ ع

تجھے اے جنوری ہم دور سے پہچان لیتے ہیں

اس مہینہ سے ہمارے خوف کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہی وہ مبارک و مسعود مہینہ ہے جس میں ہماری شادی ہوئی تھی۔ اگرچہ یہ سانحہ پچیس برس پہلے پیش آیا تھا مگر یہ اسی سانحۂ جاریہ کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہماری چار اولادوں کے تین جنم دن اسی مہینے کی مختلف تاریخوں میں آتے ہیں۔ آپ پوچھیں گے کہ چار اولادوں کے تین جنم دن کیوں کر ہوتے ہیں۔ تو جواب اس کا یہ ہے کہ جنوری کا مہینہ ہی حساب کے گھپلے کا ہوتا ہے، ہماری دو سعادت مند اولادیں جنوری کی ایک ہی تاریخ کو پیدا ہوئی تھیں۔ ہم ان دونوں بیٹوں کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے اپنی پیدائش کے لئے ایک ہی تاریخ کا انتخاب فرمایا ورنہ ہمیں اُن کے جنم کو دو الگ الگ تقریبوں کی صورت میں منعقد کرنا پڑتا۔ تاہم اُن سے یہ شکایت ہے کہ اُنہوں نے اپنی پیدائش کے لئے مہینہ کا انتخاب غلط فرمایا۔ میاں پیدا ہونا اتنا ہی ضروری تھا تو کسی اچھے مہینے

میں پیدا ہوتے۔

لوگ کہتے ہیں کہ جنوری کا مہینہ خوشیوں اور مسرتوں کا مہینہ ہوتا ہے۔ یہی وہ مہینہ ہوتا ہے جس کی پہلی تاریخ سے نیا سال شروع ہوتا ہے۔ لوگ خوش ہوتے ہیں کہ وہ گذرے ہوئے سال کے چنگل سے بچ کر نکل آئے۔ لہٰذا اس خوشی میں آدمی کیا کیا نہیں کرتا۔ اسی جنوری کی پہلی تاریخ کا واقعہ ہے کہ نئے سال کی عمر ابھی پندرہ منٹ بھی نہیں ہوئی تھی اور ہم ایک دوست کے گھر سے نئے سال کی پارٹی بھگتا کر واپس ہو رہے تھے کہ ہمیں ایک صاحب نظر آئے جو نفیس سوٹ میں ملبوس فٹ پاتھ پر چاروں خانے چت لیٹے ہوئے تھے۔ ہم نے سوچا عجیب آدمی ہیں۔ ساری دنیا نئے سال کی آمد کی خوشیاں منا رہی ہے اور یہ شدید سردی میں فٹ پاتھ پر آرام فرما رہے ہیں۔ ہم نے ازراہِ ہمدردی اُن کے قریب جا کر انہیں جگاتے ہوئے کہا ''حضرت اٹھئے کہ زمانہ قیامت کی چال چل گیا ہے۔ نیا سال آگیا ہے اور کم از کم نئے سال میں تو اپنے گھر جا کر سو جائیے۔''

یہ سنتے ہی موصوف نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ ایک عدد ہچکی لی اور ''نیا سال مبارک ہو'' کہہ کر ہم سے یوں بغل گیر ہوئے جیسے ہماری پسلیوں کی مضبوطی کا امتحان لینا چاہتے ہوں۔ امتحان لے چکے تو اچانک ہمارے قدموں میں گر گئے اور گڑگڑا کر معافی مانگنے لگے کہ اگر پچھلے سال میں اُن سے کوئی غلطی ہوئی ہو ہم اُنہیں معاف کر دیں۔

ہم نے اُنہیں بہتیرا سمجھایا کہ پچھلے سال میں آپ سے ہماری ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ ہم تو ابھی نئے سال میں پانچ منٹ پہلے آپ سے متعارف ہوئے ہیں اگر آپ سے غلطی ہو بھی جائے تو نئے سال میں ہوگی۔ پچھلے سال میں نہیں۔

آب دیدہ ہو کر بولے یہ آپ کی بڑائی ہے ورنہ میں نہایت برا آدمی ہوں۔ گناہگار ہوں۔ خطا کار ہوں۔ اتنا کہہ کر اُنہیں نہ جانے کون سے ناکردہ گناہ یاد آگئے کہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ہم نے انہیں دلاسہ دینے کی کوشش کی تو لڑکھڑا کر اپنی دونوں بانہیں ہماری گردن میں ڈال دیں اور جسم کا سارا بوجھ ہماری نازک گردن پر کچھ اس طرح ڈال دیا کہ ہم بھی نئے سال کی مسرت میں اُن کے ساتھ فٹ پاتھ پر گر گئے۔ اب نیا سال ہمارے سر سے اونچا ہو گیا تھا۔ لہٰذا موقع کو غنیمت جان کر ہم وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بڑی دُور تک

اُن کی آوازیں آتی رہیں کہ ”بھیا! نئے سال کی مبارکباد تو قبول کرتے جاؤ۔“

اس واقعہ کے بعد سے اب تک بے شمار افراد نے ہمیں نئے سال کی مبارک باد دی ہے مگر اس نئے سال کی پہلی مبارک باد ہمیں کچھ اس طرح ملی ہے کہ ہر مبارک باد پر جی گھبراتا ہے۔ دوسرے دن صبح صبح اخبار والے نے ہم سے کہا۔ ”صاحب نیا سال آپ کو مبارک ہو، پچاس روپے نکالئے۔ پچھلے مہینے بھی آپ نے اخبار کا چندہ نہیں دیا تھا۔“

نئے سال کے موقع پر ہم اسے مایوس کرنا نہیں چاہتے تھے لہٰذا ہم نے اُس سے مبارک باد اور اُس نے ہم سے چندہ وصول کیا۔ وہ چلا گیا تو ہمارے مالک مکان نئے سال کی مبارک باد دینے آگئے، بڑی گرم جوشی کے ساتھ نئے سال کی مبارک باد دی۔ پچھلے سال کی زیادتیوں کا رقت آمیز لہجہ میں ذکر کیا۔ ان آفات ارضی وسماوی کا مثالوں کے ساتھ حوالہ دیا جو ان پر پچھلے سال ٹوٹی تھیں۔ نئے سال کے مبارک موقع پر ہی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ دس مہینے پہلے ہمارے مالک مکان کی چہیتی بھینس اس دُنیا سے گذر گئی۔ ضمنی طور پر اُنہوں نے اپنی ساس کے گذر جانے کا سانحہ بھی سنایا۔ لیکن اس سانحہ کو بیان کرتے وقت اُن کے لہجہ میں وہ رقت نہیں تھی جو بھینس کے گزر جانے کے سانحہ کو بیان کرتے وقت اُن کے لہجہ میں سمٹ آئی تھی۔ یوں بھی بھینس اور ساس کا کیا مقابلہ، ساس سب کچھ کرسکتی ہے مگر دودھ تو نہیں دے سکتی۔ ہر سال کی طرح ہم ان کے پچھلے سال کے غموں میں شریک ہوگئے تو انہوں نے دبی زبان میں التجا کی کہ پچھلے سال ان کے ساتھ جو کچھ ہوا ہے اُس کی تلافی کے طور پر ہم نئے سال میں اُن کے مکان کے کرایہ میں اضافہ کردیں کیوں کہ عموماً کرایہ میں اضافہ کے بعد بھینس اور ساس کے گذر جانے کا غم کچھ ہلکا ہوجاتا ہے۔ مالک مکان ہونے کا سب سے بڑا فائدہ ہمیں یہی نظر آیا کہ مکان کے کرائے میں اضافہ کرکے مالک مکان ہر قسم کے غم کو برداشت کرنے کے قابل ہوجاتا ہے۔ نئے سال کے پر مسرت ماحول میں ہم کسی کو مایوس نہیں کرنا چاہتے تھے لہٰذا کرایہ میں اضافہ کی بات مان لی۔ تاہم ڈرتے ڈرتے مکان مالک سے دست بستہ عرض کی کہ حضور! وہ جو ہم نے دو سال پہلے کی پہلی جنوری کو مکان کی سفیدی کرانے کی درخواست کی تھی تو اس کا کیا ہوا؟

بولے ”اگلے سال جب میں نئے سال کی مبارک باد دینے آؤں تو ضرور یاد

دلا یئے گا۔ انشاء اللہ کچھ نہ کچھ ضرور ہو ہی جائے گا۔"

ہم نل کی ٹونٹیوں کی خرابی، گھر کے دروازوں کی خستہ حالت اور چھت کے ٹپکوں کی طرف آنا ہی چاہتے تھے کہ ہمارے مالک مکان نے موضوع کو بدلتے ہوئے کہا" صاحب! نئے سال کے خوش گوار ماحول میں آپ کن ناخوش گوار باتوں کا ذکر لے بیٹھے۔ آپ کا اور ہمارا تو جنم جنم کا ساتھ ہے، یار زندہ صحبت باقی، پھر ایک بار نئے سال کی دلی مبارک باد قبول فرمایئے۔ اچھا تو میں چلتا ہوں۔" یہ کہہ کر وہ چلے گئے تو دیکھا کہ گھر کے سامنے ایک ٹیکسی آ کر رُک گئی، اس میں سے ہمارے ایک ایسے عزیز دوست اپنے بال بچوں سمیت برآمد ہوئے جن کی صورت ہم نے دس برسوں سے نہیں دیکھی تھی۔ ہمیں دیکھتے ہی گلے سے لگ گئے اور بولے" نیا سال مبارک ہو۔ بمبئی سے سیدھا تمہارے پاس آ رہا ہوں، کئی برس سے تم سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ تم نے میرے بچوں کو بھی نہیں دیکھا تھا، سوچا کہ اس بار تمہیں شخصی طور پر نئے سال کی مبارک باد دی جائے۔ بس دو دن تمہارے گھر مہمان رہوں گا تا کہ تمہیں اچھی طرح نئے سال کی مبارک باد دے سکوں۔"

ہر نئے سال پر جنوری کے مہینے میں ہمارے پاس عموماً اسی طرح کے ملنے والے آتے ہیں۔ پتہ نہیں لوگوں کو نئے سال کی مبارک باد دینے میں کیا مزہ آتا ہے کہ وہ زندگی کو بھول کر صرف مبارک باد دینے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ نئے سال کے پہلے ہفتے میں ہم کوئی کام کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ صرف نئے سال کی مبارک باد ہی قبول کرتے رہتے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ نئے سال کے پہلے ہفتے میں ہماری زندگی کی سرگرمیاں رُک جاتی ہیں۔ اگر کوئی گالی بھی دے تو اُسے" آپ کو بھی نیا سال مبارک ہو" کہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ ایک منزل وہ بھی آتی ہے جب ہمیں نئے سال کی مبارک باد ایک گالی کی طرح دکھائی دینے لگتی ہے۔ بس میں کوئی مسافر آپ کو دھکا دیتا ہے تو اظہارِ ندامت کرنے سے پہلے آپ کو نئے سال کی مبارک باد دیتا ہے۔ گویا خبر دار کرنا چاہتا ہو کہ نئے سال میں بسوں میں نت نئے دھکے کھانے کے لئے تیار رہیے۔

ان مبارک باد دینے والوں سے فرصت ملتی ہے تو ہمارے پاس نئے سال کے کارڈ آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ عموماً یہ تہنیتی کارڈ اُن افراد کی طرف سے آتے ہیں جنہوں نے یا تو

ہم سے پچھلے سال میں کوئی فائدہ اُٹھایا تھا یا آنے والے سال میں ہم سے فائدہ اُٹھانے کا ارادہ رکھتے ہوں۔ جنوری کے آدھے مہینہ میں ہم اُن کارڈوں کو وصول کرتے ہیں اور بقیہ آدھا مہینہ اُن کارڈ بھیجنے والوں کا شکریہ ادا کرنے میں گذر جاتا ہے۔ اس بیچ اہل غرض ہمارے پاس نئے سال کے کلینڈر بھیجنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کلینڈروں پر عموماً ایسی دوشیزاؤں کی تصویریں ہوتی ہیں جن کے بدن پر گھڑی کے سوائے کوئی اور لباس نہیں ہوتا۔ ان کلینڈروں کو دیکھ کر جنوری کے مہینہ میں کئی راتوں تک ہمیں نیند نہیں آتی۔

ہم نے یہ بھی محسوس کیا ہے کہ جنوری کے مہینے میں آدمی خواہ مخواہ ہی مہذب اور شریف بننے کی کوشش کرتا ہے۔ نئے سال کی مبارک باد تو دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ نئے ارادے اور نئے فیصلے بھی کرتا ہے۔ ہم نے بھی کئی بار فیصلہ کیا ہے کہ نئے سال میں سگریٹ چھوڑ دیں گے، نئے سال میں آوارہ گردی نہیں کریں گے۔ جھوٹ نہیں بولیں گے، صحت کا خیال رکھیں گے، بیوی سے اپنی آمدنی پوشیدہ نہیں رکھیں گے وغیرہ وغیرہ۔ جنوری کے مہینہ کی ابتدائی تاریخوں میں ہم ان نئے فیصلوں اور نئے ارادوں پر عمل کرنے کی پوری کوشش کرتے ہیں۔ لیکن جیسے جیسے وقت گذرتا ہے ہم اپنی اصلی حالت پر واپس آجاتے ہیں۔ اور سال کے بقیہ مہینوں میں ہم جنوری کے مہینے کے خلاف تردیدی بیان جاری کرتے رہتے ہیں۔ یہی وہ مہینہ ہے جس میں آدمی بلاوجہ اپنے دل کو ٹٹولتا ہے اور دماغ کو جھنجھوڑتا ہے۔ جنوری کا تو کچھ بھی نہیں بگڑتا، البتہ آدمی ہی بعد میں بگڑ جاتا ہے۔ اس لئے تو ہم جنوری کے مہینے کو اپنی عمر کے کھاتے میں شمار نہیں کرتے۔

(آخر کار۔ ۱۹۹۷)

اِس دَور میں ہوتے حَاتِم طائی

اگر ہوتے حَاتم طائی اس دَور میں تو کیا ہوتا؟۔ یہ سوال ایسا ہی ہے جیسے کسی اُستاد نے اپنے شاگرد سے پوچھا کہ اگر آج شیکسپیر زندہ ہوتا تو کیا ہوتا؟۔ اس پر شاگرد نے جواب دیا ''ہوتا کیا۔ شیکسپیر کی عمر چار سو برس کی ہوجاتی اور وہ اتنا ضعیف ہوچکا ہوتا کہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہ سکتا۔'' ہم نہیں جانتے کہ حَاتم طائی آج زندہ ہوتے تو اُن کی عمر کتنے ہزار برس ہوتی لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ سینکڑوں برس تک سخاوت کا مظاہرہ کرنے کے بعد آج اُن کے پاس پُھوٹی کوڑی بھی نہ ہوتی بلکہ کیا عجب کہ وہ ہمیں کسی فٹ پاتھ پر کشکول تھامے کھڑے نظر آتے اور ہر راستہ چلنے والے کو اپنا وزیٹنگ کارڈ بتا کر اس کی رگِ سخاوت کو پھڑکانے کی کوشش کرتے۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ حَاتم طائی مر گئے۔ اگر وہ نہ مرتے تو آج تاریخ میں زندہ نہ رہتے۔ ذاتی طور پر ہمارا خیال یہ ہے کہ پیدا ہونا تو سب کو آتا ہے لیکن مناسب وقت پر مرنا ایک فن ہے اور اس فن میں کمال حاصل کرنے کے لئے آدمی کو برسوں زندہ رہنا نہیں پڑتا۔ تاریخ عالم ایسی شخصیتوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے جنہوں نے مر کر اپنی جان بچائی۔ سکندر اعظم اگر مناسب وقت پر نہ مرتا تو شاید ''اعظم'' نہ کہلاتا۔ اس کی زندگی کا راز یہی تھا کہ وہ مناسب وقت پر مر گیا۔ بلکہ بعض تاریخی شخصیتیں تو ایسی بھی گزری ہیں جو صرف مرنے کے لئے پیدا ہوئی تھیں۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ حَاتم طائی مناسب وقت پر مر گئے۔ اگر وہ

خدانخواستہ آج کے دَور میں زندہ ہوتے تو اُنہیں اپنی سخاوت کو جاری رکھنے کے لئے نہ جانے کتنی دھاندلیاں کرنی پڑتیں۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ ایسے دور میں سخی کہلائے گئے جب دولت مندوں کا طبقہ اکثریت میں اور غریبوں کا طبقہ اقلیت میں تھا بلکہ خدا کے صرف چند ہی معزز بندوں کو غریب ہونے کا شرف عطا کیا جاتا تھا۔ اُس دَور میں فقیری ایک پیشہ نہیں بلکہ منصب جلیلہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ فقر و فاقہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو آج کے دَور میں عیش و عشرت کو حاصل ہے۔ لوگ غربت کے لئے ترستے تھے۔ بڑے بڑے حاکموں کا یہ حال تھا کہ فقیروں کے آگے پیچھے جھولیاں لٹکائے پھرتے تھے، کہ "سائیں! ہا تھوڑی سی غربت ہماری جھولی میں ڈال دو۔" خیرات دینے کے لئے فقیروں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر پکڑنا پڑتا تھا۔ فقیروں کے غریب خانوں پر مالدار افراد جا کر صدائیں دیا کرتے تھے کہ "مائی باپ! اللہ کے نام پر ہم سے خیرات لیجئے۔ پانچ دس پیسے جو کچھ بھی ہو ہم سے لیجئے۔ اللہ آپ کو اور بھی غربت عطا کرے گا۔ چار دنوں سے کسی کو بھی خیرات نہیں دی ہے۔ ہمارے حال پر رحم فرمایئے۔" اور فقیر حضرات اپنے گھروں کے اندر بیٹھے بیٹھے کہتے "میاں معاف کرو، ایک مہینہ پہلے ہی ہم نے کھانا کھایا تھا۔ اب کھانے کی ایسی تمنا بھی نہیں۔ کسی دوسرے فقیر کا گھر تلاش کرو۔" ظاہر ہے کہ جب ایسا دَور ہو تو ایسے میں حاتم طائی بننا کون سا مشکل کام تھا۔ اگر حاتم طائی آج کے دور میں بھی حاتم طائی برقرار رہ کر بتلاتے تو تب ہم اُن کی سخاوت کے قائل ہو جاتے۔ اس دور میں تو لوگوں کی سخاوت کا یہ حال ہے کہ کسی کو پانچ پیسے بھی دیتے ہیں تو یوں سمجھتے ہیں کہ جیسے انہوں نے حاتم طائی کی قبر پر لات ماری ہے۔ اگر حاتم طائی آج زندہ ہوتے تو ایسے سخی حضرات کو لات مارنے کے لئے اُن کی قبر کا سہارا نہ لینا پڑتا بلکہ جیتے جاگتے حاتم طائی کو اس مقصد کے لئے استعمال کرتے۔ اسے آپ خودستائی نہ سمجھیں تو عرض کریں کہ ہم بھی جذبۂ سخاوت میں حاتم طائی سے کچھ کم نہیں۔ مگر مشکل یہ ہے کہ خیرات دینے کے لئے بھی ہمیں کسی سے قرض مانگنا پڑتا ہے۔

بارہا ایسا ہوا کہ سڑک پر چلتے چلتے کسی بدحال فقیر پر ترس آ گیا لیکن خیرات دینے کے لئے جیب میں ہاتھ ڈالا تو اچانک اپنے آپ پر ترس آنے لگا۔ فقیر کی طرف حسرت بھری نظر ڈالی تو یوں محسوس ہوا کہ ہم فقیر کو نہیں دیکھ رہے ہیں بلکہ آئینہ میں اپنی شبیہ دیکھ رہے ہیں۔

اگر فقیر پر بہت زیادہ رحم آ گیا تو ہم نے فوراً اپنے کسی دوست سے ایک پیسہ مانگا اور اسے جوں کا توں فقیر کی جھولی میں ڈال دیا۔ حالانکہ اصولاً اس پیسہ کو خود ہمیں اپنے پاس رکھنا چاہئے تھا۔ سخاوت کا ایسا اچھوتا جذبہ بھلا حاتم طائی کہاں سے لاتے۔ یہ تو ہمارا ہی دل گردہ ہے کہ ہم خیرات دینے کے لئے دوسروں سے خود خیرات مانگتے ہیں۔ حاتم طائی تو اس دور میں خیرات دیا کرتے تھے جب فقیروں کو ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ اب وہ دور آ گیا ہے جب اچھے خاصے حاتم طائی پر بھی فقیر ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ اگر آپ خیرات دینے کے لئے اپنی جیب سے ایک پیسہ نکالتے ہیں تو فقیروں کا ایک جم غفیر آپ کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ آپ یقین کریں کہ ایک بار ہم نے ایک بوڑھے فقیر پر رحم کھا کر ایک پیسہ دینے کی کوشش کی تو اچانک کئی فقیر ہم پر ٹوٹ پڑے۔ ہم اُن سے بچنے کے لئے آگے بڑھے تو سارے فقیر ہمارے پیچھے ہو لئے۔ ہم ایک میل تک اسی طرح آگے آگے چلتے رہے۔ فقیر نہ صرف ہمارے پیچھے چلتے رہے بلکہ اس غول میں نئے فقیر بھی شامل ہوتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ تھوڑی ہی دیر بعد سارے شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ ہم فقیروں کے ایک جلوس کی قیادت کر رہے تھے۔ کئی دوستوں نے پوچھا کہ یہ تمہیں فقیروں کے جلوس کی قیادت کرنے کی کیا سوجھی؟۔ اور ہم نے یہ پوچھ کر اُنہیں چپ کرایا کہ ''کیا آپ بھی جلوس میں شریک تھے؟''

آپ ہی سوچئے کیا حاتم طائی ہماری طرح فقیروں کے جلوس کی قیادت کر سکتے تھے۔ خیرات دینا ایک الگ بات ہے۔ فقیروں کے جلوس کی قیادت کرنا بالکل ہی ایک الگ بات ہے۔ اس کے لئے آدمی میں صرف جذبۂ سخاوت کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ آدمی کو تھوڑا سا بے شرم بھی ہونا پڑتا ہے۔ حاتم طائی جب سخاوت کے خزانے لٹایا کرتے تھے تو اُن دنوں فقیروں کی اتنی قسمیں نہیں تھیں جتنی کہ آج ہیں۔ بلکہ آج کا ہر فقیر بذاتِ خود ایک نئی قسم کا درجہ رکھتا ہے۔ پھر بھی ہم نے سہولت کی خاطر فقیروں کی چند قسمیں مقرر کی ہیں: جیسے جلالی فقیر، کمالی فقیر، جمالی فقیر، خالی فقیر اور گالی فقیر۔ ان فقیروں کو اُن کی صفات بابرکات کے ذریعہ پہچانا جا سکتا ہے۔

جلالی فقیر آپ کے گھر خیرات مانگنے یوں آتا ہے جیسے وہ خیرات نہ مانگ رہا ہو بلکہ قرض وصول کر رہا ہو۔ کمالی فقیر کمالات کے ذریعہ بھیک مانگتا ہے۔ کمالات سے ہماری مراد

یہ ہے کہ وہ سڑک کے ایک فٹ پاتھ پر تو اندھے ہونے کا کمال دکھاتا ہے لیکن دوسرے فٹ پاتھ پر پہنچتے ہی اس کی بینائی واپس آجاتی ہے اور وہ لنگڑا بن کر کمال دکھانے لگ جاتا ہے۔ اس طرح وہ لوگوں سے دو دو مرتبہ خیرات وصول کرتا ہے۔ ایک مرتبہ اندھے کی حیثیت سے اور دوسری مرتبہ لنگڑے کی حیثیت سے۔ جمالی فقیر وہ ہوتا ہے جو ہٹا کٹا ہوتا ہے اور صرف جلوۂ حسن کی بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ ایسے ہی ایک فقیر سے کسی خاتون نے پوچھا تھا کہ ''تم کافی بھلے چنگے ہو، پھر بھیک کیوں مانگتے ہو۔'' اس پر جمالی فقیر نے کہا ''محترمہ فقیری ہی دُنیا کا وہ واحد پیشہ ہے جس میں کسی تعارف کے بغیر کسی بھی خاتون سے بات چیت کی جاسکتی ہے۔'' گویا ایسے فقیروں کا مسلک غالبؔ کی زبان میں کچھ اس طرح ہوتا ہے ع

سیکھے ہیں مہ رُخوں کے لئے ہم مصوّری

خالی فقیر وہ ہوتا ہے جو صرف فقیر ہوتا ہے اور فقیر کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا اور گالی فقیر اس فقیر کو کہتے ہیں جسے خیرات نہ دی جائے تو اچانک دعاؤں کا بینڈ تبدیل کردیتا ہے اور آپ کو بے نقط گالیاں سنانے لگتا ہے۔ ظاہر ہے حاتم طائی اگر آج زندہ ہوتے تو فقیروں کی اتنی ساری قسموں کا حال جان کر حیران ہوجاتے۔ اور انہیں خیرات کا باضابطہ سالانہ بجٹ بنانا پڑتا۔ اور ہر قسم کے فقیروں کے لئے علیحدہ مالی گنجائش نکالنی پڑتی کہ کسی کو اعتراض کا موقع نہ ملے اور آپ تو جانتے ہیں کہ موجودہ دَور میں بجٹ صرف ایک ہی قسم کا ہوتا ہے اور وہ ہے خسارہ کا بجٹ۔

بے چارے حاتم طائی تو سیدھے سادے معصوم سے آدمی تھے۔ اُنہیں کیسے معلوم ہوتا کہ آج کے دور میں خیرات دینے کے لئے آدمی کو ہوشیار ہونا پڑتا ہے بلکہ اس کی تو باضابطہ ٹریننگ دی جانی چاہئے۔ اگر آدمی ہوشیار نہ ہو تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ایسے فقیروں کو خیرات دے دیتا ہے جن کی مالی حیثیت خود اس سے بہتر ہوتی ہے۔ خود ہماری مثال لیجئے کہ ایک بار ہم نے ایک فقیر کو ٹالنے کے لئے یہ عذر پیش کیا کہ ہمارے پاس سو روپے کا کرنسی نوٹ ہے لہٰذا مجبوری ہے۔ یہ سنتے ہی فقیر نے اپنی جھولی سے ننادے روپے ننانوے پیسے نکال کر ہمارے ہاتھ میں تھما دیئے اور کہا لائیے سو روپے کا کرنسی نوٹ میرے حوالے کردیجئے۔ اس وقت ہمیں جو شرمندگی ہوئی اس کا اندازہ آپ خود لگا سکتے ہیں کیوں کہ ہماری جیب میں اس

وقت صرف دو پیسے رکھے ہوئے تھے۔ اور وہ بھی ہم نے محض اس لئے رکھ چھوڑے تھے کہ سائیکل ٹیوب میں ہوا بھروائی جائے۔ چاروناچار ہمیں اداکاری کے جوہر دکھاتے ہوئے یہ کہنا پڑا کہ ہماری جیب میں سو روپے کے کرنسی کے علاوہ اتفاق سے دو پیسے بھی موجود ہیں۔ یہ کہہ کر ہم نے دو پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے اور خود سائیکل کو ہاتھ میں پکڑ کر گھر واپس پہنچے۔

ہمیں فقیروں کا بڑا تلخ تجربہ ہے۔ سنیما گھر کے سامنے اگر ہم کسی فقیر کو ایک پیسہ دیتے ہیں تو وہ انٹرول میں ہمیں سنیما گھر کے ایسے درجہ میں بیٹھا ہوا نظر آتا ہے جو اس درجہ سے بلند ہوتا ہے جس میں ہم بیٹھے ہیں۔ اگر کسی ہوٹل کے باہر ہم کسی فقیر کو خیرات دیتے ہیں تو وہ تھوڑی دیر بعد ہمیں اسی ہوٹل میں ہم سے اچھی غذائیں کھاتا ہوا ملتا ہے۔

حاتم طائی کے ساتھ اگر ایسی صورتیں پیش آتیں تو ہمیں یقین ہے کہ وہ اپنی سخاوت سے فوراً دست بردار ہوجاتے۔ یہ تو ہمارا دل گردہ ہے کہ فقیروں کی اتنی ساری دھاندلیوں کے باوجود ہم کسی نہ کسی طرح اپنی قلیل سی آمدنی میں سے خیرات کے لئے گنجائش نکال لیتے ہیں۔ لیکن یہ ضرور یاد رکھتے ہیں کہ ہم نے کس فقیر کو کتنی خیرات دی ہے، بلکہ یوں کہئے کہ ہم خیرات کچھ اس انداز سے دیتے ہیں جیسے فقیروں کو قرض دے رہے ہوں اور یہ کہ ہمیں وقت ضرورت ان فقیروں سے اپنی دی ہوئی رقم واپس لینی ہے۔ حاتم طائی کے بارے میں سن رکھا ہے کہ وہ جب ایک ہاتھ سے خیرات دیتے تھے تو دوسرے ہاتھ کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی۔ ہمارا یہ حال ہے کہ ایک ہاتھ سے خیرات دیتے ہیں تو دوسرا ہاتھ فوراً اس خیرات کو واپس لینے کے لئے تیار ہوجاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر ہمیں وہ لطیفہ یاد آتا ہے کہ ایک کنجوس مرنے کے بعد جنت کے دروازے پر پہنچ گیا اور جنت کے چوکیدار سے کہنے لگا کہ اسے جنت میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ جنت کے چوکیداروں نے اسے روکتے ہوئے پوچھا کہ کیا اس نے زمین پر کوئی نیکی بھی کی ہے؟ اس شخص نے اپنی زندگی میں نیکیاں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی لیکن اسے ایک بھی کام کی نیکی نہ مل سکی۔ بعد میں اسے اچانک یاد آیا کہ اُس نے ایک بوڑھے فقیر کو ایک پیسہ بطور خیرات دیا تھا۔ اس نے چوکیداروں کو مطلع کیا کہ وہ ایک بار ایک فقیر کو ایک پیسہ خیرات میں دے چکا ہے۔ لہٰذا اسے جنت میں جانے دیا جائے۔ چوکیدار نے اس سے کہا کہ وہ تھوڑی دیر ان کا انتظار کرے تاکہ وہ اس نیکی کی بناء پر اس کے جنت میں

داخلہ کی بابت جنّت کے داروغہ سے مشورہ کر سکے۔ چوکیدار جنت کے داروغہ کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا کہہ سُنایا اور یہ بھی کہا کہ اس شخص کی زندگی میں کوئی نیکی نہیں ہے، صرف ایک بار اُس نے ایک پیسہ ایک فقیر کو دیا تھا۔ اس پر جنّت کے داروغہ نے فیصلہ صادر کرتے ہوئے کہا کہ ''اس شخص کو اس کا ایک پیسہ واپس کیا جائے اور اسے دوزخ کا راستہ بتلایا جائے۔'' ہم دوزخ میں جانے کے متمنی نہیں ہیں لیکن اگر جنت کے دروازے پر اس دنیا میں دی ہوئی خیرات کی واپسی کا کوئی اصول ہے تو ہم یہ عرض کریں گے کہ جنت کے داروغہ سے ہمیں جملہ نو روپے پندرہ پیسے وصول طلب ہیں۔ کیا کریں گرانی ہی ایسی جان لیوا ہے کہ آدمی خیرات دینے کے بعد اسے بھولتا نہیں بلکہ ہمیشہ یاد رکھتا ہے۔

اگر حاتم طائی سچ مچ اس دَور میں زندہ ہوتے تو اُن کے گھر سے کوئی فقیر اپنی جھولی خالی نہ لے جانے کی بجائے اپنی بھری ہوئی جھولی بھی اُن کے گھر خالی کر کے چلا جاتا۔ بالکل اسی طرح جیسے ایک صبح ہمارے گھر میں چولہا بھی نہیں جلا تھا کہ ایک فقیر ہمارے گھر پر آ گیا، ہم نے فقیر کو اپنا سارا ماجرا کہہ سُنایا اور جب وہ واپس جانے لگا تو ہم نے چولہا جلانے کے لئے اس سے دیا سلائی کی ڈبیہ بھی مانگ لی۔ اور اسے اتنی ساری دعائیں دیں کہ وہ آبدیدہ ہو گیا۔ اس دن کے بعد سے وہ ہمیشہ ہمارے گھر کو اوور ٹیک کر کے نکل جاتا ہے جیسے ہمارا گھر، گھر نہ ہو، یتیم خانہ ہو۔ اگر حاتم طائی کو خدانخواستہ ایسی رُسوائی کا سامنا کرنا پڑتا تو کیا عجب کہ وہ خود بھی ہاتھ میں جھولی تھام کر سڑک پر نکل پڑتے۔ یہ تو ہماری ہی ہمت ہے کہ ہم نے آج تک اپنی جھولی کسی کے سامنے نہیں پھیلائی حالانکہ ہمیں اصولاً بہت پہلے یہ انداز اختیار کر لینا چاہئے تھا۔

(قصہ مختصر۔ ۱۹۷۲)

مرزا دعوت علی بیگ

اُن کا اصلی نام کیا تھا یہ تو مجھے کبھی معلوم نہ ہو سکا البتہ دوست احباب انہیں مرزا دعوت علی بیگ کے نام سے پکارتے تھے، اور یہ ایک اتفاق ہے کہ اُن سے میری ملاقات ایک دعوت ہی میں ہوئی تھی جس میں وہ دو سالم مرغوں اور بکروں کی ایک عدد ٹانگ کو ہڑپ کر جانے کے بعد دستر خوان کے کنارے اپنی نیم باز آنکھوں کے ساتھ پسینہ میں شرابور یوں بیٹھے تھے جیسے کسی رہ گذر پہ بیٹھے ہوں اور اُٹھنے کا ارادہ نہ رکھتے ہوں۔ مجھ سے تعارف ہوا تو بادل ناخواستہ اپنی باچھیں کھولیں اور مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ میری طرف بڑھایا۔ میں نے اُن سے ہاتھ ملایا تو بولے ___ ''بھائی صاحب! جب آپ نے میرا ہاتھ تھام ہی لیا ہے تو براہِ کرم مجھے اُٹھا کر کھڑا بھی کر دیجئے۔'' پھر جس باورچی نے اُس دعوت کے لیے کھانا بنایا تھا اُسے ایک موٹی سی گالی دیتے ہوئے بولے ''ایسا لذیذ اور ذائقہ دار کھانا بنایا ہے کہ کھانے کی نیت نہ رکھتے ہوئے بھی مجھے تھوڑا بہت کھانا پڑ گیا۔'' میں نے اُنہیں بائیں ہاتھ کی مدد سے اُٹھانے کی کوشش کا آغاز کیا تو انہوں نے دستر خوان کو الوداع کہنے کی غرض سے اپنا دایاں ہاتھ مرغ کی پلیٹ میں ڈالا اور مرغ کی ایک ٹانگ اُٹھالی اور اسے منہ میں ڈالتے ہوئے کہا'' آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ سے تعارف نہ ہوتا تو مجھے دستر خوان سے کون اُٹھاتا۔''

مرزا دعوت علی بیگ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد وہ جب بھی ملے کسی دعوت ہی میں ملے۔ اُن کے مخصوص آدابِ محفل کے تحت ملتے ہی مصافحہ نہیں کرتے تھے

بلکہ مصافحہ کو کھانے کے بعد کے لئے اُٹھا رکھتے تھے تاکہ یہ مصافحہ اُن کے اُٹھنے میں مددگار ثابت ہو۔

مرزا صاحب کھانے کے شوقین ہی نہیں تھے بلکہ کھانا ہی اُنکا اصل مقصدِ حیات، فلسفۂ زندگی اور زاویۂ نگاہ وغیرہ سب کچھ تھا۔ کچھ لوگ زندہ رہنے کے لئے کھاتے ہیں۔ یہ کھانے کے لئے زندہ رہتے تھے۔ پچیس برس سے اُن سے شناسائی تھی۔ جب بھی ملے دعوت ہی میں ملے۔ میں نے کھانے کے بہت شوقین حضرات دیکھے ہیں جو صرف ہاتھ اور منہ کی مدد سے کھانا کھاتے ہیں۔ مرزا صاحب کھانا کھاتے تو اپنے پانچوں حواس کی مدد سے کھانا کھاتے تھے۔ حد تو یہ ہے کہ کھانا کھاتے وقت اپنی دماغی صلاحیت کا جواُن میں ذرا کم ہی تھی استعمال کرتے تھے، اُن کے حافظہ میں انواع واقسام کے کھانوں کے ذائقے محفوظ تھے۔ اُن کے ذہن میں ستر قسم کے قورموں کا ذائقہ محفوظ تھا۔ پچیس برس پہلے کھائی ہوئی بریانی کے ذائقے کو اپنی زبان پر یکایک زندہ اور تازہ کر لیتے تھے اور اس ذائقہ کو چٹخارے لے لے کر کچھ اس طرح سناتے تھے کہ اُنکے علاوہ مخاطب کے منہ میں بھی پانی بھر بھر آتا تھا اور ایک نوبت وہ آتی تھی جب وہ مخاطب کے کپڑوں کا خیال کر کے ایک لفظ بھی منہ سے ادا کرنے کے قابل نہیں رہ جاتے تھے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ وہ کھانے کے معاملہ میں اپنی چھٹی حس کا استعمال بھی کرتے تھے۔ اسے آپ چھٹی حس کا استعمال نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ مرغ کی ٹانگ کھا کر بتادیتے تھے کہ یہ مرغ کی ٹانگ ہے یا مرغی کی۔ مرغ کی ٹانگ ہوتی تو بتادیتے کہ اس مرغ نے ذبح ہونے سے پہلے کتنی بانگیں دی ہیں اور اگر مرغی کی ٹانگ ہوتی تو بتادیتے کہ مرغی نے کتنے انڈے دیئے ہیں۔ ذائقہ سے بھلے ہی انسان کی جنس بتائی جاسکتی ہو لیکن جانوروں اور پرندوں کی جنس بتادینا کوئی مذاق کی بات نہیں ہے۔ یہی نہیں بلکہ کسی جاندار کا گوشت کھا کر اس کی عمر، چال وچلن اور عادات واطوار کے بارے میں اظہارِ خیال کر دیتے تھے۔ یہ بھی بتادیتے تھے کہ مرحوم جاندار کا تعلق ملک کے کس علاقے، کس تحصیل بلکہ کس پنچایت سے رہا ہے۔

سنا ہے کہ مرزا کا تعلق کھاتے پیتے گھرانے سے تھا مگر جس کھاتے پیتے گھرانے میں مرزا دعوت علی بیگ جیسے کھانے والے موجود ہوں اُس کا تادیر کھاتے پیتے رہنا ناممکن سا

تھا۔ مرزا بہت دنوں تک اپنی خاندانی جائداد کو بیچ بیچ کر اپنا پیٹ اور نیت بھرتے رہے۔ بالآخر ایک نوبت وہ آئی کہ پیٹ تو بھر جاتا تھا لیکن نیت نہیں بھرتی تھی۔ اس کی تلافی کے لئے مرزا نے بڑے خشوع وخضوع کے ساتھ دعوتوں میں شریک ہونا شروع کردیا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ لوگ اُنہیں دعوتوں میں مدعو کرتے تھے یا یہ خود دعوتوں میں پہنچ جاتے تھے۔ یقیناً کچھ دعوتیں ایسی رہی ہوں گی جن میں یہ مدعو کیے گئے ہوں گے مگر بعد میں یہ دعوتوں کے معاملہ میں خود مکتفی ہوگئے تھے۔ کوئی مدعو کرے یا نہ کرے یہ خود سے پہنچ جاتے تھے۔ اس معاملہ میں اُن کے بچپن کے ایک دوست کا تعاون بھی قابلِ ذکر ہے جو ایک چھوٹے سے پرنٹنگ پریس کے مالک تھے۔ جب کبھی اُن کے پریس میں کسی تقریب کا دعوت نامہ کھانے کی دعوت کے ساتھ چھپتا تو وہ ایک دعوت نامہ مرزا کو ضرور دے دیتے تھے جسے لے کر وہ دھڑتے کے ساتھ دعوت میں شریک ہوجاتے تھے۔ اگرچہ بعد میں وہ دعوت نامہ کے محتاج بھی نہیں رہے۔ جہاں کہیں کھانے کی خوشبو کے اطراف پچیس آدمیوں کو اکٹھا دیکھتے تو خود کو اس ہجوم میں شامل کر لیتے تھے۔ مرزا ایسی دعوتوں کے قصے بہت دلچسپ انداز میں سناتے تھے۔ ایک بار وہ ایسی ہی ایک دعوت میں پہنچ گئے۔ مانا کہ جو آدمی دعوت کرتا ہے اُس کا ظرف اور دستر خوان دونوں بڑے ہوتے ہیں مگر بعض میزبان ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا دستر خوان بڑا لیکن ظرف چھوٹا ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک میزبان نے کھانے سے پہلے مہمانوں کی جانچ پڑتال شروع کردی۔ مرزا نے سوچا تھا کہ یہ دعوت ضرور کسی کی شادی کے سلسلہ میں ہو رہی ہے۔ جب میزبان نے مرزا سے پوچھا ''جناب آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟'' تو مرزا نے اعتماد کے ساتھ جواب دیا ''جی میں دلہن والوں کی طرف سے آیا ہوں۔'' مرزا کے جواب کو سن کر میزبان کے چہرے پر تردّد کے آثار نمودار ہوئے تو مرزا نے فوراً اپنے بیان میں ترمیم کرتے ہوئے کہا ''معاف کیجئے۔ میں نے غلط کہا میں اصل میں دولہا والوں کی طرف سے آیا ہوں۔''

یہ سنتے ہی میزبان نے مرزا کو دستر خوان سے اُٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اُٹھیے جناب آپ غلط جگہ آگئے۔ یہ میرے ابا کے چہلم کا کھانا ہے۔'' مرزا اس واقعہ کو جب بھی سناتے ہنس ہنس کے بے جان ہوجاتے تھے حالانکہ یہ مقام ہنسنے کا نہیں رونے کا ہوتا تھا وہ اس معاملے میں اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں آدمی کی انا اور اس کا ضمیر دونوں ساتھ چھوڑ دیتے ہیں۔ میں خود

ایک دعوت کا چشم دید گواہ ہوں جس میں میزبان کا دستر خوان تو بہت بڑا تھا لیکن اس کا ظرف بہت چھوٹا تھا۔ سینکڑوں آدمی اس دعوت میں مدعو تھے۔ مرزا سامنے والے ٹیبل پر بیٹھے کھانا شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ میزبان کے ایک آدمی نے مرزا کے پاس جا کر باز پرس شروع کر دی کہ آپ کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ دعوت میں آپ کو کس نے بلایا ہے؟ مرزا نے تسلی بخش جواب نہ دیا تو اس آدمی نے مرزا کو کھانے کی میز سے اُٹھا دیا۔ مجھے بڑی کوفت ہوئی۔ اگرچہ اُس دعوت میں کھانا بے حد لذیذ تھا مگر مجھ سے کھایا نہ گیا۔ رہ رہ کر مرزا کا خیال آتا تھا۔ میں کھانے سے فارغ ہو کر بڑی دیر بعد پنڈال سے باہر آیا تو دیکھا کہ مرزا پنڈال کے آگے کھڑے ہیں۔ مجھے مرزا پر ترس آیا۔ میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''مرزا! حد ہوگئی میزبانوں نے تمہاری بے عزّتی کی مگر تم یہاں کھڑے ہو۔ ایسے کھانے سے تو بھوکا رہنا ہی بہتر ہے۔ چلو میرے ساتھ۔ میں تمہیں کھانا کھلاؤں گا۔''

ہنس کر بولے ''کیسی بے عزّتی اور کس کی بے عزّتی۔ لعنت بھیجئے ایسے میزبانوں پر۔ آپ سمجھتے ہیں میں یہاں کھانا کھاؤں گا۔''

میں نے پوچھا۔ ''تو پھر یہاں کیوں کھڑے ہو؟''

آنکھیں نیچی کر کے بولے ''اصل میں میری بیگم زنانہ سیکشن میں کھانا کھا رہی ہیں۔ اُن کی واپسی کا انتظار کر رہا ہوں۔ وہ آجائیں تو کہیں اور جا کر کھانا کھاؤں گا۔ وہ رزق کہیں تو ہوگا جس پر میرا نام لکھا ہوگا۔'' یہ سنتے ہی نہ صرف مجھے ہنسی آگئی بلکہ خود مرزا بھی ہنسنے لگے۔ یہ صحیح ہے کہ مرزا کا گزارہ دعوتوں پر ہی ہوتا تھا لیکن دعوتیں روز روز تو نہیں ہوتیں۔ بعض دفعہ مرزا کو اپنے کھانے کی قیمت خود چکانی پڑتی تھی۔ میں نے مرزا کی اس مشکل کو آسان کرنے کے لئے اُنہیں ایک ایسے ہوٹل کا پتہ بتا دیا جہاں پانچ روپے کا کوپن خرید کر آدمی جتنا چاہے کھانا کھا سکتا تھا۔ مرزا ایک ہفتہ تک تو اس ہوٹل میں خوشی خوشی کھانا کھاتے رہے۔ مگر جب ہوٹل کے مالک نے اُن کے کھانے کی رفتار اور مقدار کا اندازہ لگا لیا تو تشویش میں مبتلا ہو گیا۔ آٹھویں دن جب وہ ہوٹل میں گئے تو ہوٹل کے مالک نے اُنہیں الگ لے جا کر اپنی جیب سے پانچ روپے دیئے اور کہا اگر آپ میرے ہوٹل کے بجائے برابر والے ہوٹل میں کھانا کھا لیا کریں تو میں آپ کے کھانے کا بل اپنی جیب سے دینے کو تیار ہوں۔ مرزا پہلے ہوٹل کے

مالک سے دام وصول کر کے آٹھ دنوں تک دوسرے ہوٹل میں کھانا کھاتے رہے۔ مگر دوسرے ہوٹل کا مالک جب اُن کے کھانے کی رفتار اور مقدار سے واقف ہوا تو اُس نے بھی اُنہیں الگ لے جا کر کہا ''بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ برابر والے ہوٹل میں کھانا کھایا کریں۔ آپ کے کھانے کا خرچ میں برداشت کروں گا۔''

مرزا بولے ''حضور! میں تو آپ کے برابر والے ہوٹل کے مالک کے خرچ پر آپ کے ہاں کھانا کھا رہا ہوں۔ کھانے کا بل ادا کرنا ہی ہو تو دوگنے دام دیجیے۔'' اب اُنہیں نہ صرف مفت میں کھانا مل رہا تھا بلکہ آمدنی کا ایک ذریعہ بھی پیدا ہو گیا تھا۔ مرزا کئی دنوں تک ان دونوں ہوٹلوں کے مالکوں کو بے وقوف بنا کر نہ صرف اپنی بھوک مٹاتے رہے بلکہ اپنی آمدنی میں بھی اضافہ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ دونوں ہوٹل مرزا کی بسیار خوری کی نذر ہو گئے۔ وہ دن مرزا کی خوش حالی کے دن تھے۔ ایک بار تو انہوں نے مجھے بھی اپنے خرچ سے کھانا کھلایا تھا۔

مرزا کی کس کس بات کو یاد کروں۔ اُنہیں یاد کرتا ہوں تو کئی مرغن کھانوں کی یاد آتی ہے۔ اور مرغن کھانوں کو دیکھتا ہوں تو مرزا یاد آتے ہیں۔ مرزا نے کبھی ڈائٹنگ نہیں کی۔ وہ ڈائٹنگ کو خلاف ایمان عمل سمجھتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ جو آدمی، ڈائٹنگ کرتا ہے وہ خدا کی نعمتوں کو ٹھکراتا ہے۔ ایسے ناشکرے بندے کا خُدا سے کیا رشتہ۔ میں اُنہیں لاکھ سمجھاتا کہ مرزا تمہاری توند اب نہ صرف تمہارے لیے بلکہ تمہارے دوستوں کے لیے بھی ناقابلِ برداشت بنتی جا رہی ہے۔ دال روٹی پر گذارہ کرو۔ نفس کو مارنے کا یہی طریقہ ہے۔

فرماتے ''نفس کو مارنے کی کوشش میں، مَیں اپنے آپ کو نہیں مار سکتا۔''

مرزا کے آداب خورد ونوش بھی عجیب تھے۔ کھانے کے بعد میزبان اُن کی خدمت میں پان پیش کرتا تو فرماتے۔ ''میاں! پان کھانے کی گنجائش ہوتی تو تھوڑی سی بریانی نہ کھا لیتا'' انہوں نے نہ جانے کیسا ہاضمہ پایا تھا کہ کھانا کھانے کے بعد ڈکار لینے تک کے روادار نہیں تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ کم ظرف آدمی ہی ڈکار لے سکتا ہے۔ بعض اوقات تو وہ ایک دعوت سے کھچا کھچ بھرے ہوئے نکل کر دوسری دعوت میں چلے جاتے تھے کہ شاید وہاں کوئی نئی چیز کھانے کو مل جائے۔

مرزا ان لوگوں میں سے تھے جنہوں نے خود اپنے دانتوں سے اپنی قبر کھودی۔ گورکنوں تک کو زحمت نہ دی۔ جب اُن کا آخری وقت آیا تو مجھے بلوا بھیجا۔ ڈاکٹروں نے مرغن کھانوں سے پرہیز بتایا تھا مگر مرزا کی روح تو نہاری میں اٹکی ہوئی تھی۔ مجھ سے رازدارانہ انداز میں بولے "بھیا! یہ ڈاکٹر لوگ تو اپنے پیٹ کے لئے دوسروں کا پیٹ کاٹتے ہیں۔ میں پرہیز کے ساتھ مرنے کو گناہ عظیم سمجھتا ہوں۔ میری یہ خواہش ہے کہ آپ کل صبح مجھے نہاری کھلائیں۔ میں چپ چاپ آپ کو دُعا دیتا ہوا اس دُنیا سے نکل جاؤں گا۔" اس وقت مجھے مرزا کی آنکھوں میں نہاری کے ذائقہ کی جھلک صاف دکھائی دے گئی۔

دوسرے دن میں اُن کی خواہش کے احترام میں نہاری لے گیا تو زبان سے کچھ نہ کہا چپ چاپ نہاری کھائی اور آنکھیں بند کر کے جو لیٹے تو پھر آنکھیں نہیں کھولیں۔ یہ اُن کی آخری دعوت تھی۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(الغرض۔ ۱۹۸۷)

یہ رکشا والے

میں رکشا والوں سے بہت گھبراتا ہوں۔ اس لئے کہ جو شخص رکشا چلا سکتا ہے وہ کچھ بھی کر سکتا ہے۔ ویسے رکشا چلانے کے بعد آدمی کے پاس کرنے کے لئے کچھ رہ ہی کیا جاتا ہے۔ وہ مجبوری کی اس انتہا کو پہنچ چکا ہوتا ہے جہاں وہ مزید مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا ایسے آدمی کا کوئی بھروسہ نہیں ہوتا کہ وہ کون سے لمحے میں کیا کر گزرے گا۔ مجھے تو اکثر اوقات رکشا میں بیٹھنے کے بعد یہ خدشہ بھی لگا رہتا ہے کہ کہیں رکشا والا مجھے بیچ راستے میں اُتار نہ دے اور میں صرف اس کا منہ دیکھتا رہ جاؤں۔ آپ ہی بتایئے ایسی صورت میں آپ اس کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔ بہت بگاڑنا چاہا تو کرایہ کے چار آنے روک لئے ___ مگر خیال رہے کہ چار آنے آپ روک لیں گے تو رکشا والا آپ کو کم از کم آٹھ آنے کی گالیاں تو ضرور دے ڈالے گا اور نقصان آپ ہی کا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ میں اُنہیں اُن کے حال پر چھوڑ دیتا ہوں اور اتنا چھوڑ دیتا ہوں کہ اگر مجھے شمال کی جانب جانا ہے اور رکشا والا جنوب کی طرف چل نکلے تب بھی اُسے نہیں ٹوکتا کہ مبادا میں کچھ کہوں اور وہ رکشا کو بریک لگا دے۔

مجھے شکایت یہ ہے کہ میں تو رکشا والوں سے بڑے احترام و ادب کے ساتھ پیش آتا ہوں۔ لیکن رکشا والے کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے۔ وہ کچھ ایسی قلندرانہ بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہیں کہ اُن سے کرایہ کی بات تک کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ ایک دن ایک رکشا والے کو عابد روڈ پر دیکھا۔ رکشا کو فٹ پاتھ سے لگائے ہوئے وہ اپنے رکشا کی کشتی

میں اس انداز سے بیٹھا تھا جیسے شاہ جہاں تختِ طاؤس پر جلوہ افروز ہو۔ چہرے پر بے نیازی اور بے غرضی کے آثار کچھ اس طرح نمایاں تھے کہ اس سے کرایہ کی بات کرتے ہوئے بھی خوف محسوس ہوتا تھا۔ مگر جب اچانک اس نے ایک عدد جماہی (خورد) اور ایک عدد انگڑائی (کلاں) لی تو میں نے موقع کو غنیمت جانا اور دست بستہ عرض کی:

''حضور والا: چار مینار چلیں گے؟''

اس نے گھور کر مجھے دیکھا اور اپنے کھلے ہوئے منہ کے سامنے ایک عدد چٹکی بجا کر کہا ''کیا کہا چار مینار؟۔ اجی صاحب وہ تو میں بہت پہلے ہی دیکھ چکا ہوں۔ کیا آپ نے اب تک نہیں دیکھا؟''

اس جواب کو سُن کر میں بھونچکا سا رہ گیا، آگے بات کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چپ چاپ چار مینار کی طرف نکل گیا۔

ان رکشا والوں میں نہ جانے کہاں سے اتنی دیدہ دلیری آجاتی ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ایک دن ایک صاحب بس اسٹاپ پر کھڑے بس کا انتظار کر رہے تھے۔ جب بہت دیر تک بس نہ آئی تو اُنہوں نے ایک رکشا والے کو بلایا:

پوچھا ''کرایہ کرو گے؟''

رکشا والے نے ترکی بہ ترکی جواب دیتے ہوئے کہا:

''تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہم یوں ہی تفریحاً گھوم رہے ہیں؟''

وہ صاحب بولے ''نہیں بھئی! میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کہیں تم کسی اور جگہ تو نہیں جا.........

رکشہ والے نے ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا: ''اجی قبلہ! اس دنیا کو چھوڑ کر جا بھی کہاں سکتے ہیں۔ فرمائیے، آپ کو کہاں جانا ہے؟''

وہ بولے ''مجھے سلطان بازار چھوڑ دو۔''

''ضرور چھوڑ دوں گا، آٹھ آنے ہوں گے۔''

وہ صاحب حیرت سے بولے: ''آٹھ آنے! ___ بس کا کرایہ تو صرف دس پیسے ہوتا ہے۔''

اس پر رکشا والے نے کہا ’’جی! دس پیسے ہوتا ہے، مگر آپ نے یہ غور نہیں فرمایا کہ بس پٹرول سے چلتی ہے اور رکشا خون سے چلتا ہے، خون سے ___ ‘‘ یہ جملہ کہتے ہوئے رکشا والے کی آنکھوں میں سرخی دوڑ گئی۔ چنانچہ وہ صاحب بلا چوں وچرا رکشا میں بیٹھ گئے۔

اتنے برسوں تک بھانت بھانت کے رکشاؤں میں بیٹھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ جب گھوڑے کی قسمت پھوٹ جاتی ہے تو وہ تانگے میں جوت دیا جاتا ہے اور جب انسان کی قسمت پھوٹتی ہے تو وہ رکشا چلاتا ہے اور جس شخص کی قسمت کسی وجہ سے پھوٹنے نہیں پاتی بلکہ پھوٹنے کی منتظر رہتی ہے تو وہ رکشا میں بیٹھ جاتا ہے۔ کئی بار تو ایسا بھی ہوا کہ قسمت کے ساتھ ساتھ ہم بھی پُھوٹتے پُھوٹتے رہ گئے۔ ہزار بار رکشا والوں کو سمجھاتا ہوں کہ میاں سلامتی کی چال چلو کہ زندگی میں یہی کلیدِ کامیابی ہے تو وہ مجھ سے کہتے ہیں: ’’حضور سلامتی کی چال چل چل کر تو اس نوبت کو پہنچے ہیں اور اب مزید سلامتی کی چال چلیں تو زمانہ قیامت کی چال چل جائے گا۔ اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔‘‘

تلوار کی کاٹ تو زندگی میں کبھی نہیں دیکھی مگر رکشا کی کاٹ ہر روز ہی دیکھتا ہوں۔ جب رکشا والا اپنے رکشے کو کاٹنے پر اُتر آتا ہے تو یوں لگتا ہے جیسے سڑک پر کشتوں کے پشتے لگا دے گا۔ جب وہ گھنٹی کو لگاتار بجاتا ہُوا نشیب پر اُترنے لگتا ہے تو یہ گمان ہوتا ہے جیسے رکشا کچھ ہی دم میں ’’ٹیک آف‘‘ کرے گا اور آسمانوں کی خبر لے آئے گا۔ ایک دن ایک برق رفتار رکشا والے کو سمجھایا کہ ’’بھائی سڑک پر اور لوگ بھی چلتے ہیں اُن کا کچھ تو خیال کرو، یوں رکشے کو پر لگا دینے سے کیا حاصل؟‘‘ اس پر وہ بولا ’’حضور! یہ لوگ مروت سے کبھی راہِ راست پر نہیں آتے، گھی تو ہمیشہ ٹیڑھی اُنگلی ہی سے نکلتا ہے۔ اگر میں اس سڑک پر دو گھنٹوں تک بھی گھنٹی بجاتا رہوں تو کوئی میری آواز پر کان نہیں دھرے گا۔ زندگی تو ہر دم آگے بڑھنے کا نام ہے، یہاں انتظار کیسا؟‘‘ یہ کہہ کر اس نے اچانک ہینڈل کو گھمایا اور رکشا کو کچھ اس طرح پھرتی سے موڑ دیا کہ جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو فٹ پاتھ پر پایا۔ دیکھا تو رکشا انسانوں کو کاٹتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میں نے پکارا ’’میاں رکشا والے ذرا رکنا اپنا کرایہ تو لیتے جانا۔‘‘ اس پر انسانوں کے سیلاب میں سے رکشا والے کی آواز آئی ’’قبلہ! کرایہ کے چار آنے اپنے پاس ہی رکھیے، زندگی باقی رہے گی تو کبھی لے لوں گا۔ اب تو گاڑی کو اڈے پر واپس کرنے کا وقت آ گیا

ہے۔ اب میں رُک نہیں سکتا۔"

اب آپ ہی بتایئے رکشا میں بیٹھنا کہاں کی عقلمندی ہے؟۔ مگر اس کے باوجود آپ رکشا میں بیٹھنے پر مجبور ہیں کیوں کہ آپ کی مالی حالت رکشا والے کی مالی حالت سے کچھ ہی بہتر ہوتی ہے۔

یہ تو ایسے رکشا والوں کی بات ہوئی جو زندگی کے سفر میں ایک پل کو بھی رُکنے کے قائل نہیں ہوتے۔ مگر بعض ایسے جہاں دیدہ و برگزیدہ رکشا والے بھی ہوتے ہیں۔ جنہیں رکشا چلاتے ہوئے دیکھ کر آپ یہ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ وہ رکشا کو چلا رہے ہیں یا رکشا اُنہیں چلا رہا ہے۔ ایک دن ایسے ہی ایک بزرگ رکشا والے سے میں نے پوچھا۔

"بڑے میاں کرایہ کرو گے؟"

وہ بولے "اگر شمال کی جانب چلنا ہو تو ضرور کروں گا کرایہ"

میں نے کہا "جنوب کی سمت کا کرایہ کیوں نہ کرو گے؟"

اس پر وہ بولے: "میاں آج ہوا کا رُخ شمال کی طرف ہے، آج تو میں صرف شمال کا کرایہ ہی کروں گا۔ جنوب کی طرف جانا ہو تو کسی جوان پٹھے کو پکڑ لیجیے۔"

گویا ایسے رکشا والے، رکشا رانی کرتے وقت اس مصرع کو ملحوظ رکھتے ہیں ع

چلو تم اُدھر کو ہوا ہو جدھر کی

ایک دن مجھے ایسے ہی ایک رکشا والے کے رکشا میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ مجھے جلد از جلد منزلِ مقصود پر پہنچنا تھا۔ مگر رکشا کی یہ حالت تھی کہ وہ ہوا کے دوش پر ڈول رہا تھا۔ میں نے بہتیرا منت سماجت کی کہ "بڑے میاں رکشا ذرا تیز چلایئے۔" اور وہ ہر بار پیڈل پر صرف اُچک اُچک کر رہ گئے اور وقت تھا کہ گزرا جا رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ غرض میری تھی اور مجھے ہی وقت پر پہنچنا تھا۔ منزلِ مقصود تو نہ آئی مگر اس سفر میں وہ منزل ضرور آ گئی جب مجھے بڑے میاں کی حالت پر ترس کھا کر یہ کہنا پڑا بڑے میاں! اب آپ کشتی میں اطمینان سے بیٹھ کر ستا لیجیے۔ رکشا میں چلاتا ہوں، چار و ناچار زندگی میں پہلی مرتبہ رکشا رانی کی اور جب رکشا منزلِ مقصود پر پہنچا تو لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ رکشا چلانے والا اپنی سواری کو کرایہ ادا کر رہا ہے۔ ایسے اتفاقات بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود میں ہمیشہ بوڑھے

رکشا والوں کے رکشا میں بیٹھنے کو ترجیح دیتا ہوں، اس لئے کہ رکشا والا نوجوان ہو تو آپ کی جان رکشا والے کی ہتھیلی میں اور رکشا والے کا کرایہ آپ کی ہتھیلی میں ہوتا ہے مگر بوڑھے رکشا والے کی جان اور اس کا کرایہ دونوں ہی آپ کی ہتھیلی میں ہوتے ہیں۔ لہٰذا آپ نقصان میں نہیں رہتے۔ نوجوان رکشا والوں کو تو جیسے ہر دم کہیں جانے کی جلدی رہتی ہے۔ اُن کی تیز رفتاری کے جوہر تو اس وقت کھلتے ہیں جب وہ کسی زنانی سواری کو اپنے رکشا میں لے جا رہے ہوں۔ زنانی سواری رکشا میں ہو تو رکشا والا اپنی رکشا رانی کے کرتب دکھانے پر اُتر آتا ہے۔ وہ تیر کی طرح رکشا کو لے جاتا ہے اور اس مغالطہ میں رہتا ہے کہ اس کے کمالِ فن کا اثر سواری کے دِل پر ہو رہا ہے اور یہ کہ جب وہ منزلِ مقصود پر پہنچ جائے گا تو سواری رکشا سے اُترتے ہی اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دے گی اور زندگی بھر اس کا ساتھ دینے کی قسم کھالے گی۔ لیکن جب منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد اسے سواری سے کرایہ کے سوائے کچھ بھی نہیں ملتا تو اچانک اس کے پیروں میں درد شروع ہو جاتا ہے اور وہ نڈھال ہو کر کسی ہوٹل کے آگے اپنے رکشا کو ''لینڈ'' کر دیتا ہے اور سب کچھ بھول کر اس کی کشتی میں سو جاتا ہے۔ پھر جب بڑی دیر بعد اس کی آنکھ کھلتی ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے۔ ع

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سُنا افسانہ تھا

بعض رکشا والے تو رکشا چلانے کو اپنے ''ہیرو'' ہونے کی واحد دلیل قرار دیتے ہیں۔ ایک رکشا والے نے مجھ سے فخریہ انداز میں کہا تھا:

''اجی صاحب! آپ رکشا چلانے کو بُری نظر سے دیکھتے ہوں تو ضرور دیکھیں مگر میں یہ کہتا ہوں کہ رکشا چلانا مردوں کا طرّہ امتیاز ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں خواتین مردوں کی برابری کر رہی ہیں لیکن رکشا رانی ہی وہ واحد پیشہ ہے جس میں خواتین کا ٹٹو نہیں چلتا۔ یہ خالص مردوں کا پیشہ ہے۔ میں رکشا چلانے پر فخر محسوس کرتا ہوں۔'' اب میں اسے کیا سمجھاتا کہ محض مردانگی کی لاج رکھنے کے لئے رکشا چلانا کہاں کی عقلمندی ہے۔

رکشا والوں کا ایک اڈّہ بھی ہوتا ہے جو اصل میں رکشا والوں کے لئے ادارۂ اقوام متحدہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہاں رکشا والے جمع ہو کر دن بھر کی سواریوں کا سروے کرتے ہیں اور اُن پر تبصرہ کرتے ہیں۔ ایک رکشا والا کہتا ہے:

''بھائیو! آج میں نے ایک شخص کی کلوگرام کے حساب سے سواری کی۔''

دوسرا پوچھتا ہے''وہ کیسے؟''

پہلا جواب دیتا ہے''وہ ایسے کہ آج گوشت اور پوست کا ایک پہاڑ میرے رکشا میں سوار ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے صاف صاف پوچھا کہ حضور آپ کا وزن کیا ہے؟ وہ بولا ۹۰ کلوگرام۔ اس پر میں نے کہا قبلہ میں آپ کو فی میل دو پیسے کلوگرام کے حساب سے لے چلوں گا ورنہ سادہ کرائے میں آپ کو لے چلنا تو اپنی موت کو دعوت دینا ہے۔ اس پر وہ شخص راضی ہوگیا اور میرا اچھو مر نکل گیا۔''

کوئی کہتا ہے آج میں نے نامپلی اسٹیشن سے ایک سواری کو معظم جاہی مارکٹ تک پہنچانے کے لئے پانچ روپے وصول کئے۔ دوسرے سارے رکشا والے اس کی طرف حیرت سے دیکھ کر پوچھتے ہیں'' نامپلی اسٹیشن سے معظم جاہی مارکٹ کا فاصلہ تو دو فرلانگ بھی نہیں ہے، تم نے پانچ روپے کس طرح وصول کئے؟''

اس پر رکشا والا قہقہہ لگا کر کہتا ہے'' بے وقوفو! یہ فلسفہ کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ بات یہ تھی کہ یہ شخص کوئی نیا پنچھی تھا، سو میں اسے نامپلی اسٹیشن سے سکندرآباد اسٹیشن تک لے گیا، وہاں سے پھر اسے معظم جاہی مارکٹ پر بحفاظت تمام پہنچا دیا۔ اس بیچارے کی تفریح ہوگئی اور میرا کرایہ پکا ہوگیا۔''

میں نے بعض سخن فہم رکشا والے بھی دیکھے ہیں جو نہ صرف اپنے رکشا کی پیٹھ پر درد انگیز اور کسی حد تک حیرت انگیز اشعار لکھواتے ہیں بلکہ خود بھی شاعری فرماتے ہیں۔ ایک بار مجھے ایسے ہی ایک رکشا والے کے رکشا میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ مجھے عابد روڈ سے شاہ علی بنڈہ جانا تھا۔ ایک خالی رکشا سامنے سے آتا ہوا نظر آیا۔ میں نے آواز دی اور کہا:'' میاں کرایہ کروگے؟''

وہ بولا'' آپ کی نوازش ہے۔ عنایت ہے، ضرور کرایہ کریں گے۔''

میں نے پوچھا'' شاہ علی بنڈہ چلنے کا کیا کرایہ لوگے؟''

اُس نے کہا'' عرض کیا ہے کہ ایک روپیہ لوں گا۔''

میں اس کے اخلاق سے بے حد متاثر ہوا اور مزید کچھ سوچے سمجھے بغیر اس کے رکشا

میں بیٹھ گیا۔ رکشا تھوڑی دُور بھی نہ گیا ہوگا کہ رکشا والے نے پلٹ کر پوچھا:

''حضور توجہ چاہتا ہوں، گستاخی معاف، کیا یہ ناچیز پوچھ سکتا ہے کہ آپ کیا کام کرتے ہیں؟''

میں نے کہا ''بس یوں ہی کبھی کبھار مضامین لکھ لیتا ہوں۔'' میرا جواب سُن کر وہ اچانک رکشا سے اُتر گیا۔ اُس نے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھا کر کہنے لگا: ''پروردگار! تیرا شکر ہے کہ مدتوں بعد مجھے آج وہ سواری ملی ہے جس کی مجھے عرصہ سے تلاش تھی۔'' اس کے بعد وہ مجھ سے یوں مخاطب ہوا:

''کمترین کو نذیر علی گھائل کہتے ہیں۔ نذیر علی تو نام ہے اور گھائل تخلص۔ عرصہ سے سوچ رہا تھا کہ اپنی غزلیں کسی ایسے شخص کو سناؤں جو واقعی اُنہیں سمجھ سکے۔ خُدا نے آج میری سُن لی ہے اور آپ کو میرے رکشا میں بٹھا دیا ہے۔ تو لیجئے میں آپ کی خدمت میں اپنی تازہ غزل کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔''

اِتنا کہہ کر وہ یکبارگی رُک گیا اور بولا: ''یہ بتایئے کہ غزل تحت اللفظ سناؤں یا ترنم سے؟'' میں نے کہا: ''جس طرح آپ مناسب سمجھیں۔''

اس کے بعد وہ رکشا چلاتے چلاتے اپنی غزل کے اشعار پڑھنے لگا۔ میں اسکے دل کو ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ سو جب بھی میں غلطی سے اس کے کسی بے تکے شعر پر مصلحتاً داد دیتا تو وہ رکشا کو بریک لگا کر سڑک پر اُتر پڑتا اور ''آداب عرض، آداب عرض'' کی رٹ لگاتا اور مجھے اتنے سلام کرتا کہ ہر چلنے والا اس کی اور میری حرکتوں کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگ جاتا۔

جب پندرہ غزلوں اور چار قطعات کے بعد شاہ علی بنڈہ آیا تو میری جان میں جان آئی۔ اُتر کر اُسے کرایہ کا ایک رُوپیہ دینا چاہتا تھا کہ اُس نے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا ''اجی اب رہنے بھی دیجئے، ایسا بھی کیا تکلف ہے، آپ تو ہمارے بھائی بندوں میں ہیں۔ آپ سے پھر کب ملاقات ہوگی؟'' اس پر میں نے کہا ''اب کیسی ملاقات، کہاں کی ملاقات، میں تو آج ہی رات ہندوستان چھوڑ کر انگلستان جا رہا ہوں۔ زندگی باقی رہے گی تو پھر کبھی ملاقات ہوگی۔'' لیکن وداع ہوتے وقت میں نے اسے نصیحت کی کہ وہ یا تو شاعری کرنا

چھوڑ دے یا رکشا چلانا چھوڑ دے۔ اور میری نصیحت کے جواب میں اُس نے کہا "صاحب! شاعری کے چکر میں تو رکشا چلانے کی نوبت آئی ہے، اب کیسے چھوڑ دیں اور کسے گلے لگائیں۔" وہ دن اور آج کا دن، میں نے کبھی کسی رکشا والے سے شاعری کی بات نہیں کی۔

چلتے چلتے ایک بات عرض کردوں کہ میں رات کے وقت رکشا میں اس وقت تک نہیں بیٹھتا جب تک کہ رکشا والے کی صورت اچھی طرح دیکھ نہ لوں۔ اس لئے کہ ایک بار میرے ساتھ بڑا دھوکہ ہوا تھا۔ میں کسی فلم کا سکنڈ شو دیکھ کر ایک رکشا میں واپس ہو رہا تھا۔ وہ کوئی جاسوسی فلم تھی۔ رات کے سنّاٹے سے میں کچھ خوفزدہ ہوگیا تھا۔ اسی لئے میں نے اپنی توجہ کو ہٹانے کے لئے رکشا والے سے بات چیت شروع کردی۔ میں نے رکشہ والے سے کہا: "تم تو کافی جوان اور ہٹے کٹے نظر آتے ہو، رکشا چلانے کی بجائے کوئی دوسرا کام کیوں نہیں کرتے؟"

وہ بولا "میری مجبوریاں آپ کیا جانیں، رکشہ چلانا کوئی شوق تو ہے نہیں کہ آدمی خوشی خوشی یہ کام کرتا رہے۔"

میں نے پوچھا: "کچھ تعلیم بھی حاصل کی ہے تم نے؟"

وہ بولا: "میٹرک تک تعلیم پائی تھی۔"

"شادی ہوئی ہے تمہاری؟"

"اجی صاحب میری شادی کی بات چھوڑیئے۔ مجھے تو اس وقت اپنی بہن کی شادی کی فکر پڑی ہے، جبھی تو راتوں کو بڑی دیر تک رکشا چلاتا ہوں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ اپنی شادی تو اس رکشا سے ہوچکی ہے۔"

اسی اثناء میں میرا گھر آگیا۔ گلی میں اندھیرا تھا۔ میں نے ریزگاری تلاش کرنے کے لئے دیا سلائی جلائی تو اچانک میری نظر رکشا والے کے چہرے پر پڑگئی اور دیا سلائی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔

میں نے زور سے پکارا:

"ارے حمید تم ____ ؟"

اور دُوسرے ہی لمحہ رکشا والے نے اپنا رکشا موڑ لیا اور تیر کی طرح اندھیرے میں

غائب ہو گیا۔

میرے ہاتھ میں اٹھنی دھری کی دھری رہ گئی۔ یہ اٹھنی آج بھی ہمیشہ میری جیب میں پڑی رہتی ہے۔ میں اسے حمید کو دینا چاہتا ہوں۔ حمید میرے بچپن کا دوست ہے۔ مجھے اس کا پتہ معلوم نہیں۔ اس بات کو دو سال بیت گئے مگر حمید کی اٹھنی میری جیب میں اب بھی محفوظ ہے۔ کسی دن وہ مل جائے تو میں اسے یہ اٹھنی ضرور دوں گا۔ شاید اس اٹھنی کی مدد سے اُس کی بہن کی شادی ہو جائے۔

مگر وہ پھر کبھی نہیں ملا ____

نہ جانے وہ زندگی کے کن نشیب و فراز سے گزر رہا ہے۔

پھر ایک رکشا والے کی زندگی میں نشیب و فراز کے سوائے ہوتا بھی کیا ہے۔ میں دو برسوں سے اسے سڑکوں پر تلاش کر رہا ہوں ___

اور اب تو مجھے ____

ہر رکشا والے کی صورت پر حمید کی صورت کا گمان ہوتا ہے۔

(قطع کلام۔ ۱۹۶۹)

ٹرین میں پڑھنا

ایک زمانہ تھا جب ہم کو مطالعہ کرنے کا بڑا شوق تھا بلکہ یہ شوق جُرم کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ جُرم ان معنوں میں کہ ہم دوستوں سے کتابیں مانگ کر لایا کرتے تھے اور جب اُنہیں واپس کرنے کا وقت آتا تھا تو ہم دوستی کو قبل از وقت دُشمنی میں بدل دیتے تھے اور مالِ غنیمت کے طور پر کتابیں ہمارے پاس رہ جاتی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارے گھر میں کتابوں کا انبار لگ گیا اور ہم نے اس انبار کو بڑے سلیقہ سے الماریوں میں رکھ کر ایک لائبریری کی شکل دے دی، لیکن رفتہ رفتہ ہمارے مطالعہ کا شوق بھی الماریوں میں بند ہوتا چلا گیا کیوں کہ شادی کے بعد ہماری زندگی خود ایک ضخیم کتاب میں تبدیل ہوگئی۔ ہماری بیوی ہر سال بڑی پابندی سے اس کتاب میں ایک نئے باب کا اضافہ کرنے لگی اور اب یہ حال ہے کہ ہماری زندگی کی کتاب کا ایک ایک ورق بکھر گیا ہے۔ آپ ہی بتایئے کہ ایسے میں کتابوں کا مطالعہ کیسے کریں۔

اب ہمارا مطالعہ صرف سفر کی حد تک محدود ہو کر رہ گیا ہے یعنی جب بھی ہم کہیں سفر پر جاتے ہیں تو مطالعہ سے اپنا جی بہلاتے ہیں اور ہمیں اپنا وہ ماضی یاد آجاتا ہے جب ہم بلا ٹکٹ ایک ہی نشست میں کئی کتابیں پڑھ ڈالتے تھے۔ ایک ہم پر ہی کیا موقوف ہے، ٹرین میں سفر کرتے وقت اچھا خاصا مسلّمہ جاہل آدمی بھی تعلیم یافتہ اور دانشور نظر آنے لگتا ہے۔ ٹرین کے مسافر کے پاس ٹکٹ ہو یا نہ ہو، اس کے پاس ایک کتاب یا پرچے کا ہونا نہایت ضروری ہے اور ہم آپ سے جھوٹ نہیں کہتے کہ ادھر چند برسوں میں ہم نے مختلف کتابوں کے

جو تین چار صفحات پڑھے ہیں وہ سب کے سب ٹرین میں پڑھے ہیں۔ ٹرین میں مطالعہ کا لطف ہی کچھ اور ہوتا ہے۔ یعنی ٹرین جب ہچکولے کھاتی ہوئی آگے بڑھتی ہے تو ہم اپنے سامان پر ایک اُچٹتی سی نظر ڈالتے ہیں اور کتاب کھول کر برتھ پر دراز ہو جاتے ہیں، تھوڑی دیر تک تو کتاب اور ٹرین دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہیں مگر اس کے بعد ہماری نظروں کے سامنے کتاب کی سطریں بڑی تیزی سے پٹریاں بدلنے لگتی ہیں اور اس کے بعد نہ جانے کب ہماری آنکھیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ پھر کتاب ہمارے سینے پر یوں سوار ہو جاتی ہے جیسے وہ خود ہمارا مطالعہ کر رہی ہو۔ پھر نہ جانے کب تک ہم سوئے رہتے ہیں مگر اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ ہماری نیند اُچٹ جاتی ہے۔ ہم ہڑبڑا کر اُٹھ بیٹھتے ہیں۔ ہمارا ہاتھ اپنے سینے پر کتاب کو تلاش کرنے لگتا ہے مگر کتاب وہاں نہیں ہوتی۔ ہماری تشویش میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو جاتا ہے اور ہم فوراً برتھ پر اُٹھ بیٹھتے ہیں مگر ساتھ ہی اطمینان کی ایک لمبی سانس ہمارے سینے سے نکل جاتی ہے کیوں کہ ہمیں اپنی کتاب نظر آجاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ کتاب ہمیں اپنے برابر والی برتھ کے مسافر کے سینہ پر نظر آتی ہے۔ مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ ہمارے سونے کے بعد ہمارے پڑوسی مسافر نے موقع کو غنیمت جان کر ہمارے سینہ پر سے کتاب اُٹھالی تھی اور پھر اُن کے ساتھ بھی وہی ہوا تھا جو ہمارے ساتھ ہوا تھا۔ تب ہم اپنی کتاب کو پڑوسی مسافر کے سینے پر سے بڑی آہستگی کے ساتھ یوں اُٹھاتے ہیں، جیسے ہم اس کتاب کی چوری کر رہے ہوں۔ پھر از سرِ نو نیت باندھ کر اس کتاب کے مطالعہ میں غرق ہوتے چلے جاتے ہیں اور اتنا غرق ہوتے ہیں کہ پھر یہ کتاب ہمارے سینے پر دراز ہو جاتی ہے اور جب ہم دوبارہ جاگتے ہیں تو پھر ہم اس کتاب کو اپنے پڑوسی مسافر کے سینے پر پاتے ہیں اور یہ سلسلہ منزلِ مقصود کے آنے تک جاری رہتا ہے۔ کتاب کا کام صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی جائے اور ہم اس عمل کے عادی ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہماری اور ہمارے پڑوسی مسافر کی آنکھیں بیک وقت کھلتی ہیں اور ہم دونوں کے ہاتھ عادتاً ایک دوسرے کے سینوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ اور جب ہم دونوں میں سے کسی کو بھی کتاب نہیں ملتی تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس کتاب کا حلقۂ احباب اب کافی وسیع ہو گیا ہے اور یہ کہ یہ کتاب ٹرین کے ڈبے میں مقبول ہوتی جا رہی ہے اور اس کا دوسرا ایڈیشن شائع

کرنے کی نوبت آگئی ہے۔ ہم دونوں جب ایک دوسرے کے حیران چہروں کو دیکھ کر نیچے نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہماری کتاب ہنوز بخیر و عافیت ہے اور اب کی بار نیچے کی برتھ والے مسافر کے سینہ پر آرام کر رہی ہے۔ اب کی بار ہم کتاب کو اوڑھے بغیر ہی سو جاتے ہیں اور درمیان میں جب بھی ہماری آنکھ کھلتی ہے تو اپنی کتاب کو کسی نئے مسافر کے سینہ پر پاتے ہیں۔ پھر ایک موقع ایسا بھی آتا ہے جب ہماری کتاب اچانک ڈبے سے غائب ہو جاتی ہے۔ ہم اسے ڈبے سے لے کر باتھ رُوم میں تک تلاش کرتے ہیں مگر وہ ہمیں داغِ مفارقت دے جاتی ہے۔ ہم سینہ پر کتاب کو رکھنے کی بجائے پتھر رکھ لیتے ہیں۔ پھر ہمارا اسٹیشن آجاتا ہے۔ جب ہم سامان لے کر باہر جانے لگتے ہیں تو ٹرین کے سب سے آخری ڈبے میں ہمیں ایک صاحب ہماری کتاب کے مطالعہ میں غرق نظر آتے ہیں۔ ہم قریب جا کر دست بستہ عرض کرتے ہیں "یہ کتاب ہماری ہے۔ ہمیں واپس فرمایئے۔" اس پر وہ صاحب ہمارے حقوقِ ملکیت کو شُبہ کی نظر سے دیکھتے ہوئے فرماتے ہیں "معاف کیجئے میں نے یہ کتاب برابر والے ڈبے کے ایک اور صاحب سے حاصل کی ہے، آپ کو میں یہ کتاب کیسے دے سکتا ہوں۔" ہم برابر والے ڈبے کے شخص مذکور سے ربط پیدا کرتے ہیں۔ وہ جواباً ہمیں پھر اس کے برابر والے ڈبے کی طرف بڑھا دیتا ہے۔ ہم ڈبہ در ڈبہ اپنے پرانے ڈبے کی جانب بڑھنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ ٹرین کے گارڈ کو کسی طرح پتہ چل جاتا ہے کہ ہماری کتاب کا سلسلۂ حسب نسب اب ہم سے ملا ہی چاہتا ہے تو وہ فوراً ہری جھنڈی ہلا کر سیٹی بجا دیتا ہے اور ٹرین کا سگنل ہماری قسمت پر گر جاتا ہے۔ ہماری کتاب ایک اجنبی مسافر کے پاس رہ جاتی ہے۔ ٹرین پلیٹ فارم سے اور کتاب ہمارے ہاتھ سے نکل چکی ہوتی ہے۔ ہم منہ لٹکائے پلیٹ فارم سے باہر آجاتے ہیں اور تہیہ کر لیتے ہیں کہ آئندہ کبھی ٹرین میں کتاب اپنے ساتھ نہ رکھیں گے مگر آپ ہی بتایئے ہم کیا کریں۔ ہمیں تو صرف ٹرین میں کتابیں پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ گھر میں تو ہم بحالتِ مجبوری صرف اپنے بچّوں کے کورس کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ اس لئے کہ ہمیں ان کتابوں کو پڑھانا ہوتا ہے لہٰذا اتنے سارے تلخ تجربوں کے باوجود ہم سفر میں اپنے ساتھ کوئی کتاب یا اخبار رکھنے پر مجبور ہیں۔

اب آپ سے کیا چھپائیں کہ ہمیں اخبار پڑھنے کا موقع بھی صرف ٹرین میں ہی ملتا

ہے۔ اس لئے جب بھی سفر پر جاتے ہیں، ہمیں دُنیا کے حالات اچانک بدلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مشرقِ وُسطیٰ کے کسی ملک میں فوجی انقلاب آیا ہے۔ ہم حیران ہو کر اپنے برابر والے مسافر سے پوچھتے ہیں "بھئی یہ کیا معاملہ ہے۔ ابھی چار مہینے پہلے جب میں بمبئی گیا تھا تو اس وقت بھی اس ملک میں انقلاب آیا تھا، آخر یہ سب کیا ہو رہا ہے؟"

اس پر مسافر کہتا ہے "مجھے کیا معلوم، میں تو پورے آٹھ سال بعد سفر کر رہا ہوں، میں دُنیا کے حالات سے آپ کے مقابلے میں بہت کم واقف ہوں۔"

اس پر تیسرا مسافر ہم سے مخاطب ہو کر کہتا ہے "جناب والا، آپ چار مہینے پہلے کے انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں حالانکہ اس اثناء میں اس ملک میں کوئی چھ انقلاب آ چکے ہیں۔"

اس جواب کو سُن کر ہم جھینپ جاتے ہیں اور کہتے ہیں "معاف کیجئے میں آپ کی طرح ہر روز ٹرین میں سفر نہیں کرتا کہ ہر روز کے حالات سے واقفیت رکھوں۔ میں تو سال بھر میں دو تین بار ہی سفر کرتا ہوں۔ اور یوں بات دب جاتی ہے۔"

مگر ٹرین میں کتاب کا مطالعہ تو پھر بھی قابلِ برداشت ہوتا ہے۔ مشکل تو اخبار کے مطالعے میں ہوتی ہے کیوں کہ اخبار مجلّد نہیں ہوتا اور اس کی تقسیم بڑی آسانی سے عمل میں آ جاتی ہے۔ آپ ایک سالم اخبار لے کر ٹرین کے ڈبّے میں سوار ہوتے ہیں لیکن ابھی آپ اپنا اخبار اپنی نشست پر رکھ کر اپنا سامان سیٹ کے نیچے جمانے بھی نہیں پاتے کہ اچانک آپ کے کانوں میں "پھڑ پھڑ" کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔ پلٹ کر دیکھتے ہیں، تو انکشاف ہوتا ہے کہ ایک نو وارد مسافر آپ کے اخبار کو بطور جھاڑو استعمال کر رہا ہے۔ آپ اخبار کو اس کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ "تھینک یُو" کہہ کر آپ کی زبان پر تالا لگا دیتا ہے۔

خیر صاحب ٹرین چلتی ہے اور آپ اخبار اپنے منہ کے سامنے پھیلا لیتے ہیں، اتنے میں برابر والا مسافر ایک طویل جماہی لیتے ہوئے چُٹکی بجا کر کہتا ہے "قبلہ ذرا اُوپر کا صفحہ تو عنایت فرمائیے۔ دیکھیں آج کی خاص خاص خبریں کیا ہیں۔ آپ اپنی خاندانی شرافت سے مجبور ہو کر اُوپر کا صفحہ مسافر کو دے دیتے ہیں اور بقیہ اخبار کو اپنے ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑ لیتے ہیں لیکن تھوڑی دیر بھی نہیں ہوتی کہ مسافر مذکور آپ سے کہتا ہے قبلہ اب ذرا آٹھواں صفحہ تو عنایت فرمائیے۔ کیوں کہ پہلے صفحہ والی ایک خبر کا سلسلہ آٹھویں صفحہ پر موجود ہے۔ اب

اخبار آپ کے ہاتھوں سے قسطوں میں نکلنے لگتا ہے اور کچھ دیر بعد آپ کے اخبار کے صفحات ''فیض عام'' کی طرح سارے ڈبّے میں گشت کرنے لگتے ہیں۔ خبروں کے سلسلے ایک صفحہ سے دُوسرے صفحہ پر اور ایک مسافر سے دُوسرے مسافر تک جانے لگتے ہیں اور آپ کا اخبار مشرق سے لے کر مغرب تک اور جنوب سے لے کر شمال تک پھیل جاتا ہے۔

پھر آپ کی چشمِ گُنہ گار ایک اسٹیشن پر یہ منظر بھی دیکھتی ہے کہ ایک مسافر نے آپ کے اخبار کے ایک صفحہ کو دستر خوان میں تبدیل کرلیا ہے۔ اور اس صفحہ پر انواع واقسام کی نعمتیں سجادی گئی ہیں۔ آپ بڑی حسرت سے اُن نعمتوں کی طرف دیکھتے ہیں کہ شاید اخبار کے مالک ہونے کی حیثیت سے آپ کو بھی ان نعمتوں سے فیض یاب ہونے کی دعوت دی جائے لیکن آپ کی حسرت صرف حسرت ہی بنی رہتی ہے۔ پھر اخبار کے دستر خوان پر سے کھانے پینے کی اشیاء اُٹھالی جاتی ہیں۔ آپ کے دل میں موہوم سی اُمید پیدا ہوتی ہے کہ شاید آپ کا اخبار آپ کو واپس مل جائے لیکن اچانک اس اخباری دستر خوان کی مدد سے سیٹ کو پونچھنے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور قبل اس کے کہ آپ اپنے اخبار کی جان بچائیں آپ کا اخبار اچانک مسافر کی مٹھی میں ایک گیند کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اخبار کی یہ گیند کھڑکی سے باہر چلی جاتی ہے۔ پھر ایک بلند بانگ ڈکار کی آواز آتی ہے اور آپ کا اخبار ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہضم ہوجاتا ہے۔ آپ صبر کرکے اپنے اخبار کے باقی ماندہ صفحات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن اس وقت پتہ چلتا ہے کہ کسی مسافر نے آپ کے اخبار میں کیلے باندھ رکھے ہیں، کسی نے چڑوا سجا رکھا ہے، کوئی اسے پنکھے کے طور پر استعمال کررہا ہے، کسی نے اپنے روتے ہوئے بچّے کو بہلانے کے لئے اخبار کے صفحے کو پھاڑ کر ایک خوبصورت سی کشتی بنادی ہے اور بچہ خوب زور زور سے ہنس رہا ہے۔ ایسے وقت آپ کا جی چاہتا ہے کہ آپ فوراً ٹرین کے خطرہ کی زنجیر کھینچ دیں اور ریلوے حکام کو مطلع کردیں کہ آپ چاروں طرف سے دُشمنوں کے نرغے میں گھر گئے ہیں مگر اس وقت تک آپ کے اخبار کے باقی صفحات بھی صفحہ ہستی سے مٹ جاتے ہیں۔ اسی لئے تو ہم نے اب یہ طریقہ بنا رکھا ہے کہ جب بھی ٹرین سے سفر کرتے ہیں تو اپنے ساتھ ایک ہی تاریخ کے ایک ہی اخبار کی پندرہ پندرہ کاپیاں رکھتے ہیں کہ اخبار کی ایک کاپی ضائع ہو تو دُوسری کاپی فوراً نکال لی جائے اور مطالعہ جاری رکھا جائے لیکن ایسا کرنے سے

ہماری حیثیت کو بڑا شدید دھکّا پہنچتا ہے کیوں کہ جب ہم اخبار کی پندرہ کاپیاں ایک ساتھ لے کر ڈبے میں سوار ہوتے ہیں تو ڈبہ کے مسافرین ہمیں دیکھ کر پکارنے لگتے ہیں ''او میاں! پیپر والے ہمیں بھی ایک اخبار دینا۔'' اور ہم غصہ میں آ کر اخبار کی کئی کاپیاں مسافروں میں تقسیم کر دیتے ہیں اور کہتے ہیں ''ساتھیو! اتنے سارے اخبارات کی مفت تقسیم کے بعد بھی اگر پھر کسی نے میری کاپی کی طرف نظر ڈالی تو مجھ سے بُرا کوئی نہ ہوگا۔ میں اکیلا ہی اپنا اخبار پڑھنا چاہتا ہوں۔''

(قطع کلام۔۱۹۶۹)

سردی کی گرما گرمی

پرسوں رات جب کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی تو ہمیں اچھی طرح یاد ہے کہ اس وقت رات کے نو بج رہے تھے۔ کیوں کہ خود ہم نے اپنے کانوں سے پولیس تھانہ کے پہرہ دار کو جملہ نو گھنٹے بجاتے ہوئے سُنا تھا۔ پھر ہم نے رضائی میں سے اپنا منہ نکال کر اپنی گھڑی بھی دیکھ لی تھی اور اس کے بعد رضائی میں غوطہ لگا کر حالات کی سرد مہری کے بارے میں غور کرنے میں مصروف ہو گئے تھے۔ کوئی ایک گھنٹہ تک ہم اسی طرح غور کرتے رہے۔ اس کے بعد پہرے دار نے پھر گھنٹے بجانے شروع کیے اور ہم نے حسب عادت ان گھنٹوں کو گننا شروع کر دیا۔ تین گھنٹے تو صاف سنائی دیئے مگر چوتھے گھنٹہ کی آواز اچانک کچھ اس طرح ٹھٹھر کر رہ گئی جیسے کسی نے اس آواز کا گلا گھونٹ دیا ہو۔ ہم پھر گھنٹے بجنے کا انتظار کرتے رہے لیکن آواز کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ ہم حیران ہو کر رضائی میں پلکیں جھپکانے لگے کہ یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ ابھی ایک گھنٹہ پہلے تو نو بجے تھے۔ یہ اچانک چار کس طرح بج گئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم چھ گھنٹے تک حالاتِ حاضرہ پر غور کرتے رہے۔ ویسے ہمارے حالات ابھی اتنے خراب بھی نہیں ہوئے ہیں کہ ہم لگاتار چھ چھ گھنٹوں تک ان پر غور کریں۔ رضائی اپنے چہرے سے ہٹا کر گھڑی دیکھی تو اس میں دس ہی بج رہے تھے۔ محض گیارہ بجنے کے انتظار میں جاگتے رہے اور جب گھڑی میں گیارہ بجے تو پہریدار نے پھر گھنٹے بجانا شروع کر دیئے۔ اور اب اس بار اس نے صرف تین ہی گھنٹے بجائے۔ ہم پہریدار کی اس نامعقول حرکت پر رات بھر غور کرتے رہے۔

دُوسرے دن علی الصبح پہریدار سے شکایت کی کہ کل رات جب دس بج رہے تھے تو تمہارے پاس چار کس طرح بج گئے اور گیارہ بجے تم نے تین گھنٹے کس طرح بجائے۔ اس پر پہریدار نے اپنے دانتوں کو بجاتے ہوئے کہا "حضور! یہ تو وقت وقت کی بات ہے۔ رضائی اوڑھ کر گھنٹوں کو بجتے ہوئے سننا ایک الگ بات ہے اور کڑاکے کی سَردی میں کپکپاتے ہوئے رات کے دس بجے چار گھنٹے بجانا ایک الگ بات ہے۔ اگر آج رات آپ سردی میں دس بجے ایک ہی گھنٹہ بجا کر دکھادیں تو میں دس بجے دس نہیں پندرہ گھنٹے بجانے کو تیار ہوں۔"

پہریدار کے اس جواب کو سن کر ہم پر برف سی گر گئی۔ ہمارے کان منجمد ہوگئے اور اتنے منجمد ہوگئے کہ اس کے بعد سے کبھی ہم نے سردی کے موسم میں گھنٹوں کی تعداد کے معاملہ پر غور کرنے کی کوشش نہیں کی۔ البتہ ہم نے گھنٹوں کی تعداد سے درجۂ حرارت کو ناپنے کا ایک پیمانہ ضرور ایجاد کرلیا ہے۔ اگر کسی دن پہریدار دس بجے چھ گھنٹے بجاتا ہے تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ سردی آج کم ہے اور کبھی وہ دس بجے ہی دو گھنٹے بجاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سردی آج بہت زیادہ ہے۔ اور اگر کسی دن کوئی گھنٹہ بجتا ہی نہیں تو رضائی میں ہمارے دانت خود بخود بجنے لگتے ہیں۔ پھر اسی پہرہ دار کا خیال ہے کہ اگر وہ رات میں دس بجے چار گھنٹے بجاتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آج رات دس بجے ہی اتنی سردی پڑ رہی ہے جسے اصولاً صبح میں چار بجے پڑنا چاہئے تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی غلط بات بھی نہیں ہے۔ سردی کے موسم کی منطق ہی جُداگانہ ہوتی ہے۔

ہمیشہ ہم صبح میں سات بجے اُٹھنے کے عادی ہیں۔ لیکن سردی کے موسم میں نو بجے ہمارے سات بجتے ہیں اور شام میں سات بجے ہی رات کے بارہ بج جاتے ہیں۔

یقین مانیئے جب سردی کا موسم آتا ہے تو زندگی کی ہر سرگرمی ٹھٹھر کر رہ جاتی ہے حد تو یہ ہے کہ ادب تک میں جمود آجاتا ہے۔ پرسوں کی بات ہے کہ بعض شعراء نے اس کڑاکے کی سردی میں ایک مشاعرہ کا اہتمام کیا تھا۔ اس مشاعرہ میں ہم نے بھی ایک سامع کی حیثیت سے شرکت کی تھی۔ جب اناؤنسر نے صدر مشاعرہ سے مسندِ صدارت پر جلوہ افروز ہونے کی خواہش کی تو ہم نے کانوں پر لپیٹے ہوئے مفلر کو ذرا سا ہٹا کر دیکھا کہ مشاعرہ کی صدارت بغلوں میں ہاتھ دابے لرزتی کپکپاتی مسندِ صدارت کی جانب بڑھ رہی ہے۔ جب صدارت

مسندِ صدارت میں دھنس گئی تو ہمیں یوں معلوم ہوا جیسے صدارت منجمد سی ہوگئی ہے۔ چاروں طرف سے کپڑوں میں لپٹی ہوئی صدارت ہم نے آج تک نہیں دیکھی تھی۔ مشاعرہ کے اناؤنسر نے شاعر کا نام پکارا، اس کے جواب میں شاعر نے بید مجنوں کی طرح کانپتے ہوئے جب صدر مشاعرہ کی طرف دیکھ کر پوچھا ــــ ''اجازت ہے؟'' تو صدارت نے صرف دانت بجا کر کلام سنانے کی اجازت دے دی۔ شاعر مذکور نے بڑی مشکل سے مطلع سُنایا لیکن اس مطلع میں بھی دانتوں کے بجنے کا ترنّم زیادہ تھا اور غزل کا ترنم کم تھا۔ پھر جب اُس نے دوسرا شعر سُنایا تو پتہ چلا کہ دونوں مصرعے سردی کی وجہ سے بے وزن ہوگئے ہیں۔ مطلع تو بڑی بحر میں تھا مگر بعد کا شعر چھوٹی بحر میں ادا ہوگیا تھا۔ سردی میں بڑی بحر کا شعر سکڑ کر چھوٹی بحر کا بن جاتا ہے، یہ شاعری کا قانون نہیں قدرت کا قانون ہے لیکن سامعین میں سے کسی نے شعر کی بے وزنی کی جانب غور نہیں کیا کیوں کہ سبھوں کے کانوں پر مفلر لپٹے ہوئے تھے اور اتنے موٹے مفلروں کو چیرتے ہوئے شعر کا کانوں میں داخل ہونا ناممکن سی بات تھی۔ ایک اچھا شعر دل میں تو بڑی آسانی سے اُتر سکتا ہے لیکن سردی کے موسم میں اس کا کانوں میں اُترنا بہت دُشوار ہوتا ہے۔ جب بھی کوئی شاعر صدرِ مشاعرہ کی طرف دیکھ کر کہتا: ''حضور توجہ چاہتا ہوں'' تو ہمیں صدارت کے ڈھیر میں ذرا سی بھی جنبش نظر نہ آئی۔ وہ تو ایک بے جان سی گٹھری میں تبدیل ہوگئی تھی۔ مشاعرہ بس اسی طرح جاری رہا۔ ہر شاعر کو جیسے مطلع سناتے ہی مقطع سنانے کی فکر لاحق تھی، وہ شعرا جو عام مشاعروں میں دوغزلہ اور سہ غزلہ سنانے کے لئے بدنام ہیں اُنہوں نے صرف مقطع سنا کر اپنی جان چھڑائی۔ ہم جب اس مشاعرہ سے واپس ہونے لگے تو ہم نے دیکھا کہ سارے شعراء کلام سُنا کر اور سامعین کلام سن کر واپس جا چکے ہیں اور ''صدارت'' مسندِ صدارت پر سو رہی ہے۔ ہم نے ایسی سردی میں ''صدارت'' کو جگانے کی بداخلاقی نہ کی اور واپس چلے آئے۔

چاہے کچھ بھی ہو سردی کا موسم آدمی کو بڑا مہذب اور مودّب بنا دیتا ہے۔ جس کسی کو دیکھئے وہ اپنے دونوں ہاتھ بغلوں میں دابے یوں کھڑا نظر آئے گا جیسے عجز و انکسار کا خاتمہ اسی پر ہو رہا ہو۔ آدمی کے ہاتھ بغلوں میں یوں دبے رہتے ہیں جیسے اُنہیں بغلوں سے جوڑ دیا گیا ہو۔ پرسوں رات ہمیں ایک بس میں سوار ہونے کا موقع ملا۔ ہم حسبِ عادت بس کا

ٹکٹ خریدنا چاہتے تھے۔ اور اس معاملہ میں ہماری نیت بالکل صاف تھی لیکن کیا کریں، اس وقت ہمارے دونوں ہاتھ بغلوں میں دبے ہوئے تھے۔ ہم نے سوچا کہ جب کنڈکٹر ٹکٹ کے پیسے مانگنے آئے گا تو ہم اس وقت اپنے ہاتھوں کو آزاد کریں گے۔ لیکن ہماری نظر کنڈکٹر پر پڑی تو دیکھا کہ وہ بھی بغلوں میں ہاتھ دابے اپنی نشست پر بیٹھا ہے اور کسی قیمت پر ٹکٹ دینے کی خاطر اپنے ہاتھوں کو بغلوں میں سے نکالنے کے لئے تیار نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ صورتِ حال ہمارے حق میں فائدہ مند تھی۔ ہم نے بس کے دوسرے مسافروں پر نظر ڈالی تو وہ بھی سب کے سب بغلوں میں ہاتھ دابے بیٹھے تھے۔ ہم نے کچھ لمحہ کے لئے اطمینان کا سانس لیا۔ لیکن اسی اثناء میں ہماری نظر بس کے ڈرائیور پر جو پڑی تو ہمارا خون تقریباً منجمد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اس لئے کہ بس ڈرائیور بھی اس وقت ہاتھ باندھے بیٹھا تھا اور بس سیدھی سڑک پر کم از کم ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہی تھی۔ ہیبت کے مارے ہمارے ہاتھ خود بخود بغلوں میں سے نکل گئے۔ ہم نے گھنٹی بجائی اور جب ڈرائیور نے بادلِ نخواستہ بس روکی تو ہم تیر کی طرح بس سے نکل کر باہر آگئے، اس لئے کہ ہم ایسی بس میں بلا ٹکٹ سفر کرنے کے لئے ہرگز تیار نہ تھے جس کا ڈرائیور بھی ہاتھ باندھ کر بس چلا رہا ہو۔

ہم نے ایک سڑک پر یہ منظر بھی دیکھا کہ ایک صاحب ایک بھکاری کو خیرات دینا چاہ رہے تھے لیکن سردی میں کوٹ کی جیب سے اپنے ہاتھ کو باہر نکالنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ وہ بڑی حسرت کے ساتھ بھکاری کی طرف دیکھ رہے ہیں، اور بھکاری بھی اپنے ہاتھ اُن کے سامنے پھیلانے کے لئے تیار نہیں ہے اور بڑی مجبور نظروں سے اُن کی طرف دیکھ رہا ہے جیسے کہہ رہا ہو ”مائی باپ، اگر آپ گرمی کے موسم تک زندہ رہیں تو آپ سے پھر کبھی خیرات لے لوں گا لیکن اس وقت خیرات دے کر مجھے عذاب میں مبتلا نہ کیجئے۔“

آپ اسے مذاق نہ سمجھئے کہ سردی کے موسم میں جب بھی ہماری ملاقات کسی دوست سے ہوتی ہے تو ہم اس سے کبھی مصافحہ نہیں کرتے بلکہ صرف اپنی گردن ہلا کر اسے ٹرخا دیتے ہیں۔ آخر سلام بھی تو سردی میں منجمد ہو جاتا ہے۔

سردی کے موسم میں ان پڑھ اور جاہل آدمی بھی فلسفی بن جاتا ہے۔ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے وہ اس مسئلہ پر گھنٹوں غور کرتا ہے۔ ہماری ہی مثال لیجئے کہ صبح میں ہم یوں

تو سات بجے ہی بستر میں جاگ جاتے ہیں لیکن رضائی سے باہر نکلنے کے مسئلہ پر کوئی دو گھنٹوں تک مسلسل غور کرتے ہیں اور اس غور و فکر کے بعد رفتہ رفتہ رضائی میں سے یوں برآمد ہوتے ہیں جیسے انڈے میں سے مرغی کا چوزہ برآمد ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ غسل خانہ میں پہنچ کر ہم ایک گھنٹہ تک صرف اس نکتہ پر غور کرتے رہتے ہیں کہ پانی کا پہلا قطرہ اپنے جسم پر کب ڈالا جائے اور جب بالآخر پانی کا پہلا قطرہ خود ہمارے ہی ہاتھوں سے ہمارے جسم پر گر جاتا ہے تو غسل خانہ میں ہم خود اپنی ہی چیخ و پکار سے گھبرا جاتے ہیں۔ آپ ہی بتائیے کیا یہ ساری حرکتیں ہمارے فلسفی ہونے کی دلیل نہیں ہیں۔ ہم تو کہتے ہیں کہ سردی کا موسم بڑا فلسفیانہ موسم ہوتا ہے۔ اس میں آدمی غور زیادہ اور کام کم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے سارے بڑے فلسفی سرد ممالک میں پیدا ہوئے۔

سردی کے موسم میں ہر آدمی اپنا کچھ نہ کچھ نقصان ضرور برداشت کرتا ہے لیکن تاجر اس موسم میں بھی اپنا کوئی نقصان برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ پرسوں کی بات ہے کہ ہم نے ایک ترکاری فروش سے ایک نارنگی دینے کو کہا۔ اس پر اس نے ایک لیموں اُٹھا کر ہمارے ہاتھ میں تھما دیا۔ ہم نے لیموں کو نارنگی تسلیم کرنے سے انکار کیا تو ترکاری فروش نے کہا ''حضور دیکھئے تو سہی کتنی سردی پڑ رہی ہے۔ آپ جسے لیموں سمجھ رہے ہیں وہ اصل میں نارنگی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ یہ نارنگی سردی سے ٹھٹھر کر لیموں کی جسامت تک پہنچ گئی۔'' ظاہر ہے کہ اس وقت ہماری عقل بھی سردی سے ٹھٹھر گئی تھی۔ لہٰذا نارنگی کے دھوکہ میں لیموں اُٹھا کر گھر لے آئے۔ بعد میں ہمیں محسوس ہوا کہ نارنگی کا ذائقہ تک ٹھٹھر کر لیموں کا ذائقہ بن گیا ہے۔

ہم اپنے ذاتی تجربہ کی بناء پر کہہ سکتے ہیں کہ مہینہ کی ابتدائی تاریخوں میں سردی بہت کم پڑتی ہے۔ لیکن جب مہینہ کی آخری تاریخیں آجاتی ہیں اور تنخواہ کے خاتمہ کے بعد قرض لینے کی نوبت آتی ہے تو ہمیں بڑی کڑاکے کی سردی محسوس ہوتی ہے۔ ہم چوبیسوں گھنٹے سردی کے مارے کانپتے رہتے ہیں۔ ہم نے سردی کے ذریعہ امیر اور غریب کے فرق کو جانچنے کا پیمانہ بنا رکھا ہے۔ اگر کوئی شخص سردی کے مارے بُری طرح کانپ رہا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس بیچارے کی جیب خالی ہے اور یہ کہ اس کی اُمیدوں پر اوس گر رہی ہے۔ اگر کسی شخص پر

سردی کا اثر بالکل نہ ہو تو سمجھ لیجئے کہ اس کی جیب نہ صرف گرم ہے بلکہ اس کا بینک بیلنس بھی موجود ہے۔

کسی اعرابی سے ایک شخص نے پوچھا تھا کہ "تمہارے ملک میں لوگ سردی کا موسم کس طرح گزارتے ہیں؟۔" جواب میں اعرابی نے کہا تھا "امیر لوگ کمبل اوڑھ کر اور غریب لوگ دانت بجا کر۔" ہمارا شماران لوگوں میں ہوتا ہے جو ہونٹ بجا کر سردی کا موسم گزارتے ہیں۔ ایک زمانہ تھا جب ہمارے منہ میں دانت تھے جو سردی کے موسم میں بجا کرتے تھے۔ لیکن اب تو یہ دانت بھی نہیں رہے اور ہم نہیں چاہتے کہ سردی میں اپنے مصنوعی دانتوں کو بجا بجا کر خراب کریں۔ لہٰذا اب ہم ہونٹ پیس کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

سردی کی گرما گرمی شروع ہوتی ہے تو آدمی ٹیلیگرام کی زبان میں بات کرتا ہے یعنی مختصر ترین گفتگو فرماتا ہے اور جملوں میں مصدر کا استعمال نہیں کرتا بلکہ اکثر صورتوں میں اسے یہ بھی یاد نہیں رہتا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مثلاً ہمارے ایک دوست نے ایک دن سردی کی شدت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس طرح کیا تھا: "بھئی آج سردی بہت زیادہ گرمی پر ہے۔ اتنی گرما گرم سردی تو میں نے آج تک محسوس نہیں کی۔" یہ کہتے ہوئے وہ بغلوں میں ہاتھ داب کر مفلر میں ملفوف ہو گئے اور ہم سردی کی گرما گرمی کے مارے بید مجنوں کی طرح لرزنے لگے۔

(قصہ مختصر۔ ۱۹۷۲)

چہل قدمی اور ہم

جو آدمی اُنتالیس برس تین سو چونسٹھ دن تک مسلسل زندہ رہے اس کے بارے میں یہ پیشین گوئی بڑی آسانی کے ساتھ کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن چالیس برس کا ہو جائے گا۔ سو ہمارے بارے میں بھی یہ پیشین گوئی دُرست ثابت ہوئی اور ایک دن ہم اچانک چالیس برس کے ہو گئے۔ جی ہی جی میں بہت خوش ہوئے کہ زندگی کے چالیس برس بیت گئے اور اب وہ زمانہ آیا ہے جب ہمیں زندہ رہنے کی ''مشق'' اور ''مہارت'' حاصل ہو گئی ہے اور یہ کہ اس مشق کے سہارے اگلی زندگی بڑے آرام کے ساتھ گذاری جاسکتی ہے۔ کیوں کہ آدمی کی زندگی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ چالیس برس سے پہلے ہی ہو جاتا ہے۔ بعد میں تو آدمی اپنی پچھلی زندگی کا ''آموختہ'' کرنے میں مصروف رہتا ہے۔ دن بھر بڑے خوش رہے کہ اب زندگی کے سارے ہنگامے، سارے معرکے تمام ہوئے۔ اب تو بس چین کی بنسی بجانا ہے۔ رات اچھے خاصے سو گئے لیکن صبح جو اُٹھے تو اچانک ہمارے سر میں دھماکے ہونے لگے۔ بھاگے بھاگے ڈاکٹر کے پاس گئے۔ ڈاکٹر نے تفصیلی معائنے کے بہانے ہمیں لفافے کی طرح خوب اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر پوچھا ''آپ کی عمر کیا ہے؟''

ہم نے خوشی خوشی کہہ دیا ''کل ہی چالیس برس کا ہوا ہوں۔''

ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ ڈاکٹروں کو چالیس کے ہندسے سے کچھ الرجی سی ہوتی ہے۔ ہماری عمر جانتے ہی اُنہوں نے اپنے کان کھڑے کیے اور کہا ___ ''کیا کہا! آپ

چالیس برس کے ہو گئے!! یہ تو بہت بُری بات ہے۔"

ہم نے کہا ــــ "ڈاکٹر صاحب! جو آدمی اُنتالیس برس تین سو چونسٹھ دن تک زندہ رہے، اُسے چالیس برس کا تو ہونا ہی ہے۔ اس میں بُری بات کیا ہے۔"

بولے ــــ "یہی تو وہ عمر ہوتی ہے جہاں سے آدمی "نصف اِدھر" اور "نصف اُدھر" ہو جاتا ہے۔ جھٹپٹے کا یہی وقت آدمی کی زندگی میں بڑا خطرناک ہوتا ہے۔ اچھا لائیے۔ پہلے میری فیس کے چالیس روپے نکالیے۔"

ہم نے کہا ــــ "چالیس روپے! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ کی فیس تو ہمیشہ سے پندرہ روپے رہی ہے۔ یہ چالیس روپے کس خوشی میں لے رہے ہیں؟"

بولے ــــ "آپ تو جانتے ہی ہیں کہ جب موٹر کار کا ماڈل پُرانا ہو جاتا ہے تو اس کی مرمّت کی فیس زیادہ لی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر اُنہوں نے ہماری توند کی طرف اشارہ کیا اور کہا: "یہ جو آپ آپے میں سمانہیں رہے ہیں، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کی روح اس قفسِ عنصری کو توڑ کر پیٹ کے راستے سے باہر آنے کے لیے بے چین ہے۔ یہ بڑی خطرناک منزل ہے۔ اس لیے آپ اپنے پیٹ پر قابو رکھیئے ورنہ

سب ٹھاٹ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارا

ڈاکٹر صاحب نے اُردو شاعری کی مدد سے ہمیں خوف زدہ کرنے کی بڑی کامیاب کوشش کی۔ ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا ــــ "مگر ڈاکٹر صاحب! توند تو خوش حالی کی علامت ہے۔"

بولے ــــ "اسی علامت کی وجہ سے تو چالیس روپے بطورِ فیس لے رہا ہوں۔"

پھر اپنے سیدھے ہاتھ کی دو اُنگلیاں ہمارے پیٹ میں دھنساتے ہوئے بولے: "قبلہ! آدمی کی زندگی میں وہ منزل بھی آتی ہے جب آدمی غائب ہو جاتا ہے اور توند ہی توند باقی رہ جاتی ہے۔ آخر میں توند بھی مر جاتی ہے اور لوگ غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ آدمی مرا ہے۔ جنابِ من! اسی لئے پہلے اپنی توند کو ذرا چھانٹیے اور توند کو چھانٹنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ہر روز صبح کھانے سے پہلے اور رات میں کھانے کے بعد چہل قدمی کیجیے۔"

ہم نے دوسرے ہی دن سے چہل قدمی کرنے کا مصمّم ارادہ کر لیا۔ اس کے لیے

سب سے پہلے ہم نے ڈکشنری کھول کر اس میں ''چہل قدمی'' کے لغوی معنی تلاش کیے۔ یہ ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ''چہل قدمی'' دراصل ایک عصری اصطلاح ہے۔ یہ لفظ انسان کی تہذیب و تمدّن کی ترقی کی پیداوار ہے۔ قدیم انسان پیدل چلتا تھا تو وہ اپنے قدموں کا حساب نہیں رکھتا تھا بلکہ بے دریغ چلتا تھا۔ یوں چالیس قدم چل کر ریاضی کے چکّر میں نہیں پڑتا تھا۔ چہل قدمی کی ضرورت تو اس وقت پیش آئی جب انسان نے اپنی سہولت کی خاطر سواریاں اور کرسیاں ایجاد کیں اور پیدل چلنے کو اپنے اُوپر حرام کرلیا۔ تہذیب و تمدّن کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسان کے جسم میں چربی بھی ترقی کرتی رہی اور بہت بعد میں ڈاکٹروں کو پتہ چلا کہ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ انسان پیدل نہیں چلتا۔ لہٰذا اب انسان طبی مشورے کی بنا پر پیدل چلتا ہے اور اس نے ''چہل قدمی'' کو ایک آرٹ بنالیا ہے۔

ہم نے جب چہل قدمی کے میدان میں قدم رکھا تو دیکھا کہ یہاں ایک سے بڑا ایک چہل قدمی کرنے والا موجود ہے، جو چہل قدمی کم کرتا ہے اور اپنے چلنے کے فن کا مظاہرہ زیادہ کرتا ہے۔ مثلاً ایک صاحب ہیں جو خود تو کم چہل قدمی کرتے ہیں لیکن اُن کی چھڑی زیادہ چہل قدمی کرتی ہے۔ وہ ہر قدم کے بعد اپنی چھڑی کو فضا میں لہرا کر زمین پر ٹیکتے ہیں، پھر اپنا سارا بوجھ اس کمزور اور نحیف چھڑی پر ڈال کر اپنے ایک پاؤں کو اُٹھا کر آگے رکھتے ہیں اس کے بعد چھڑی پھر فضا میں لہراتی ہے اور دوسرے پاؤں کو آگے بڑھنے کا موقعہ عنایت کیا جاتا ہے۔ ہمیں جب بھی یہ پتہ چلانا ہوتا ہے کہ انہوں نے کس راستے سے نکل کر کس راستے چہل قدمی کی ہے تو ہم اُن کے قدموں کے نشان نہیں بلکہ اُن کی چھڑی کے قدموں کے نشان تلاش کرتے ہیں۔ اس طرح چہل قدمی کرنے کا ایک فائدہ یہ ہوتا ہے کہ چلنے والے کے پاؤں کو ذرا بھی زحمت نہیں اُٹھانی پڑتی۔ البتہ ہر دوسرے تیسرے مہینے ایک چھڑی ضرور ٹوٹ جاتی ہے۔

ہم جب علی الصبح چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں تو ہمیں ایک اور صاحب اکثر ملتے ہیں جو اپنے کُتے کے پیچھے پیچھے چہل قدمی کرتے ہیں۔ بلکہ یوں کہئے کہ کُتا اُنہیں کھینچ کر لے جاتا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہ پتہ چلانا مشکل ہوجاتا ہے کہ یہ کتے کے مالک ہیں یا کُتا اُن کا مالک ہے۔ کیوں کہ ہم نے ہمیشہ ہی کُتے کو اُن سے آگے چلتے ہوئے دیکھا ہے۔ اُن کا کام صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ کُتے کے گلے میں بندھی ہوئی زنجیر کو مضبوطی سے پکڑ لیں اور جدھر

جدھر کُتا چہل قدمی کرے وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے دُم ہلاتے ہوئے چہل قدمی کرتے چلیں۔ مگر ہم اسے چہل قدمی کا نام نہیں دے سکتے۔ کیوں کہ کُتے کے پیچھے گھسٹتے ہوئے جانے کو بھلا چہل قدمی کیوں کر کہا جا سکتا ہے۔

ہم نے ایک دن اُنھیں سمجھایا کہ قبلہ! یہ جو آپ اپنے سے زیادہ طاقت ور کُتے کے ساتھ چہل قدمی کرنے نکلتے ہیں تو یہ مناسب بات نہیں ہے، کیوں کہ اس سارے عمل میں چہل قدمی کے طبی فوائد سے کُتا فائدہ اُٹھاتا ہے اور آپ صرف منہ دیکھتے اور دُم ہلاتے رہ جاتے ہیں۔ اگر کُتے کے ساتھ چہل قدمی کرنا اتنا ہی ضروری ہے تو کیا یہ ممکن نہیں کہ آپ کوئی ''جیبی کُتا'' پال لیں۔''

بولے __ ''صاحب! میں چہل قدمی ہی اس لیے کرتا ہوں کہ یہ کُتا مجھے کھینچ کر لے چلتا ہے ورنہ میں تو اپنے آپ چلنے کی عادت تقریباً بھول چکا ہوں۔''

اور اِدھر کئی دن سے ہم دیکھ رہے ہیں کہ اُن کی صحت تو دن بہ دن گرتی جا رہی ہے البتہ اُن کا کُتا کافی تندرست اور توانا ہوتا جا رہا ہے۔

ایک اور صاحب کی چہل قدمی کا انداز بالکل نرالا ہے۔ وہ پارک میں ایک مخصوص جگہ پر پہنچ کر بیس فِٹ کے طول میں اِدھر سے اُدھر چہل قدمی کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یوں تو پارک بڑا وسیع ہے مگر یہ بیس فِٹ کی طوالت سے آگے نہیں جانا چاہتے۔ آدھے منٹ میں وہ بیس فٹ کا فاصلہ طے کر کے پھر اسی راستے سے واپس آتے ہیں اور پھر دوسرے سرے پر پہنچ کر اُلٹے پاؤں واپس ہو جاتے ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ چہل قدمی نہ کر رہے ہوں بلکہ چلنے کا 'آموختہ' کر رہے ہوں۔ اس عمل سے اُن کی صحت پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں، یہ ہمیں نہیں معلوم، البتہ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ اُن کی اس چہل قدمی سے پارک کی صحت پر برا اثر پڑ رہا ہے کیوں کہ جس مخصوص جگہ پر یہ چہل قدمی کرنے کے عادی ہیں، وہاں اب کم از کم ایک فٹ گہری ''پگڈنڈی'' نمودار ہو گئی ہے۔ اگر ایک ہی جگہ اُن کی مخصوص چہل قدمی کچھ عرصہ اور جاری رہی تو ہمیں اندیشہ ہے کہ کہیں اس پگڈنڈی میں سے پانی کے جھرنے نہ نکل پڑیں۔

چہل قدمی امیر اور غریب دونوں کرتے ہیں۔ غریب جب چہل قدمی کرتا ہے تو اس سلسلے میں اپنے پیروں کی مدد لیتا ہے، البتہ امیر آدمی کی چہل قدمی ذرا مختلف ہوتی ہے۔

مثلاً ہمارے ایک لکھ پتی دوست جب چہل قدمی کے لئے نکلتے ہیں تو اُن کے پیچھے پیچھے اُن کی امپالا موٹر کار بھی چہل قدمی کرتی رہتی ہے، تاکہ جب بھی موٹر کار کا مالک چہل قدمی کرتے کرتے تھک جائے تو وہ موٹر میں سوار ہو جائے۔ ایک اور امیر آدمی ہیں جو چہل قدمی کے لیے نکلتے ہیں تو ایک نوکر چھتری پکڑے رہتا ہے۔ دُوسرا نوکر دودھ کا پیالہ ہاتھ میں لیے لیے ساتھ چلتا ہے اور تیسرا نوکر اُن کے آگے آگے چلتا ہے اور راستے میں پڑے ہوئے پتھروں کو ہٹاتا جاتا ہے تاکہ مالک کی چہل قدمی ٹھوکر سے ملوث نہ ہونے پائے۔

یوں بھی بڑے لوگوں کی چہل قدمی کی شان ہی الگ ہوتی ہے۔ ہم ایک محکمے کے ڈائریکٹر سے واقف ہیں جنہیں ڈاکٹر نے مشورہ دیا کہ وہ دفتر میں کام کرنے کے علاوہ صبح صبح چہل قدمی بھی کیا کریں۔ ڈائریکٹر نے یہ چہل قدمی شروع کی تو رفتہ رفتہ اُن کے اسٹاف کو بھی اس کی خبر ہوگئی۔ دوسرے ہی دن سے محکمہ کے ڈپٹی ڈائریکٹر بھی اس جگہ پر چہل قدمی کے لیے آنے لگے جہاں ڈائریکٹر کی چہل قدمی ہوتی تھی۔ جب اسسٹنٹ ڈائریکٹروں کو اس چہل قدمی کا پتہ چلا تو وہ بھی اس چہل قدمی میں شامل ہوگئے۔ نوبت یہاں تک آگئی کہ بعد میں غرض منداصحاب بھی اس مقام پر چہل قدمی کے لئے آنے لگے۔ کوئی سفارش کے بہانے آرہا ہے، کوئی دفتر میں تقرر کے بہانے آرہا ہے، کوئی پرموشن چاہتا ہے، کوئی ڈائریکٹر سے مراسم بڑھانے کے لیے آرہا ہے۔ دفتر کے بعض ملازمین ایسے بھی تھے جو ڈائریکٹر کے گھر سے پندرہ میل کی دُوری پر رہتے تھے لیکن چہل قدمی کے لیے وہ علی الصباح ڈائریکٹر کے گھر کے سامنے پہنچ جاتے تھے۔ بعد میں اس چہل قدمی میں اتنی 'دفتریت' آگئی کہ ڈائریکٹر نے تنگ آکر چہل قدمی کا ارادہ ہی ترک کر دیا کیوں کہ وہ چہل قدمی کے دوران دفتر کا کام زیادہ اور چہل قدمی کم کرنے لگے تھے۔ ہمارے ایک اور دوست ہیں جو ہر دم چہل قدمی کے لغوی معنی کو جھٹلانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ وہ جدھر کو منہ اُٹھ جائے اُدھر ہی کو چہل قدمی کرنے کے عادی ہیں۔ وہ چہل قدمی کو "منزل" کے تابع کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ آدمی کو بس چلتے رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب یہ گھر سے چہل قدمی کے لیے نکلتے ہیں تو گھر کے افراد اُنہیں یوں رقت کے ساتھ وداع کرتے ہیں جیسے وہ کسی لمبے سفر پر جارہے ہوں۔ دو ایک بار تو ہم نے اُن کے بازو پر امام ضامن بھی بندھے ہوئے دیکھے۔ ہم نے سنا ہے کہ ایک

بار یہ چہل قدمی کرنے کے لئے نکلے تو بس چہل قدمی ہی کرتے رہے۔ دس پندرہ میل دُور جانے کے بعد اُنہیں پتہ چلا کہ وہ اپنے شہر کی حدود سے نکل کر کسی دُوسرے شہر کی حدود میں داخل ہو گئے ہیں۔ تب انہیں اچانک اپنی "غریب الوطنی" کا احساس ہوا۔ سوچا کہ بس میں بیٹھ کر اپنے شہر کو واپس ہوں مگر جیب میں ہاتھ ڈالا تو پتہ چلا کہ وہاں بس کا کرایہ موجود نہ تھا۔ یوں بھی آدمی جب چہل قدمی پر نکلتا ہے تو اپنی جیب میں پیسے نہیں رکھتا۔ چار و ناچار پیدل ہی اپنے شہر کی طرف واپس ہوئے اور شام ہوتے ہوتے اپنے گھر میں کچھ اس انداز سے پہنچے کہ اُن کے قدم مسلسل لڑکھڑا رہے تھے۔ اس کے بعد سے اُنہوں نے یہ معمول سا بنا لیا ہے کہ جب بھی چہل قدمی کے لیے نکلتے ہیں اپنی جیب میں بس کا کم از کم پچاس میل کا کرایہ ضرور رکھتے ہیں تاکہ چہل قدمی سے واپسی میں آسانی ہو۔

سچ تو یہ ہے کہ آدمی سماجی جانور ہے۔ اُسے ہمیشہ کسی نہ کسی ساتھی کی ضرورت ہوتی ہے جس کے ساتھ وہ دنیا بھر کے مسائل پر تبادلۂ خیال کرے۔ لہٰذا جب آپ چہل قدمی کا ارادہ کرتے ہیں تو چند دنوں تک تو پابندی سے چہل قدمی کرتے ہیں لیکن بعد میں آپ کا تعارف خود بخود چہل قدمی کرنے والے دیگر افراد سے بھی ہوتا جاتا ہے۔ پھر یہ صورتِ حال نمودار ہوتی ہے کہ پانچ دس چہل قدمی کرنے والے ایک جگہ مل کر "حالاتِ حاضرہ" پر تبادلۂ خیال کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ یہیں سے آپ کو تیل کی رائج الوقت قیمت، مختلف سبزیوں کے تازہ ترین بھاؤ، جنوب مشرقی ایشیا کی سیاسی صورتِ حال اور تیل کے بحران وغیرہ کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات حاصل ہوتی ہیں۔ ہم اِدھر ایک برس سے بڑی پابندی کے ساتھ چہل قدمی کے لیے جاتے ہیں۔ ہمیں یہ پتہ نہیں کہ اس سے ہماری صحت پر کیا اثر پڑا ہے۔ لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ایک سال پہلے کے مقابلے میں اب ہماری معلوماتِ عامہ کافی بہتر ہو گئی ہیں اور اب تو ہم نے اخبار خریدنا اور پڑھنا بھی ترک کر دیا ہے۔

(الغرض۔ ۱۹۸۷)

کتّو! انسانوں سے خبردار رہو

پچھلے ہفتہ ہم جیسے ہی حیدرآباد سے واپس ہوئے وہاں سے فرقہ وارانہ فسادات کی اطلاعات آنے لگیں۔ ہم نے سوچا تھا ان فسادات کے بارے میں بھی کچھ لکھیں گے لیکن یہ سوچ کر خاموش ہوگئے کہ ہم نے تیس برس پہلے فرقہ وارانہ فسادات کے بارے میں پورا ایک مضمون ''سند باد جہازی کا سفرنامہ'' کے عنوان سے لکھا تھا۔ جب لوگوں نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا، بلکہ بہتوں نے تو اسے پڑھا بھی نہیں، تو اب کیا لیں گے۔ یوں بھی پچھلے تیس برسوں میں اس ملک میں فسادات نے بڑی ترقی کرلی ہے۔ اب تو یہ ہماری روزمرہ زندگی کا معمول سا بن گئے ہیں۔ بعض لوگ تو ان فسادات کو ''گھریلو صنعت'' کا درجہ بھی دینے لگے ہیں۔ کوئی کام روزمرہ میں شامل ہوجائے تو اس میں کسی کو کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ لیکن ان فسادات کے فوری بعد ہمیں حیدرآباد سے ایک ایسی دل خراش اور ہیبتناک اطلاع ملی ہے کہ یقین مانئے ہم سے کھانا تک کھایا نہیں جارہا ہے۔ ہم یہاں دوپہر کے کھانے کی بات کررہے ہیں کیوں کہ اس اطلاع کے ملنے سے پہلے ہی ہم خدا کے فضل سے صبح کا ناشتہ کرچکے تھے۔ اب رات کے کھانے کا کیا ہوگا اس کے بارے میں ہم ابھی سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ پتہ چلا ہے کہ پچھلے دنوں حیدرآباد میں بیس پچیس آوارہ کتوں نے مل کر ایک معصوم بچی کو ہلاک کیا۔ پھر اس کا سارا گوشت نوچ نوچ کر کھا گئے۔ جب سے ہم نے یہ خبر پڑھی ہے تب سے ''انسانیت'' پر سے ہمارا اعتماد اُٹھ گیا ہے۔ ہم نے خواب میں بھی نہ سوچا تھا کہ کتے یوں انسانیت کی سطح سے نیچے گر جائیں گے۔ ہمیں کتوں سے بالکل یہ اُمید نہیں تھی کہ وہ ایسی غیر انسانی حرکت کے مرتکب

ہوں گے۔ سچ پوچھئے تو جب سے انسان انسانیت سے دستبردار ہوا ہے تب سے ہم کتوں میں
بھی کبھی انسانیت کو دیکھ دیکھ کر مطمئن ہو جایا کرتے تھے کہ۔ ع

ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

مانا کہ زمانہ ما قبل تاریخ میں انسان جب جنگلوں میں رہتا تھا تو کتا بھی وہیں رہتا تھا لیکن بعد میں یہ انسان کے نقش قدم پر چل کر جنگل سے نکل آیا اور انسانی بستیوں میں رہنے لگا۔ انسانی عادات واطوار سیکھے اور بعض معاملات میں تو انسان سے بھی آگے نکل گیا۔ بھلے ہی وفاداری اور سمجھداری کے معاملہ میں انسان کبھی کتوں سے آگے رہا ہو لیکن کیا مجال جو آج کا انسان اس معاملہ میں کتوں سے آگے نکل جائے۔ اب تو وفاداری پر صرف کتوں کی اجارہ داری قائم ہو گئی ہے۔ ہم نے زندگی میں صرف ایک بار ہی کتا پالا تھا اور وہ بھی اس وقت پالا تھا جب ہمیں کتے کی بالکل ضرورت نہیں تھی۔ ان دنوں ہمارے گھر میں کچھ تھا ہی نہیں جس کی یہ کتا حفاظت کر سکتا۔ ایک دن ہم کہیں چلے جا رہے تھے کہ راستے میں کتے کا ایک لاوارث پلّہ نظر آیا جس کی آنکھیں بھی ابھی پوری طرح کھلنے نہیں پائی تھیں اور وہ سڑک پر دیوانہ وار دوڑ رہا تھا۔ ہم نے یہ سوچ کر کہ کہیں کسی بیل گاڑی یا تانگے کے نیچے نہ آجائے اسے اٹھا کر گلی میں ایک محفوظ جگہ پر رکھ دیا۔ کچھ دُور چلنے کے بعد دیکھا کہ یہ تو ہمارے ہی پیچھے پیچھے چلا آرہا ہے۔ چاروناچار ہم اس بے یارومددگار کتے کے پلّے کو اپنے گھر میں رکھنے پر مجبور ہو گئے۔ جو روکھی سوکھی ہم کھاتے تھے وہی اسے بھی کھلاتے تھے۔ مگر چند دن بعد جب یہ بڑا ہوا تو احساس ہوا کہ یہ تو آلسیشن کتا ہے۔ پھر کچھ ہی دنوں میں اُس کی شخصیت ہماری شخصیت سے کہیں زیادہ نِکھر آئی۔ مگر چونکہ ہماری صحبت میں رہتا تھا اِس لیے عادات واطوار کے معاملہ میں بالکل ہم پر گیا تھا۔ بھونکتا بالکل نہیں تھا۔ بات بات پر دم ہلا دیتا تھا۔ گھر کے کسی بھی کونے میں ایک بے نیاز مرد قلندر کی طرح پڑا رہتا تھا۔ ایک دن ہم گھر واپس ہوئے تو ہماری بیوی نے ہنستے ہوئے کہا ''اجی، یہ کتا تو بالکل آپ کی ٹرو کاپی ہے (True Copy) ہے۔'' ہم نے پوچھا ''وہ کس طرح؟'' بولیں ''آپ تو جانتے ہیں کہ اسے بھونکنا نہیں آتا۔ بالکل گونگا سا کتا ہے لیکن سمجھدار اتنا ہے کہ سامنے جب بھی کوئی چور اُچکا یا اوباش قسم کا آدمی گزرتا ہے تو فوراً اُس کی اطلاع دے دیتا ہے۔''

ہم نے پوچھا "وہ کیسے؟" بولیں "فوراً دیوانہ وار بھاگ کر میرے پاس آجاتا ہے اور ڈر کے مارے میرے پیچھے چھپ جاتا ہے۔ اس کے خوف سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ باہر کوئی مشکوک قسم کا کردار سڑک پر گزر رہا ہے۔"

اس انکشاف کے بعد ہمیں اس کتے پر پیار سا آگیا۔ اس کی طرف دیکھا تو یوں لگا جیسے آئینہ میں ہم اپنے آپ کو دیکھ رہے ہوں۔ اب ہم اپنے منہ سے اپنی ہی کتنی تعریف کریں، ایسا شریف النفس، حلیم الطبع، منہ مرا، کم گو اور با اخلاق کتا کم از کم آلسیشن نسل کے کتوں میں تو کوئی پیدا نہ ہوا ہوگا۔ یہ سب ہماری صحبت کا فیض جاریہ تھا۔ اگرچہ ہمارے بعض دوست اس کتے پر فقرے بھی کستے تھے کہ "میاں! تمہارا کتا تو بالکل گدھا ہے۔" اور ہماری اعلیٰ ظرفی دیکھئے کہ ہم ان فقروں کو چپ چاپ برداشت کر لیتے تھے۔ کیوں کہ ہم جانتے تھے کہ یہ فقرے کتے کے لئے نہیں بلکہ ہمارے لئے استعمال کئے جا رہے ہیں۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کتا انسان سے ہی سب کچھ سیکھتا ہے۔ عمر کے آخری حصہ میں اسے غالباً یہ احساس ہو گیا تھا کہ اُس نے ہم سے تو بہت سیکھ لیا ہے لیکن ہماری بیوی سے کچھ نہیں سیکھا۔ لہٰذا اس نے ہماری بیوی کی ایک عادت ضرور سیکھ لی تھی۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب ایک رات ہم دیر سے گھر واپس ہوئے اور ہماری بیوی نے ہم پر برسنا شروع کر دیا تو کتا بھی ہماری بیوی کے برابر بیٹھا لگاتار غرّاتا رہا۔ بعد میں غرّانے کے معاملہ میں وہ خود مکتفی ہو گیا تھا۔ بعض اوقات تو یونہی ہمیں دیکھ کر غرّاتا رہتا تھا۔ ہم نے بیوی سے تنہائی میں کہا کہ خدا کے لئے وہ ہم پر کتے کے سامنے برسنا بند کر دیں کیوں کہ اس سے کتے کے اخلاق پر بُرا اثر پڑ رہا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کتا جو کچھ بھی سیکھتا ہے وہ انسان سے ہی سیکھتا ہے۔ اگرچہ بعد میں انسان پہلے سے سیکھی ہوئی باتیں اکثر بھول جاتا ہے لیکن کتا نہیں بھولتا۔

صدیوں پہلے کتے نے انسان سے وفاداری سیکھی تھی۔ انسان تو وفاداری سے کب کا کنارہ کش ہو گیا لیکن کتے نے وفاداری کے جذبہ کو اب تک اپنے سینہ سے لگائے رکھا ہے۔ ہمیں اس وقت ٹوکیو کا وہ ریلوے اسٹیشن یاد آگیا جس کے سامنے ایک کتے کا مجسمہ نصب ہے۔ اس اسٹیشن کا نام بھی اس کتے کے نام پر رکھا گیا ہے۔ اس کتے کی کہانی یہ ہے کہ اس کا مالک جب بھی کام پر جانے کے لئے اسٹیشن آتا تو کتا بھی اس کے ساتھ آتا تھا۔ مالک تو ٹرین

میں بیٹھ کر چلا جاتا تھا لیکن شام میں یہ کتا اپنے مالک کی واپسی کے وقت پھر اسٹیشن آ کر اس کا انتظار کرنے لگ جاتا تھا۔ مالک واپس آتا تو اسی کے ساتھ گھر واپس ہوتا تھا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ ایک بار اس کا مالک ٹرین میں گیا تو یوں گیا کہ پھر کبھی واپس نہ ہوا۔ کسی ٹریفک حادثہ میں اس کی موت ہوگئی۔ مگر اس کے مرنے کے دو سال بعد تک یہ کتا لگاتار اسٹیشن کے سامنے اپنے مالک کی واپسی کا انتظار کرتا رہا اور اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ بعد میں یہ خود بھی وہاں چلا گیا جہاں اس کا مالک گیا تھا۔

ہم تو ایسے ہی شریف کتوں کے بارے میں جانتے ہیں جن کا وجود انسانیت سے لبریز ہوتا ہے۔ اب یہ جو حیدر آباد سے چند آوارہ کتوں کی غیر انسانی حرکت کی اطلاع آئی ہے تو ہم انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہوتے جا رہے ہیں۔ مانا کہ بعض کتے شریر بھی ہوتے ہیں، بھونکتے بھی ہیں بلکہ پطرس بخاری کے لفظوں میں ''مشاعرے'' بھی منعقد کرتے ہیں۔ لیکن ایسی انسانیت سوز حرکت نہیں کرتے۔ ہاں خوب یاد آیا۔ بہت دنوں کی بات ہے۔ ہم ایک دوست سے ملنے کے لئے ان کے گھر گئے تو اُن کے کتے نے صحن سے بے تحاشہ بھونکنا شروع کر دیا۔ ہم نے اپنے دوست کو پکارا تو انہوں نے ڈرائنگ رُوم کی کھڑکی کھول کر ہم سے کہا اندر آجایئے۔ یہ کچھ بھی نہیں کرے گا۔ ہم نے کہا ذرا دیکھئے تو سہی کہ کیسی خطرناک آواز میں بھونک رہا ہے۔ بولے'' آپ کو تو وہ کہاوت معلوم ہے کہ بھونکنے والے کتے کاٹتے نہیں۔ پھر اس میں ڈر کیسا؟'' ہم نے ڈرتے ڈرتے کہا'' بھیّا۔ مجھے تو یہ کہاوت معلوم ہے لیکن یہ کہاوت اگر آپ کے کتے کو معلوم نہ ہو تو میرا کیا ہوگا۔'' ہمارے دوست نے کھڑے کھڑے جواب دیا۔'' میاں اطمینان رکھو۔ میرا کتا تم سے زیادہ پڑھا لکھا اور سمجھدار ہے۔ صرف ڈگری رکھنے سے کوئی تعلیم یافتہ نہیں ہو جاتا۔''

اور اس دن ہم کتے کے لگاتار بھونکنے کے باوجود ہمت کر کے اپنے دوست کے ڈرائنگ رُوم میں چلے گئے تھے اور ہمیں پہلی بار پتہ چلا کہ کتے بھی اس کہاوت سے بخوبی واقف ہیں۔

آج ہمیں مندرجہ بالا کتوں کی یاد اس لئے آگئی کہ یہ سب کے سب شرافت، وفاداری، انسانیت، خودداری اور علم کے زیور سے آراستہ تھے، حیدر آباد کے کتوں کو نہ جانے کیا

ہوگیا کہ اُنہوں نے اچانک انسانیت کا لبادہ اُتار پھینکا۔ یہ سب آج کے انسانوں کی صحبت میں رہنے کا نتیجہ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اگر حیدرآباد میں فسادات نہ ہوتے تو کتّوں کو کبھی پتہ نہ چلتا کہ ایک معصوم بچی کو بلاوجہ اس طرح چیرا اور پھاڑا جا سکتا ہے۔ انسانوں کو تو ہم اب کچھ کہنے سے رہے۔ ہماری سنتا بھی کون ہے؟۔ لہٰذا کتّوں سے ہماری گزارش ہے کہ وہ انسانیت کے دامن کو ہاتھ سے جانے نہ دیں۔ ہماری صدیوں پرانی تہذیب کے اب وہ اکیلے امین رہ گئے ہیں۔ اگرچہ انسان اب شہروں میں رہ کر، صدیوں پہلے جنگل میں رہنے والے قدیم وحشی انسان کی سی حرکتیں کرنے لگا ہے۔ لیکن کتّوں کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ شہروں میں رہ کر وحشی انسان کی سی حرکت کریں۔ کتّوں کو ہم صدق دل سے آگاہ کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انسانوں سے خبردار رہیں۔ اور اپنے اسلاف کے کارناموں کو فراموش نہ کریں۔

(میرا کالم۔۱۹۹۹)

شاپنگ یا نادر شاہ کا حملہ

پچھلے دنوں حیدر آباد کی ایک فیملی دہلی کی ''سیر و سیاحت'' کے ارادہ سے آئی تھی۔ ان اصحاب کا معلنہ ارادہ چونکہ تاریخی مقامات کی سیر کرنے کا تھا اسی لئے ہم نے اپنے حساب سے تاریخی مقامات کی سیر کا ایک پروگرام ذہن میں بنالیا تھا۔ لیکن جب یہ فیملی دہلی پہنچی تو احساس ہوا کہ تاریخی مقامات کی سیر کا ارادہ تو اصل میں کسی سیاسی جماعت کے انتخابی منشور کی طرح تھا کہ منشور میں باتیں تو بہت سی کی جاتی ہیں لیکن اُن پر عمل نہیں کیا جاتا۔ یہ فیملی صبح میں دہلی پہنچی تھی اور جب ہم نے دو پہر میں اُن سے ملنے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمیں دہلی کے ایک شاپنگ سینٹر کا حوالہ دیا گیا کہ ہم فلاں دکان میں پہنچیں، وہیں ملاقات ہوگی۔ ہم وہاں پہنچے تو دیکھا کہ صدر خاندان اپنے ارکان خاندان کے ساتھ ''شاپنگ'' میں مصروف ہیں۔ پتہ چلا کہ خاصا سامان خرید لیا گیا ہے اور اس سامان کو حیدر آباد روانہ کرنے کے لئے ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کی خدمات بھی حاصل کرلی گئی ہیں۔ ہم نے کہا ''یہ بہت اچھا کیا کہ شاپنگ کا کام آپ لوگوں نے پہلے ہی کرلیا۔ اب اطمینان سے تاریخی مقامات کی سیر کی جاسکتی ہے۔'' پوچھا ''اچھا تو دہلی میں تاریخی مقامات بھی ہیں؟'' ہم نے کہا ''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ دہلی تو ہے ہی تاریخی شہر۔ یہاں لال قلعہ، قطب مینار، جنتر منتر اور نہ جانے کیا کیا ہے۔'' بولے ''اور یہ قرول باغ، چاندنی چوک، لاجپت نگر، پالیکا بازار اور سروجنی نگر وغیرہ کیا ہیں؟'' ہم نے کہا ''یہ تاریخی مقامات نہیں ہیں بلکہ یہ تو شاپنگ سینٹر ہیں۔'' بولے ''اگر یہ تاریخی مقامات

نہیں ہیں تو اب ہم انہیں بنائیں گے۔ پہلے ذرا ان کی سیر کرلیں۔ بعد میں لال قلعہ اور راشٹر پتی بھون وغیرہ کو دیکھ لیں گے۔ یوں بھی ہر یومِ آزادی کے موقع پر لال قلعہ تو ٹیلی ویژن پر پابندی سے دکھائی دیتا ہے۔ ہر یومِ جمہوریہ پر راشٹر پتی بھون کے بھی دیدار ہو جاتے ہیں۔ مانا کہ ٹیلی ویژن والے اپنی ''خبریں'' مسخ کر دیتے ہیں لیکن لال قلعہ اور راشٹر پتی بھون جیسی عمارتوں کو تو مسخ کرنے سے رہے۔'' اُن کی منطق چوں کہ مدلل تھی اسی لئے ہم نے لال قلعہ اور راشٹر پتی بھون کو منہا کر کے اُنہیں قطب مینار چلنے کا مشورہ دیا۔ بولے'' آپ نے قطب مینار کی خوب یاد دلائی۔ بھئی دہلی کے بازاروں میں چیزوں کی قیمتیں سچ مچ قطب مینار سے باتیں کرنے لگی ہیں۔ چیزوں کے داموں کے قطب مینار کو دیکھنے کے بعد اب قطب الدین ایبک کے بوسیدہ اور پرانے قطب مینار کو دیکھنے میں کیا لطف آئے گا۔'' ہمارے بے حد اصرار پر وہ قطب مینار کو دیکھنے چلے تو سہی لیکن دبی زبان سے یہ بھی کہا کہ'' آپ کہتے ہیں تو دیکھ لیتے ہیں لیکن جو چیزیں خریدی نہیں جا سکتیں انہیں دیکھنے کا کیا فائدہ؟۔'' قطب مینار کی سیر کے دوران بھی بجائے اس کے کہ وہ اس عمارت کی تعمیر کی تاریخ اور اس کی طرزِ تعمیر کی خوبیوں وغیرہ کے بارے میں کچھ پوچھتے، بار بار اس طرح کے سوالات کرتے رہے کہ ساڑیاں کس بازار میں اچھی مل جائیں گی۔ زیورات کہاں اچھے ملتے ہیں؟ شلوار قمیض کے لئے کون سا شاپنگ سنٹر مناسب رہے گا؟۔ صوفہ سیٹس اور فرنیچر کی خریداری کہاں کرنی چاہئے؟۔ ہمیں اپنی کم علمی پر رونا بھی آیا کہ دہلی میں رہتے ہوئے تقریباً پچیس برس بیت گئے لیکن ہمیں اُن کے آسان سوالات کے جواب معلوم نہیں تھے۔ تاہم اُن کے اس طرح کے سوالات پر ہمیں اپنا دورہ سعودی عرب یاد آ گیا۔ کچھ برس پہلے حمایت اللہ، طالب خوندمیری، مصطفٰے علی بیگ اور دیگر زندہ دلان حیدر آباد کے ہمراہ ہم عمرہ کی سعادت حاصل کرنے کے لئے خانہ کعبہ میں پہنچے تو جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے لئے صف بندی شروع ہوئی تو ایک صاحب ہمارے اور حمایت اللہ کے بیچ میں آ کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی نماز ختم ہوئی اور امام نے سلام پھیرا اُن صاحب نے دبی زبان میں ہم سے پوچھا'' قبلہ! یہاں سونے کا کیا بھاؤ ہے؟'' کوئی اور جگہ ہوتی تو ہم اُنہیں سونے کا غلط بھاؤ بھی بتا سکتے تھے۔ چونکہ جھوٹ بولنے کی گنجائش نہیں تھی اس لئے ہم نے کہا'' بھئی ہم کل رات ہی سعودی عرب آئے ہیں۔ ہمیں سونے کے بھاؤ کا کوئی پتہ نہیں

ہے۔'' ہم سے مایوس ہوکر یہ صاحب حمایت اللہ سے رجوع ہوئے اور اُن سے یہی سوال پوچھ لیا۔ اس پر حمایت اللہ نے کہا'' حضور! آپ عبادت گزاروں کی غلط صف میں آکر کھڑے ہوگئے ہیں۔ آپ کو کسی اور صف میں ہونا چاہئے تھا۔'' یہ سنتے ہی یہ صاحب ہمارے قیاس کے مطابق عبادت گزاروں کی ایک اور غلط صف میں جاکر شامل ہوگئے۔ یعنی طالب خوندمیری اور مصطفیٰ علی بیگ کے بیچ جاکر بیٹھ گئے۔ اور آپ حیرت کریں گے کہ مصطفیٰ علی بیگ نے نہ صرف اُنہیں اس سوال کا صحیح جواب بتادیا بلکہ اس بات پر اظہار خفگی بھی کیا کہ '' قبلہ! ایسے سوالات پوچھنے کی یہ جگہ نہیں ہے۔ مجھے دیکھئے کہ میں بھی کل رات ہی سعودی عرب آیا ہوں اور میں نے جدہ ایرپورٹ پر اُترتے ہی سونے کا بھاؤ پوچھ لیا تھا تاکہ اس جگہ ایسے دنیاوی سوالات پوچھنے کی ضرورت باقی نہ رہے۔''

بہر حال قطب مینار وہ واحد تاریخی جگہ تھی جسے اس فیملی نے جیسے تیسے دیکھ لیا اور اس کے بعد وہ جہاں بھی نظر آئے دہلی کے کسی نہ کسی شاپنگ سینٹر میں ہی نظر آئے۔ اُن سے ملاقات کا وقت بھی کچھ اس طرح طے ہوتا تھا کہ فلاں بازار کی فلاں دکان پر فلاں وقت تشریف لے آیئے۔ ایک دن طے ہوا کہ ہم لاجپت نگر میں کپڑوں کی ایک دوکان پر ملیں گے۔ ہمیں وہاں پہنچنے میں ذرا دیر ہوگئی تو دیکھا کہ دوکاندار بھری دوپہر میں چابیوں کا گچھا لئے دُکان کو بند کرنے کا اہتمام کررہا ہے۔ ہم نے پوچھا'' بھئی! یہاں ایک حیدرآبادی فیملی شاپنگ کے لئے آنے والی تھی۔ تم دُکان بند کروگے تو اُن سے ملاقات کیسے ہوگی؟۔'' دکاندار بولا'' حضور! آپ کو دکان کی حالت سے کیا یہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ یہ فیملی یہاں نہ صرف آچکی ہے بلکہ جا بھی چکی ہے۔ دکان کے خالی شوکیس اور ننگی الماریاں اس کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ اب یہاں کوئی چیز بکنے کے لئے نہیں رہ گئی ہے تو میں یہاں بیٹھ کر اپنا وقت کیوں برباد کروں اسی لئے دکان کو بند کررہا ہوں۔'' ہم دکاندار سے یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ ایک پریشان حال گاہک دکان کے اندر داخل ہوا اور دکاندار سے شکایت کرنے لگا'' بھئی! تجارت کرنے کے تمہارے یہ اُصول ہماری تو سمجھ میں نہیں آئے۔ باہر تو کپڑوں کی دکان کا بورڈ لگا رکھا ہے اور اندر آکر دیکھو تو پتہ چلتا ہے کہ فرنیچر کی دکان ہے۔ بھئی یہ بھی خوب رہی۔ اچھا یہ بتاؤ یہ شوکیس کتنے میں دے رہے ہو۔ اور ہاں وہ الماری کے دام بھی ساتھ میں بتادینا۔''

(بنیادی خیال کے لئے یوسفی کا شکریہ) دکان دار نے جیسے تیسے اس گاہک کو ڈانٹ کر بھگایا۔ پھر ہم سے کہنے لگا ’’حضور! ایسے ظالم خریدار میں نے کم ہی دیکھے ہیں جیسے آپ کے یہ حیدرآبادی دوست ہیں۔ شوکیس میں آپ کو یہ جو ننگ دھڑنگ مجسمے نظر آرہے ہیں ابھی کچھ دیر پہلے تک اُن کے جسم پر خوبصورت ساڑیاں اور شلوار قمیصیں تھیں۔ ظالموں نے اُن کو تک نہیں بخشا اور اُن کے بھی کپڑے اُتار کر لے گئے۔ اب ان مجسموں کی عریانی مجھ سے نہیں دیکھی جارہی ہے۔ ننگے انسان تو دیکھے جاسکتے ہیں لیکن ننگے مجسموں کو دیکھنے کی تاب نہیں ہے۔‘‘ غرض اس فیملی نے لگاتار آٹھ دنوں تک دہلی کے بازاروں میں کچھ ایسی بیدردی کے ساتھ شاپنگ کی کہ لوگوں کو دہلی پر نادر شاہ کا حملہ یاد آگیا۔ بے شک نادر شاہ نے لوٹ مار کے ذریعے دہلی کے ساتھ جو سلوک کیا تھا وہ اس فیملی نے شاپنگ کے ذریعے انجام دیا تھا مگر یہ فرق تو بہر حال رہتا ہی ہے کہ لوٹ مار میں آدمی تھوڑا بہت شرماتا بھی ہے جب کہ شاپنگ کے معاملہ میں آدمی کو شرمانے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ شہروں کو لوٹ مار کے مقابلہ میں شاپنگ سے زیادہ نقصانات پہنچتے ہیں۔ اس فیملی کو دہلی سے گئے ہوئے دو ہفتہ بیت گئے ہیں لیکن دہلی کے بازاروں میں اشیاء کی قلت کی وجہ سے ان کے دام اب تک معمول پر نہیں آئے ہیں۔ اُن کی شاپنگ کے آخری دنوں میں تو یہ حال ہوگیا تھا کہ یہ فیملی دہلی کے جس کسی بازار میں نکل جاتی دکاندار اپنی دکانیں بند کرکے بھاگنے لگتے تھے۔ دہلی کے ایک تاجر سے ہماری دوستی ہے۔ اسے جب پتہ چلا کہ ہم اس حیدرآبادی فیملی کو جانتے ہیں تو ایک دن وہ ہمارے پاس یہ درخواست کرتا ہوا آیا کہ حضور نادر شاہ نے جب دہلی میں لوٹ مار اور قتلِ عام کا حکم دیا تھا تو آصف جاہ اوّل نے جاکر نادر شاہ سے منت سماجت کرکے اس قتلِ عام کو رکوایا تھا۔ ہماری گزارش ہے کہ آپ ہماری خاطر آصف جاہ اوّل بن جائیں اور دہلی میں اس فیملی کی ’’شاپنگ‘‘ کو رکوائیں۔ ہم نے دست بستہ معذرت کی کہ یہ کوئی ایسا ویسا قتلِ عام نہیں ہے جو ہمارے یا آصف جاہ اوّل کے کہنے سے رُک جائے۔ اس فیملی کی ’’قوتِ خرید‘‘ ختم ہوجائے گی تو یہ قتلِ عام خود بخود رک جائے گا۔

پھر یوں ہوا کہ ایک دن صدر خاندان نے ہم سے کہا کہ دہلی کے سارے شاپنگ سینٹروں سے ہم، اور ہم سے شاپنگ سینٹرس فیض یاب ہوچکے ہیں۔ کوئی اور شاپنگ سینٹر بچا ہو

تو بتایئے۔'' ہم نے اُن سے کہا'' چانکیہ پلیس چلے جائیں۔ یہاں اکثر بیرونی سیاح شاپنگ کے لئے آتے ہیں۔'' ہمارے مشورہ پر وہ چانکیہ پلیس گئے تو سہی لیکن دوپہر میں ملے تو سخت ناراض تھے۔ کہنے لگے'' کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اپنی ہی بنائی ہوئی چیزیں خریدنے کے لئے دہلی آیا ہوں۔؟''

ہم نے کہا'' ہمیں آپ کی بات کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا۔'' بولے'' چانکیہ پلیس میں تو چمڑے کی مصنوعات فروخت ہوتی ہے اور آپ کو شاید پتہ نہیں کہ میرا چمڑے کا کاروبار ہے۔ وہاں تو میری ہی بنائی ہوئی چیزیں قطب مینار کی قامت والے داموں میں فروخت ہو رہی ہیں۔ اب وہ وقت آگیا ہے جب ہمیں دہلی میں شاپنگ سے دستبردار ہونا پڑے گا۔'' اور اس تاریخی واقعہ کے چند گھنٹوں بعد یہ فیملی حیدرآباد کے لئے روانہ ہوگئی۔ جاتے وقت اُن کے سازوسامان میں تختِ طاؤس تو خیر نہیں تھا لیکن اتنی ہی مالیت کی چیزیں ضرور تھیں۔

(آخرکار۔ ۱۹۹۷)

ایک مختلف دن

کہتے ہیں ایک صاحب سیر کے ارادہ سے دہلی آئے اور ایک فائیو اسٹار ہوٹل میں مقیم ہوئے۔ سیر پر نکلنے سے پہلے انہوں نے سوچا کہ ہوٹل میں ملنے والے کھانے کے اوقات کے بارے میں پہلے سے پوچھ لیا جائے تا کہ اسی حساب سے دہلی کی سیر کا پروگرام بنایا جائے۔ چنانچہ انہوں نے ہوٹل کے بیرے کو بلا کر پوچھا ''میاں! یہ بتاؤ تمہارے پاس کھانے کے کیا اوقات ہیں؟'' بیرے نے کہا ''حضور ناشتہ کا وقت تو صبح میں سات بجے سے گیارہ بجے تک، لنچ بارہ بجے سے تین بجے تک، شام کا ناشتہ شام میں چار بجے سے سات بجے تک اور رات کے کھانے کا وقت آٹھ بجے سے بارہ بجے تک ہوتا ہے۔'' اس پر یہ صاحب گہری سوچ میں ڈوب گئے اور بولے ''میاں! یہ تو نہایت ناموزوں اور نامعقول اوقات ہیں۔ اگر میرا سارا وقت کھانے میں ہی گزر جائے تو پھر میں دہلی کی سیر کب کروں گا؟''

اگر چہ یہ بڑا پرانا لطیفہ ہے لیکن پچھلے دنوں ہمارے دوست اوتار سنگھ جج نے کسی اور سلسلہ میں یہ لطیفہ پھر سنایا تو ہمیں اچانک محسوس ہوا کہ ہمارے دن کا بہت سا حصہ ایسے ہی فضول کاموں میں خرچ ہو جاتا ہے اور سیر کا پروگرام معلّق رہ جاتا ہے۔ دہلی میں رہتے ہوئے ہمیں پچیس برس ہونے کو آئے ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں گزرا جسے ہم نے ایسے ہی فضول کاموں میں ضائع نہ کیا ہو۔ ہمارے معمولات پہلے سے طے ہوتے ہیں۔ فلاں بجے سے فلاں بجے تک سیر کرو۔ پھر فلاں بجے سے فلاں بجے تک شیو، غسل اور ناشتہ سے فارغ

ہو جاؤ۔ پھر اخبار لے کر بیٹھ جاؤ کہ دیکھیں ملک کے سیاستداں کیا کر رہے ہیں اور کون سا لیڈر کون سی پارٹی میں جا رہا ہے۔ کتنے لیڈروں نے آج پیشگی ضمانت لے لی۔ کتنے نئے گھپلے منظرِ عام پر آئے ہیں اور کتنے لیڈر پرانے گھپلوں سے باعزت بری ہو گئے ہیں۔ یہی دیکھئے کہ جب حوالہ کیس شروع ہوا تھا تو ہم نہایت اشتیاق سے اخبار پڑھا کرتے تھے۔ حالات ایسے پیدا ہوتے جا رہے تھے کہ لگتا تھا حوالہ اور حوالات میں بہت کم فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔ لیکن اب پتہ چلا کہ حوالہ کیس کے سارے ملزمین بری ہو گئے۔ ہمیں افسوس ہو رہا ہے کہ ملک کے اخبارات نے منوں اور ٹنوں کاغذ اس کیس کی خبروں کو چھاپنے میں ضائع کر دیا۔ خود ہماری زندگی کی کئی قیمتی ساعتیں، جنہیں خوشگوار بھی بنایا جا سکتا تھا، اس کیس کی گتھیوں کو سمجھنے میں ضائع ہو گئیں۔ افسوس تو یہ ہے کہ ان دنوں اخباروں میں پڑھنے کو ہوتا بھی کیا ہے۔ سیاسی لیڈروں کے گھپلوں کی خبروں سے جب آپ فارغ ہوتے ہیں تو زنا بالجبر، اغوا، ڈکیتی، قتل و غارت گری کی خبریں آپ کی منتظر ہوتی ہیں۔ خدا بھلا کرے ہماری اہلیہ کا جن سے ہمارے ہزار ہا اختلافات سہی لیکن اُن کی ایک بات کے ہم قائل ہیں۔ جب بھی ہم صبح کے وقت بے چینی سے اخبار کا انتظار کرتے ہیں تو ہمیں یہ کہہ کر ٹوکتی ہیں۔ ''بُری اور منحوس خبروں کو پڑھنے کے لئے تمہاری یہ بے چینی کچھ سمجھ میں نہیں آتی۔ لوگ جس طرح کسی خوشخبری کو سننے کے لئے بے چین رہتے ہیں تم اسی طرح بری خبریں جاننے کے لئے اتاولے ہو جاتے ہو۔ مجھے دیکھو کہ جب سے اخبار پڑھنا چھوڑ دیا ہے کس قدر مزے میں ہوں۔'' کبھی ہم غلطی سے اُن کے ہاتھ سے تازہ اخبار منگواتے ہیں تو بلا مبالغہ اخبار کو چمٹے سے پکڑ کر یوں لے آتی ہیں جیسے اخبار نہ ہوا مرا ہوا چوہا ہو۔ کبھی کبھی تو ناک پر رومال بھی رکھ لیتی ہیں۔ غرض بری خبریں پڑھنا اور بُری خبریں پڑھ کر اپنے آپ کو پھر سے بُری خبریں پڑھنے کے لئے تیار کرنا یہ ہمارا روز کا معمول ہے۔ لیکن پچھلے ہفتہ ہم نے ایک دن ایسا بھی گزارا جب ہم نے سارے معمولات کو بالائے طاق رکھ دیا۔ گویا لطیفہ کی روشنی میں کھانے میں اپنا وقت برباد نہیں کیا اور سیر کرتے رہے۔ ہم معمول کے مطابق ''چہل قدمی'' کرنے کو نکلے تو دیکھا کہ بونداباندی ہو رہی ہے۔ چنانچہ چہل قدمی کرنے نہیں گئے۔ یہ ہمارا اس دن کا پہلا معمول تھا جو ٹوٹ گیا۔ پھر نو بجے تک اخبار کا انتظار کرتے رہے۔ مگر وہ نہ آیا تو دوسرا معمول بھی ٹوٹ گیا۔ نو بجے کے بعد

دودھ والا گھنٹی بجاتا ہے۔ گھنٹی بجی اور ہم نے دروازہ کھول دیا تو دیکھا کہ دودھ والے کے بجائے ایک سیلز گرل کھڑی ہے۔ بولی ''ایک نیا صابن آیا ہے۔ میں اُسے بیچنے کے لئے نکلی ہوں، پانچ روپئے میں ایک ٹکیہ ہے۔ چار ٹکیاں لینے پر ایک ٹکیہ مفت بھی ملے گی۔ بہت اچھا صابن ہے۔ آپ اس سے نہائیں گے تو دن بھر فرحت کے احساس میں ڈوبے رہیں گے۔'' ہم نے کہا'' صابن کی مدد سے اپنے اندر فرحت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش میں اب تک پچاس صابنوں کے برانڈ بدل چکے ہیں۔ ہمیں کوئی ایسا صابن ہوتو بتاؤ جو بدن کے میل کو دور کرنے کے علاوہ روح کو بھی پاکیزہ بنادے۔ ہم تو اب اپنی روح اور اپنے من کو پاک و صاف رکھنا چاہتے ہیں۔'' بولی'' آپ بھی خوب آدمی ہیں۔ جس مقصد کے لئے ہمارے سادھوسنت برسوں جنگلوں اور صحراؤں کی خاک چھانتے پھرتے ہیں آپ وہ مقصد صرف پانچ روپیہ میں حاصل کرنا چاہتے ہیں۔'' ہم نے کہا'' بی بی! آج تو ہمارا سارا معمول ہی چوپٹ ہوتا جارہا ہے۔ اب تم سے بحث کرنے کا وقت بھی نہیں رہا۔ یہ لو بیس روپئے اور دے جاؤ صابن کی پانچ ٹکیاں۔'' وہ چلی گئی تو ہم نے سوچا کہ کیوں نہ آج کا دن ہی مختلف ڈھنگ سے گزارا جائے۔ ملک میں جو ہوتا ہے ہوتا رہے۔ سیاستدان چاہے کچھ بھی کریں۔ ادیبوں، فنکاروں اور صحافیوں سے بھی آج ہم نہیں ملیں گے۔ اس خیال کے آتے ہی ہم اپنے ایک ایسے دوست کے پاس چلے گئے جن سے پچھلے پندرہ برس سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ (فون پر البتہ ہر ہفتہ بات ہوجاتی ہے)۔ موصوف غیر شادی شدہ ہیں اور اکیلے رہتے ہیں۔ اُن کے آباواجداد نے اتنی جائداد چھوڑی ہے کہ اُنہیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ موسیقی کے دلدادہ ہیں۔ دن بھر موسیقی سنتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ تو فون پر بھی اپنے پسندیدہ گانے اور دُھنیں ہمیں سناتے رہتے ہیں۔ موسیقی میں یہ اور خود موسیقی اُن میں اتنا ڈوب چکی ہے کہ دونوں کا بچ کر باہر نکلنا دُشوار نظر آتا ہے۔ گویا ''فنافی الموسیقی'' ہیں۔ دُنیا سے اتنے بے خبر ہیں کہ چارلس دیگال کو اب تک فرانس کا صدر اور جمال عبدالناصر کو مصر کا صدر سمجھتے ہیں۔ پچھلے تیس پینتیس برسوں سے اخبار کو ہاتھ نہیں لگایا۔ کہتے ہیں اخبار پڑھنے میں جو وقت ضائع ہوتا ہے اس میں کیوں نہ میں روی شنکر کا ستار ہی سن لوں۔ بہرحال ہمارے دوست نے جاتے ہی ہمیں گلے سے لگایا۔ بولے'' آج میرا ارادہ چیکووسکی کی سمفنیاں سننے کا تھا۔ مگر تم آئے ہو تو

تمہاری خاطر آج کندن لال سہگل کو سن لیتے ہیں۔'' وہ بات چیت کم کرتے ہیں۔ البتہ موسیقی کی دھنوں کے حساب سے اُن کے چہرے کے اُتار چڑھاؤ اور حرکات وسکنات میں فرق آنے لگتا ہے۔ بعض دفعہ تو آنکھوں سے آنسو بھی رواں ہو جاتے ہیں اور کبھی کبھار ایک عجیب و غریب مسکراہٹ اُن کے سارے وجود میں پھیل جاتی ہے۔ دن میں گیارہ بجے سے شام کے پانچ بجے تک ہم کے یل سہگل کو گھول کر کانوں سے پی گئے۔ موسیقی ہمارے سارے وجود میں کچھ اس طرح سما گئی کہ ایک مرحلہ پر ہمارا اپنا ہاتھ غلطی سے خود اپنے ہی زانو پر ذرا زور سے پڑ گیا تو یوں لگا جیسے ہم نے کسی طبلہ پر تھاپ ماری ہو۔ ذرا سی گردن کھجائی تو محسوس ہوا جیسے ہم نے ستار کے تاروں کو چھیڑ دیا ہے۔ سہگل کے گانوں کے بیچ ہی ہمارے دوست کے نوکر نے کھانا کھلایا۔ کیا کھلایا یہ یاد نہیں رہا۔ سہگل کے گانے البتہ یاد ہیں اور اُن کی معرفت ہمیں اپنی زندگی کے وہ دن اور ان دنوں سے وابستہ وہ باتیں بھی یاد آئیں جو چالیس پینتالیس برس پہلے ہماری زندگی کا حصہ تھیں۔

جی ڈھونڈتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن

شام کے چھ بجے ہم نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو ہمارے دوست نے پوچھا ''کہاں جانا ہے؟'' ہم نے کہا ''آج سیتا رام کیسری جی کا نتیجہ آنے والا ہے، ذرا چل کر دیکھیں کہ کیا ہوا۔'' ہمارے دوست نے پوچھا ''کون سیتا رام کیسری؟ کیا کرتے ہیں وہ؟ تمہارے دوست ہیں کیا؟ کبھی لے آؤ انہیں بھی۔ کسی دن اُنہیں بھی موسیقی سناتے ہیں۔'' اور ہم نے دِل ہی دِل میں سوچا اے کاش کبھی سیتا رام کیسری جی بھی موسیقی سُن لیتے۔ ہمارے دوست نے اپنی گاڑی اور ڈرائیور کو ہمارے حوالہ کرتے ہوئے کہا ''ایک مہینہ سے میں کہیں باہر نہیں گیا۔ یہ ڈرائیور یونہی مفت میں تنخواہ لے رہا ہے۔ کم بخت گانے بھی ڈھنگ سے نہیں سنتا۔ تم اسے لے جاؤ۔ جب جی چاہے گاڑی واپس کر دینا'' ہم باہر نکلے تو آسمان پر گھن گھور گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ بادل گرج رہے تھے اور ہمارا جی چاہ رہا تھا کہ سہگل کے دیپک راگ کے جواب میں راگ ملہار گانے لگیں ''برسو رے گرج گرج کر برسو۔'' ڈرائیور نے پوچھا ''صاحب کہاں چلئے گا؟''۔ ہمارے ذہن میں کئی جگہوں کا خیال آیا۔ پریس کلب آف انڈیا، کناٹ پلیس کا کافی ہاؤس، بنگالی مارکیٹ (جہاں ہر شام ادیبوں اور فنکاروں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے) لیکن نہ جانے کیوں ہمارے منہ سے ''انڈیا انٹرنیشنل سنٹر'' کا نام نکل گیا جہاں اس

شام کو کب دری مرحوم کی یاد میں ''شام غزل'' کا پروگرام آراستہ کیا جارہا تھا۔ غزل کے اُبھرتے ہوئے فنکار سدیپ کا ذکر تو بہت سنا تھا لیکن کبھی اُسے گاتے ہوئے نہیں سنا تھا۔ یوں بھی ایک عرصہ سے غزل اور موسیقی کے سائے میں ہماری کوئی شام نہیں گزری تھی۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ ہے۔ ہم ایک نشست پر جا بیٹھے تو دیکھا کہ برابر والی نشست پر الیکشن کمشنر جی وی جی کرشنا مورتی بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم نے سوچا کرشنا مورتی جی بھی خوب آدمی ہیں، سیتارام کیسری جی کو الیکشن کے بکھیڑے میں پھنسا کر خود غزل گائیکی کا مزہ لینے کے لئے یہاں آ بیٹھے ہیں۔ شاید اس دن وہ بھی ایک مختلف دن گزارنا چاہتے تھے۔ اس محفل میں دہلی کی کریم Cream ہی نہیں آئی تھی بلکہ آئس کریم بھی موجود تھی۔ نوجوان فنکار سدیپ نے اپنی آواز کا جادو جگایا اور سماں باندھ دیا۔ ذوقؔ، مجازؔ اور فیضؔ کے بعد سدیپ نے مخدوم محی الدین کی غزل چھیڑ دی۔

پھر بُلا بھیجا ہے پھولوں نے گلستانوں سے

اس غزل نے ہم پر عجیب و غریب کیفیت طاری کردی کیوں کہ یہ وہ غزل تھی جسے کہنے کے فوری بعد مخدوم نے اسے ''سیاست'' کے دفتر میں سنایا تھا۔ اس کے ابتدائی سامعین میں ہم بھی شامل تھے۔ وہ دن، وہ ساعتیں، وہ حیدرآباد، وہ چہرے وہ سائے، وہ گلیاں اور وہ ماحول سب کچھ یاد آیا جو اس غزل کا پس منظر بنے تھے۔ ان لمحوں کی بازیافت نے ایک عجیب سی سرشاری ہم پر طاری کردی۔ بڑی دیر بعد ہم انڈیا انٹرنیشنل سینٹر سے باہر نکلے تو ہوا میں خنکی تھی اور ایک عجیب سی فرحت۔ ہر شے ہمیں ہلکی پھلکی اور تروتازہ نظر آئی۔ راستہ میں گاڑی جب سیتارام کیسری جی کے گھر کے سامنے سے گزری تو دیکھا کہ لوگوں کی بھیڑ ہے جو زندہ باد کے نعرے لگا رہی ہے۔ ڈرائیور نے کہا ''شاید سیتارام کیسری جی جیت گئے۔'' ہم نے پوچھا ''کون سیتارام کیسری؟۔'' اس پر ڈرائیور نے ہمیں پلٹ کر غور سے دیکھا۔ پھر اُس نے ہم سے کوئی بات نہیں کی۔ غرض وہ ایک مختلف دن تھا۔ اس دن ہماری روح بھی صاف و شفاف، پاکیزہ، اُجلی اور سُبک محسوس ہوئی۔ ہم نے سوچا کہیں یہ اس صابن سے نہانے کا اثر تو نہیں ہے جو سیلز گرل صبح میں ہمیں دے گئی تھی۔

(میرا کالم۔ ۱۹۹۹)

سکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل

آج سے دس برس پہلے جب ہماری عمر بائیس برس تھی تو ہماری رگوں میں جوانی کا خون بڑی تیزی سے دوڑا کرتا تھا اور بزرگوں کے کہنے کے مطابق یہی وہ عمر ہوتی ہے جب انسان سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوجایا کرتی ہیں۔ چونکہ ہم بھی انسان تھے بلکہ ہوسکتا ہے اب بھی انسان ہی ہوں اس لئے ہم سے بھی ایک غلطی سرزد ہوگئی تھی۔ مبادا یہ نہ سمجھئے کہ ہمارا اشارہ شادی کی طرف ہے کیوں کہ یہ غلطی تو بزرگوں کے بے حد اصرار پر ہم سے بہت پہلے ہی سرزد ہوگئی تھیں بلکہ اس کے بعد تو ہم سے مزید دو غلطیاں سرزد ہوگئیں تھیں جن میں سے ایک غلطی کی عمر دو سال اور دوسری غلطی کی عمر ایک سال تھی۔ ہم یہاں جس غلطی کا ذکر کررہے ہیں، اس کی عمر تو ہمیں آج تک نہیں معلوم ہوسکی۔ البتہ لوگوں نے بتایا تھا کہ اس کا نام ''سکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل'' ہے جو ہم نے محض جوانی کے جوش میں آکر آؤ دیکھا نہ تاؤ خرید لی تھی۔ جب اس موٹر سائیکل کو ہم نے خریدا تو اس کے مالک نے بتایا تھا کہ یہ سکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل ہے۔ اور بفضلِ تعالیٰ بڑی وفادار ہے۔

ہم نے پوچھا: ''موٹر سائیکل وفادار کس طرح ہوسکتی ہے؟'' وہ بولا ''اس کی وفاداری کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ میں اس سے نجات پانے کے لئے اب تک اسے کئی گم نام مقامات پر چھوڑ چکا ہوں لیکن یہ کسی نہ کسی طرح میرے گھر پر پہنچادی جاتی ہے۔ اسے وفاداری نہ کہوں تو پھر کیا کہوں۔'' اس پر ہم نے سوچا کہ انسان تو کجا اب کتوں میں بھی وہ روایتی وفاداری باقی نہیں رہی ہے۔ ایسے میں ایک وفادار موٹر سائیکل کو حاصل کرلیں تو

کیا بُرا ہے لہٰذا فوراً سودا طے پا گیا۔ جب یہ معاملہ طے پا گیا تو ہم نے موٹر سائیکل کے مالک سے خواہش کی کہ وہ موٹر سائیکل کو ہمارے حوالے کر دے۔ اس نے کہا ''موٹر سائیکل آپ کی ہے۔ آپ جب چاہیں رکشا منگوا کر اسے لے جا سکتے ہیں۔'' ہم نے پوچھا: ''رکشا منگوانے کی کیا ضرورت ہے؟''

وہ بولا ''اس وقت پوری موٹر سیکل میرے پاس نہیں ہے۔ آدھی موٹر سائیکل اب لے جائیے۔ بقیہ آدھی موٹر سیکل میں آپ کے گھر پر پہنچا دوں گا۔''

ہم حیران ہوئے تو ہمیں بتایا گیا کہ اس کے آدھے کل پُرزے ہمیشہ میکانک کے پاس رہتے ہیں۔

بالآخر جب ہم اس نصف موٹر سائیکل کو لے کر ایک میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے گھر پہنچے تو خوشی کے مارے ہمارا سانس پُھول رہا تھا۔ ہمارے رشتہ داروں اور احباب کو متنبہ کیا گیا کہ ہم ایک موٹر سائیکل کے مالک بن گئے ہیں اور لوگ جوق در جوق اس عجیب الخلقت موٹر سائیکل کو دیکھنے کے لئے آنے لگے۔

ایک صاحب نے اس موٹر سائیکل کو پہچاننے سے انکار کرتے ہوئے پوچھا ''آپ نے یہ لوہا کہاں سے خریدا ہے؟''

ہم نے کہا ''یہ لوہا نہیں موٹر سائیکل ہے۔''

وہ بولے ''اس میں نہ تو موٹر سائیکل ہے اور نہ ہی سائیکل۔ مجھے تو صرف لوہا ہی لوہا نظر آ رہا ہے۔''

ہم نے اس لوہے میں سے موٹر سائیکل کے آثار اُنہیں بتلائے تو اُنہوں نے کسی قدر انجان بنتے ہوئے ہم سے پوچھا ''آثار و قرائن سے یہ تو ثابت ہو رہا ہے کہ یہ موٹر سائیکل ہے یا کبھی یہ موٹر سائیکل تھی لیکن آپ نے یہ نہیں بتایا کہ آپ نے کتنے روپے فی کلوگرام کے حساب سے یہ موٹر سائیکل خریدی ہے۔''

ہم نے اُن کی بے وقوفی پر ہنستے ہوئے کہا ''بھلا موٹر سائیکل بھی کہیں کلوگرام کے حساب سے بکتی ہے۔''

وہ بولے ''مگر آپ جس قسم کی موٹر سائیکل لے آئے ہیں اسے تو کلوگرام کے حساب

سے ہی بکنا چاہئے۔ بالکل اس طرح جیسے قصائی کی دُکان پر بکرے کا گوشت فروخت ہوتا ہے“

ہم نے ان صاحب کو جواب دینا ضروری نہ سمجھا کہ ہماری دانست میں وہ اس وقت حسد کی آگ میں جل رہے تھے۔

ایک اور صاحب نے ہماری موٹر سائیکل کو دیکھ کر کہا ”بھئی مجھے تو تعجب اس بات پر ہورہا ہے کہ پتھر کے زمانے میں بھی سائنس نے بڑی ترقی کرلی تھی اور تمہاری موٹر سائیکل اس دعویٰ کا مُردہ ثبوت ہے۔ تم یقین کرو کہ یہ موٹر سائیکل پتھر کے زمانہ کی غالباً واحد یادگار ہے۔ بڑی تاریخی چیز ہے۔ اسے جی جان سے محفوظ رکھنا۔“

غرض جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہماری موٹر سائیکل کے بارے میں کی گئیں اور ہم نے ان باتوں کے لئے اپنے کان یوں بند کرلئے جیسے خود ہماری موٹر سائیکل میں تیل چھوڑنے کے سُوراخ بند تھے۔

ہم پوری بے نیازی کے ساتھ اپنی موٹر سائیکل کو موٹر سائیکل بنانے میں مصروف ہوگئے وہ دن ہمیں اب بھی یاد آتے ہیں جب ہم اپنی موٹر سائیکل کی خاطر ساری دُنیا کے خلاف سینہ تان کر کھڑے ہوگئے تھے۔ جس دن یہ موٹر سائیکل ہمارے گھر میں آئی اس دن سے ہم میں اور ہماری بیوی میں دن رات کے جھگڑے شروع ہوگئے۔ ہماری بیوی نے اس موٹر سائیکل کے تعلق سے وہی رویہ اختیار کیا جو سوکنیں ایک دوسرے کے لئے اختیار کرتی ہیں۔ ہمیں طعنے دیئے جاتے ”اجی آپ کو اب میری فکر ہی کہاں ہے۔ آپ تو اپنی چہیتی موٹر سائیکل کے پیچھے حیران ہیں۔ اب آپ کا مجھ سے تعلق ہی کیا رہ گیا ہے۔ میں تو اس گھر کی صرف نوکرانی بن کر رہ گئی ہوں۔ کسی کو اتنی فرصت ہی کہاں ہے کہ وہ بھولے سے میرا حال احوال پوچھ لے۔ ہائے میری تو زندگی برباد ہوگئی۔ اگر مجھے پہلے ہی معلوم ہوتا کہ تم ایک سکنڈ ہینڈ موٹر سائیکل خریدنے والے ہو تو میں تم سے شادی ہی کیوں کرتی۔“ اور سچ پوچھئے تو ہمیں اپنی بیوی کو سمجھانے تک کی فرصت نہیں ملتی تھی کیوں کہ موٹر سائیکل کا کوئی نہ کوئی پارٹ ہمیشہ ہماری توجہ پر مسلط رہتا تھا۔ بیوی نے اسے سوکن سمجھا، بچوں نے اسے سوتیلا بھائی سمجھا، دوستوں نے اسے رقیب جانا، محلہ والوں نے سے اجنبی جانا اور ہم اکیلے اس مظلوم موٹر سائیکل کی حمایت میں مصروف رہے۔

بالآخر وہ دن بھی آ گیا جب ہماری موٹر سائیکل بن کر تیار ہوگئی اور ہم نے اعلان کر دیا کہ ہماری موٹر سائیکل بین الاقوامی یکجہتی کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ کیوں کہ اس کی باڈی میں دنیا بھر کی ساری موٹر سائیکل کمپنیوں کے پُرزے داخل کیے گئے تھے۔ پہلی بار جب ہم نے اس موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کیا تو اچانک اس میں سے ایسی آوازیں برآمد ہوئیں کہ تھوڑی دیر کے لئے سارا محلہ سنسان ہو گیا۔ سڑکوں پر سے لوگ بھاگ کھڑے ہوئے۔ ہم خود اس کیفیت پر حیران تھے کہ ہمارے پڑوسی نے کھڑکی میں سے جھانکتے ہوئے ڈرتے ڈرتے ہم سے پوچھا ''کیوں صاحب، خیریت تو ہے یہ آپ کے گھر سے فائرنگ کی آوازیں کس طرح آرہی ہیں؟''

ہم نے بڑے فخر کے ساتھ کہا ''جی کچھ نہیں، ہماری موٹر سائیکل اسٹارٹ ہو رہی ہے۔''

بعد میں محلے والے بھی اس فائرنگ کے عادی ہوگئے۔ مگر اس موٹر سائیکل پر بیٹھنا بڑی دلیری کا کام تھا۔ وہ جب اسٹارٹ ہوتی تو رُکنے کا نام نہ لیتی تھی اور جب رُکتی تھی تو اسٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیتی تھی۔ پہلی صورت یعنی اسٹارٹ ہونے کے بعد نہ رُکنے کی صورت میں ہم دیواروں اور فٹ پاتھوں کی مدد سے اسے قابو میں لایا کرتے تھے۔ لیکن جب یہ اسٹارٹ ہونے سے صاف انکار کر دیتی تھی تو ہم لوگوں سے یہ گزارش کرتے تھے کہ وہ اسے پیچھے کی طرف سے ڈھکیلیں۔ ایک بار ہم نے اپنے ایک دوست سے اس موٹر سائیکل کو ڈھکیلنے کی خواہش کی تھی۔ چنانچہ وہ اس موٹر سائیکل کو مسلسل ڈھکیلتا رہا، جب وہ بُری طرح نڈھال ہو گیا اور مزید ڈھکیلنے کی تاب اس میں نہ رہی تو اس نے پوچھا ''آخر میں کب تک اسے ڈھکیلتا رہوں۔'' اور ہم نے اپنی موٹر سائیکل کو بریک لگاتے ہوئے کہا ''اب آگے یہ زحمت نہ کرو کیوں کہ مجھے جس مقام پر پہنچنا تھا وہ آ گیا ہے۔ تھوڑی دیر سستا لو۔ ہم یہاں سے پھر واپس چلیں گے۔'' لیکن بسا اوقات موٹر سائیکل کو لوگوں کے ذریعہ دھکے دے کر اسٹارٹ کروانا بھی کچھ کم خطرناک نہیں ہوتا تھا۔ کیوں کہ اکثر اوقات جب لوگ اسے ڈھکیلتے ڈھکیلتے عاجز آ جاتے تو وہ جھنجھلا کر موٹر سائیکل کو ڈھکیلنے کی بجائے ہماری گردن میں ہاتھ دے کر ہمیں موٹر سائیکل سے آگے ڈھکیل دیتے تھے اور ہم اسٹارٹ ہو کر موٹر سائیکل سے کافی آگے نکل جاتے تھے۔ ہم لوگوں سے منت کرتے ''بھئی ہمیں نہ ڈھکیلو موٹر سائیکل کو ڈھکیلو، یہ کیا بدتمیزی

ہے۔'' اس پر ارشاد ہوتا '' ایسی موٹر سائیکل رکھنا بھی کچھ کم بدتمیزی نہیں ہے۔'' غرض اس موٹر سائیکل کو اسٹارٹ کرنے تک ہم آف ہو جایا کرتے تھے۔ جہاں تک اسے کِک مار کر اسٹارٹ کرنے کا سوال ہے ہم اسے ضرورت سے کچھ زیادہ ہی کِک مارا کرتے تھے کیوں کہ جب کِک مارتے مارتے بیزار ہو جاتے تو اس پر چاروں طرف سے لاتوں اور گھونسوں کی بھرمار شروع کر دیتے تھے اور اس وقت ہمارا غصہ انتہائی عروج پر پہنچ جاتا تھا۔

اس موٹر سائیکل سے زندگی میں صرف ایک بار ہمیں فائدہ پہنچا تھا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب یہ لگاتار ایک مہینہ تک بڑی پابندی سے چلتی رہی۔ اس کی آواز اتنی خطرناک ہوا کرتی تھی کہ اس کے گزر جانے کے بعد بڑی دیر تک کانوں میں جھینگروں کی آوازیں آیا کرتی تھیں۔ اُن دنوں ہم نائٹ ڈیوٹی کیا کرتے تھے اور جب رات کے پچھلے پہر اس موٹر سائیکل پر دندناتے ہوئے گزرتے تو کتے بھی خوفزدہ ہو کر اس پر بھونکنے سے انکار کر دیتے تھے۔ ہم لگاتار ایک مہینے تک اس موٹر سائیکل پر بیٹھ کر رات کے پچھلے پہر گھر واپس آتے رہے اور پھر ایک دن اچانک عید الفطر آ گئی۔ ہم عید کے دن نئے کپڑے پہن کر اپنے دیوان خانے میں بیٹھے تھے کہ محلّہ کے مختلف گھروں سے ہمارے گھر میں فطرے آنے لگے۔ کسی نے گیہوں بھیجا، کسی نے پیسے بھیجے، کسی نے کپڑے بھیجے۔ ہم حیران ہو گئے کہ کیا ماجرا ہے۔ ایک صاحب سے پوچھا کہ آخر یہ فطرے ہمارے گھر کیوں بھجوائے جا رہے ہیں۔ اس پر وہ بولے'' صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ آپ نے رمضان کے پورے مہینے میں اپنی موٹر سائیکل کے ذریعہ ہم روزہ داروں کو سحری کے لئے جگانے کا فریضہ انجام دیا ہے۔ فطرے کا اصل حق تو آپ ہی کو پہنچتا ہے۔ اس میں تکلّف نہ کیجئے۔ آپ کو اپنی محنت کی کمائی ملنی ہی چاہئے۔'' آپ اس کارِ ثواب کے عوض ضرور جنت میں جائیں گے مگر خدارا جنّت میں اس موٹر سائیکل پر بیٹھ کر نہ جائیے۔''

ہماری موٹر سائیکل پر اس گہرے طنز کو ہم برداشت نہ کر سکے۔ پھر بیوی نے ہمیں دھمکی دی کہ آج سے اس گھر میں یا تو وہ رہے گی یا پھر موٹر سائیکل رہے گی۔ اس دھمکی کے نتیجہ میں ہم اپنی موٹر سائیکل سے دست بردار ہو گئے اور اس کے بعد ہماری زندگی میں ایک ایسا سکون آ گیا جس میں دُور دُور تک موٹر سائیکل کی کوئی ہیبت ناک آواز نہ تھی۔

(قطع کلام۔۱۹۶۹)

لو آ گئی برسات

لیجئے جناب آ گئی برسات۔ لیکن ذرا ٹھہریئے۔ برسات کے آنے کی اطلاع ہم کیوں دیں؟۔ برسات تو اپنی آمد کا اعلان خود کر دیتی ہے۔ یہی تو وہ موسم ہوتا ہے جو اس شان سے آتا ہے کہ لگتا ہے کسی بادشاہ کی سواری آ رہی ہے۔ پہلے نقیب آوازیں لگائے گا۔ پھر توپوں کی سلامی ہوگی اور تب کہیں بادشاہ سلامت جلوہ گر ہوں گے۔ دوسرے ملکوں کی برسات کی بات ہم نہیں کرتے البتہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کی برسات کا ایک باضابطہ کردار ہوتا ہے۔ پہلے تو یہ کہ ہماری برسات بڑی دلیر اور بہادر ہوتی ہے کیوں کہ وہ دُشمن پر غفلت میں حملہ نہیں کرتی بلکہ اسے پہلے سے آگاہ کر دیتی ہے کہ لو ہم آ رہے ہیں، میدان چھوڑ کر بھاگ جاؤ۔ دوسرے یہ کہ ہماری برسات بڑی ذہین اور چالاک ہوتی ہے کیوں کہ یہ اسی وقت آتی ہے جب آپ گھر سے باہر ہوں اور جب آپ کے پاس چھتری بھی نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ہماری برسات کافی پڑھی لکھی بھی ہوتی ہے کیوں کہ یہ اخبار میں موسم کا حال پڑھتی ہے اور پھر تردیدی بیان کے طور پر برستی ہے۔ بھلا بتایئے ایسا باضابطہ کردار کون سے موسم کا ہوتا ہے۔ دوسرے موسموں کا یہ حال ہوتا ہے کہ چوری چھپے آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں۔ آپ یقین کریں کہ جب تک ہم اخبار سے درجہ حرارت معلوم نہیں کر لیتے تب تک نہ ہمیں سردی ہوتی ہے اور نہ ہی گرمی۔ ایسے موسموں کو لے کر کیا کیجئے گا۔ سچا موسم تو وہی ہوتا ہے جو آئے تو بس سارے ماحول پر چھا جائے۔ وہ اُمڈ اُمڈ کر اور گرج گرج کر برسنے والی بدلیاں اور وہ کڑک

کڑک کر چمکنے والی بجلیاں جب آتی ہیں تو سارے ماحول پر چھا جاتی ہیں۔

برسات کا موسم بڑی اُمیدوں والا موسم ہوتا ہے۔ جب ہم چھوٹے تھے اور کبھی رات کو گھن گرج کے ساتھ طوفانی برسات ہوتی تھی تو ہم ساری رات بستر میں پڑے پڑے اپنے دل میں اس امید کو پروان چڑھایا کرتے تھے کہ صبح جب ہم اسکول جائیں تو پتہ چلے کہ سارا اسکول طغیانی میں بہہ گیا ہے۔ اسکول کے ساتھ ساتھ سارے ٹیچر بھی اپنی چھڑیوں سمیت بہہ گئے ہیں اور ساری کتابیں بھی بہہ گئی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ جب ہم اُمیدوں والی یہ رات گذار کر اسکول پہنچتے تھے تو اسکول جوں کا توں کھڑا ہوتا تھا مگر اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ برسات ہمارے دل میں سینکڑوں اُمیدیں پیدا کر دیتی ہے۔ بچپن میں ہمیں اسکول کے گرنے کی اُمید ہوتی تھی۔ اب بڑے ہوگئے ہیں تو یہی برسات ہمارے دل میں کئی معصوم اور خفیہ اُمیدیں پیدا کر دیتی ہے۔ ہمارے دل پر ہی کیا موقوف ہے۔ برسات کی آمد سے پہلے خود دھرتی کے سینہ میں بھی بڑی اُمیدیں چھپی ہوتی ہیں جو بعد میں لاکھوں ننھے منے ہرے بھرے پودوں کی شکل میں دھرتی کے سینہ سے اُبل پڑتی ہیں۔

برسات کے موسم کی ایک خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس سے بچنے کے لئے آدمی ہر ممکن کوشش کرتا ہے لیکن پھر بھی اس کوشش میں ہار جاتا ہے۔ سڑک پر جس کسی کو دیکھئے وہ نہ صرف رین کوٹ میں بند ہوتا ہے بلکہ ایک عدد چھتری بھی اپنے ساتھ رکھتا ہے لیکن پھر بھی بھیگ جاتا ہے۔ سڑک کی بات چھوڑیئے اس معاملہ میں ہماری بدقسمتی ملاحظہ فرمایئے کہ ہم گھر میں بھی رین کوٹ پہنے رہتے ہیں اور اس پر سے چھتری بھی تان لیتے ہیں۔ لیکن پھر بھی بھیگ جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ اس لئے کہ ہمارے گھر کی چھت، بارش میں اس قدر ٹپکتی ہے کہ لگتا ہے ہمارے گھر کی کوئی چھت ہی نہیں ہے۔ اب ہم اس کی شکایت مالک مکان سے کرتے ہیں تو وہ کہتا ہے بھائی صاحب! یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی کہ گھر کی چھت کے نیچے آپ رین کوٹ پہنے رہتے ہیں اور پھر چھتری بھی تان لیتے ہیں لیکن اس کے باوجود میرے مکان کی چھت ٹپکتی ہے۔ ضرور اس میں آپ کے رین کوٹ اور چھتری دونوں کی چھتوں کا کوئی قصور ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی چھتری اور رین کوٹ دونوں ٹپکتے ہیں۔ ایسے میں میرے مکان کو دوش دینے سے کیا حاصل۔ ہم کہتے ہیں ”پہلے آپ اپنے مکان کی چھت تو ٹھیک کروایئے“

اس پر وہ کہتا ہے ''اجی حضرت! پہلے آپ اپنی چھتری کی چھت تو ٹھیک کروائیے۔ شیشہ کے محل میں رہنے والوں کو دوسروں پر پتھر پھینکنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔'' اخلاقیات کا اتنا بڑا درس دینے کے بعد وہ چپ چاپ چلا جاتا ہے اور حیرت سے ہماری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔

برسات کے موسم کی ایک اور خوبی یہ ہوتی ہے کہ اس میں آدمی دوسرے آدمی کو پہچان نہیں پاتا کیوں کہ سارے ہی لوگ رین کوٹوں، ٹوپیوں اور چھتریوں کے نیچے چھپ جاتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا کہ ہم مالک مکان سے اپنے گھر کی چھت کی شکایت کرنے اُن کے گھر پہنچے اور وہ ہماری نظروں کے سامنے رین کوٹ میں چھپ کر گھر سے باہر نکل کر چلے گئے اور بعد میں اُن کی بیوی نے بتایا ''ابھی جو صاحب آپ کے سامنے سے رین کوٹ اوڑھ کر گذرے وہ آپ کے مالک مکان ہی تو تھے'' اس کا بدلہ ہم نے اکثر یوں لیا کہ جب مالک مکان ہم سے کرایہ مانگنے کے لئے گھر آتے ہیں تو ہم بھی رین کوٹ اوڑھ کر اُن کی نگاہوں کے سامنے سے فاتحانہ گذر جاتے ہیں۔ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دیا جائے نہ سہی لیکن اینٹ کا جواب اینٹ سے دینے میں کیا قباحت ہے؟

برسات کے موسم کی اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ اس میں نئے نئے سماجی تعلقات اور آپ کے نئے نئے دوست پیدا ہوتے ہیں۔ فرض کیجئے آپ برسات میں اپنی چھتری کھولے سڑک پر چلے جارہے ہیں کہ اچانک ایک صاحب آپ کے ساتھ ساتھ چلنے لگیں گے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آپ سے بہت قریب آجائیں گے۔ اور کچھ دیر بعد وہ آپ کی چھتری میں داخل ہوکر بالکل ایسٹ انڈیا کمپنی بن جائیں گے۔ اب آپ سے کیا چھپائیں کہ ایک بار ہم نے ایک شخص کو اسی طرح اپنی چھتری کے نیچے پناہ دی تھی۔ آدمی صورت سے نہ صرف شریف لگتا تھا بلکہ وضع قطع سے یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس نے ہماری چھتری کے نیچے آکر ہماری چھتری کو عزت بخشی ہے۔ اسی لئے ہم کافی آؤٹ آف دی وے جاکر اسے گھر تک چھوڑ آئے۔ اتفاق سے دُوسرے دن ہماری ملازمت کا انٹرویو تھا۔ انٹرویو میں پہنچے تو دیکھا کہ وہی شخص ڈائرکٹر کی کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس نے ہم سے کوئی سوال نہیں پوچھا۔ صرف یہ کہا ''تم جاسکتے ہو۔ تمہارا انتخاب ہو چکا ہے۔'' ہم جانتے ہیں کہ اس ملازمت کے لئے جو کوالیفکیشن مانگی گئی تھی ہم اس پر پورے نہیں اُترتے تھے۔ ہمارے پاس ایک ہی کوالیفکیشن تھی اور وہ تھی

ہماری چھتری۔ مگر صاحب اس چھتری کا کوئی بھروسہ نہیں کہ یہ کب کیا کر جائے۔ ایک طرف تو اس چھتری نے ہمیں ملازمت دلائی تھی مگر دوسری طرف اس چھتری نے ہمارے ساتھ جو سلوک کیا ہے اس کا ذکر کرتے ہیں تو کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ اصل قصہ یہ ہے کہ ہم نے اپنی موجودہ بیوی کو، جو گذشتہ پندرہ برسوں سے ہمارے ساتھ موجود ہے، ایک چھتری کے توسط سے پکڑا تھا۔ یعنی پندرہ برس پہلے کی ایک طوفانی برسات میں ایک خوبصورت لڑکی ہماری چھتری کے نیچے آ گئی تھی۔ تھوڑی دور تک وہ چپ چاپ ہمارے ساتھ چلتی رہی۔ پھر جب اچانک بجلی کڑکی تو وہ ڈر کے مارے ہم سے لپٹ گئی۔ اگرچہ ہم بجلی کے کڑکنے سے کبھی نہیں گھبراتے لیکن نہ جانے کیوں ہم بھی اس دن بجلی سے ڈر کر اس سے لپٹ گئے۔ چاہے کچھ بھی ہو دو دلوں کے ملنے کے لئے برسات کا موسم موزوں ترین ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فلموں میں ہیرو اور ہیروئن کی ملاقات اکثر برسات میں ہی کرائی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ بعد میں اس ملاقات کا انجام اچھا نہیں نکلتا۔

برسات کا موسم آتے ہی سڑکوں پر جا بجا چھتریاں ہی چھتریاں نظر آنے لگتی ہیں۔ انواع واقسام کی چھتریاں۔ مردوں کی چھتریاں الگ ہوتی ہیں اور خواتین کی الگ۔ اگرچہ اب مردوں اور عورتوں کے لباس کا فرق مٹتا جا رہا ہے۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ چھتریوں کے معاملہ میں ابھی جنس اتنی مشکوک نہیں ہوئی ہے۔ خواتین کی چھتریوں کی خوبی یہ ہوتی ہے کہ یہ بہت چھوٹی ہوتی ہیں۔ اُن کی مدد سے خواتین صرف اپنے سر اور چہرے کے میک اپ کو بھیگنے سے بچا سکتی ہیں۔ البتہ جسم کے بقیہ حصے بارش میں بھیگتے رہتے ہیں۔ یہ چھوٹ غالباً اس لئے دی جاتی ہے کہ بھیگی ہوئی عورت چہرے کے اچھے میک اپ کے ساتھ بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ برسات کے موسم کی ایک اور خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ ان دنوں کیچڑ کی بالکل قلت نہیں ہوتی۔ کیچڑ آپ کو جا بجا مل جائے گی۔ کیچڑ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس پر سے پھسلنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ اتنا مزہ کہ بعض اوقات نہ صرف آپ کی ہڈی ٹوٹ جاتی ہے بلکہ چار پانچ سو روپیوں کا سوٹ بھی غارت ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ بڑے اعلیٰ اور نفیس سوٹ پہن کر کیچڑ پر سے پھسلتے ہیں اور گھر جا کر آئینہ میں اپنی صورت دیکھتے ہیں۔ ہم نے بڑے بڑے شہسواروں کو کیچڑ پر سے پھسلتے دیکھا ہے۔ اگر آپ بدقسمتی سے کیچڑ پر سے نہ پھسلیں تو آپ کو اپنی بدقسمتی پر اتنا افسوس بھی نہیں کرنا چاہیے کیوں کہ کیچڑ کی مساویانہ تقسیم کی خاطر ہنری فورڈ

نے آج سے کئی برس پہلے موٹر ایجاد کر لی تھی۔ جو بد قسمت حضرات کیچڑ پر سے پھسل کر اپنے کپڑے خراب نہیں کر پاتے ان کے کپڑوں پر اب موٹریں کیچڑ اُچھالتی پھرتی ہیں کہ لو بھئی اُداس کیوں ہوتے ہو۔ یہ لو کیچڑ، اور پھر شڑاپ کے ساتھ آپ کا روم روم کیچڑ میں لت پت ہو جاتا ہے۔ ہم جیسے خاک نشینوں کے حق میں ان موٹر نشینوں کی دین بڑی غنیمت ہے۔ اگر یہ کیچڑ نہ اُچھالیں تو بتائیے ہم جیسے شرفاء کا کیا ہو گا؟

(آخر کار۔ ۱۹۹۷)

علّامہ نارسا کی

وفات مسرت آیات پر

جب عین عالم ضعیفی میں علامہ نارسا کا انتقال ہوا تو اُن کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح سارے شہر میں پھیل گئی اور فائر بریگیڈ کا عملہ صرف مُنہ دیکھتا رہ گیا۔ علامہ نارسا کے بال بہت بڑے تھے اسی لئے وہ اُردو کے ''چوٹی'' کے شاعر سمجھے جاتے تھے اور لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ بعض لوگوں نے اُنہیں ناک اور پیشانی پر بھی بٹھانے کی کوشش کی مگر مرحوم کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ یہ سراسر اُن کی کسرنفسی تھی۔ علامہ ہر اعتبار سے علامہ تھے جیسے بنیا ہر اعتبار سے بنیا ہوتا ہے۔ مرحوم میں کئی خوبیاں تھیں جنہیں اُنگلیوں پر گنا جاسکتا ہے اور یہیں آکر قدرت کی ستم ظریفی کو کوسنے کو جی چاہتا ہے کہ اس نے بلاوجہ انسان کو دس اُنگلیاں دے رکھی ہیں کیوں کہ علامہ کی خوبیوں کو گننے کے لئے دو چار اُنگلیاں ہی کافی ہوسکتی تھیں۔ یہ قدرت کی فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے۔

علامہ کی سب سے بڑی خوبی جو دراصل ایک خرابی تھی وہ یہ تھی کہ وہ شاعری کرتے تھے لیکن مرحوم کی قوتِ ارادی کی داد دینی چاہئے کہ اُنہوں نے مرتے دم تک شاعری کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور نزع کے عالم میں بھی تیمارداروں کو اپنی ایک نامکمل غزل کا مقطع سُنا کر مر گئے۔ حق جہنم رسید کرے عجب بور مرد تھا۔ اے علامہ کی

فرض شناسی نہ کہیں تو اور کیا کہیں کہ اُنہوں نے اپنی ایک غزل بھی نامکمل نہ چھوڑی۔ علامہ نے ۸۰ برس کی عمر پائی اور اُنہوں نے ۸ ہزار غزلیں کہیں جن پر ۸ لاکھ افراد نے ہوٹنگ کی۔ مگر مرحوم ایسے حوصلہ مند، نڈر اور جری انسان واقع ہوئے تھے کہ اگر ۸ کروڑ افراد نے بھی ہوٹنگ کی ہوتی تو وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ بات دراصل یہ تھی علامہ بڑے ظریف الطبع واقع ہوئے تھے اور ہر سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال جاتے تھے۔ مثلاً ایک مشاعرے میں جب سامعین نے اُن پر انڈے پھینکے تو اُنہوں نے سارے انڈے ہاتھوں میں جھیل لئے اور گھر جاکر اُن انڈوں کی پڈنگ پکوائی، پھر جب دُوسری بار مشاعرے میں شرکت کرنے گئے اور لوگوں نے اُن پر انڈے نہ پھینکے تو علامہ بپھر گئے اور سامعین سے شکایت کرنے لگے:

''حضرات! اگر آپ لوگوں نے انڈے نہیں پھینکے تو میں غزل نہیں سناؤں گا۔''

اس پر منتظمین مشاعرہ نے فوراً بازار سے انڈے منگوائے اور جب دو چار انڈے پھینکے گئے تو علامہ نے غزل کا سلسلہ شروع کیا جو صبح تک جاری رہا۔ اس کے بعد علامہ نے ایک معمول سا بنالیا کہ جب بھی کسی مشاعرہ میں جاتے تو لوگوں سے کہتے کہ آج مجھ پر آلو پھینکے جائیں کیوں کہ آج آلو کھانے کو جی چاہ رہا ہے۔ ایک بار تو اُنہوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ'' آج مجھ پر ایک پلیٹ بریانی، ایک پیالی چائے اور سگریٹ کی ڈبیہ پھینکی جائے۔''

علامہ نے بڑی خوددار طبیعت پائی تھی۔ چنانچہ اُنہیں زندگی بھر اپنے کلام کے سوائے کسی شاعر کا کلام پسند نہ آیا۔ حد تو یہ ہے کہ اُنہوں نے محض اپنی خودداری کو نبھائے رکھنے کے لئے کسی شاعر کا کلام بھی نہیں پڑھا اور اپنے سوائے کسی اور کے کلام پر داد نہیں دی۔ خودداری کی ایسی مثال ان دنوں مشکل ہی سے ملے گی۔ علامہ نے اسّی برس کی عمر میں چار شادیاں کیں اور اپنی شاعری کے جملہ چار مجموعے شائع کروائے جن میں سے ایک ایک مجموعہ کو اُنہوں نے اپنی چار بیوی کے نام معنون کیا (خدا کا شکر ہے کہ مرحوم نے پانچ شادیاں نہیں کیں ورنہ پانچ مجموعے منظرِ عام پر آجاتے)۔

پہلے مجموعہ کا انتسابی نوٹ اُنہوں نے یوں لکھا تھا:

''میں اپنے پہلے مجموعۂ کلام کو بصد نفرت وحقارت اپنی پہلی بیوی کے نام معنون کرتا ہوں۔''

دوسرے مجموعے کے دیباچہ میں اُنہوں نے لکھا تھا:

''میرے دوسرے مجموعۂ کلام کے منظرِ عام پر آنے کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ میری دوسری بیوی کو عرصہ سے شکایت تھی کہ میں نے اپنا مجموعۂ کلام صرف پہلی بیوی کے نام کیوں معنون کیا ہے، اس کے نام کیوں معنون نہیں کیا۔ اس مسئلہ پر میری دونوں بیویوں میں لڑائی جھگڑا جاری رہتا تھا جس سے میں تنگ آچکا تھا۔ سو میں اپنے گھریلو حالات کو پُرامن بنانے کے لئے دُوسرا مجموعۂ کلام شائع کررہا ہوں۔ اب اگر ضمنی طور پر اس مجموعہ کی اشاعت سے ادب کی خدمت ہوتی ہے تو میں اس کے لئے معافی کا خواستگار ہوں۔''

ان کے تیسرے اور چوتھے مجموعۂ کلام کی اشاعت کے پیچھے بھی علامہ کی ازدواجی زندگی پوشیدہ تھی جو لوگوں کو بہت کم نظر آتی تھی۔ علامہ ریاضی میں بہت کمزور تھے۔ چنانچہ اُنہیں پچیّس تک گنتی آتی تھی اور وہ بھی اس لئے آتی تھی کہ علامہ کی پچیّس اولادیں تھیں۔ ریاضی سے اُن کی واقفیت محض ایک مجبوری تھی۔ عمر کے آخری حصے میں علامہ کی بینائی اس حد تک خراب ہوچکی تھی کہ ایک بار جب اُن کے بڑے لڑکے نے سڑک پر اُنہیں سلام کیا تو اُنہوں نے اپنے ہی بیٹے کو سلام کا جواب دینے کے بعد اس سے پوچھا:

''کہو میاں! تمہارے والد کی صحت کیسی ہے؟''

اور سعادت مند بیٹا اُن کے استفسار کے جواب میں بولا:

''کیا عرض کروں ان دنوں والد بزرگوار کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ بینائی بہت خراب ہوچکی ہے، یہاں تک کہ ہم لوگوں کو بھی نہیں پہچان پاتے۔''

اس پر علاّمہ نے کہا:

''آپ بینائی کی خرابی کی باتیں کرتے ہیں۔ اگر بینائی اچھی بھی ہو تب بھی میں اپنے بچوں کو نہیں پہچان سکتا۔'' پھر بولے ''میاں! ایسے سعادت مند والدین اس دنیا میں کہاں باقی ہیں جو اپنی اولاد کو پہچان سکیں۔''

علامہ کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ اُنہیں اپنا کلام سُنانے کا عارضہ لاحق تھا۔ اگر کوئی نئی غزل ہوتی (جو اتفاق سے ہر روز ہو جایا کرتی تھی) تو سارے محلّے کو سُنانے کے لئے نکل کھڑے ہوتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جب علامہ گھر سے نکلتے تو سڑکوں پر بھگدڑ مچ جاتی اور لوگ گلیوں میں بھاگ جاتے، دوکاندار اپنی دکانیں بند کر دیتے اور مائیں اپنے بچّوں کو اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیتیں۔ غرض دیکھتے ہی دیکھتے سڑک ویران ہو جایا کرتی تھی۔ مگر علامہ کا یہ عارضہ اکثر اوقات ملک اور قوم کے لئے بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا۔ مثلاً ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مقامی کالج کے طلباء نے ہڑتال کی اور جلوس نکالا۔ ایک مقام پر جلوس مشتعل ہو گیا اور پولیس پر سنگ باری کرنے لگا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا مگر جلوس پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ جب صورتِ حال بہت نازک ہو گئی تو سب انسپکٹر پولیس کے ذہن میں اچانک ایک ترکیب آئی۔ وہ سیدھا علامہ کے گھر گیا اور اُنہیں اپنے ساتھ لے آیا۔ ادھر طلباء کی سنگ باری بدستور جاری تھی کہ اچانک مائیکروفون پر اعلان ہوا:

''خواتین و حضرات! اب آپ علامہ نارسا سے اُن کی تازہ غزل سماعت فرمایئے:'' مائیکروفون پر یہ اعلان ہونا تھا کہ طلباء اپنے سر پر پاؤں اور پاؤں پر سر رکھ کر بھاگنے لگے اور ابھی علامہ نے اپنی غزل کا مطلع ہی سُنایا تھا کہ مطلع صاف ہو گیا۔ طلباء تو طلباء، پولیس کی ساری جمیعت بشمول سب انسپکٹر پولیس مقامِ حادثہ سے غائب تھی۔

علامہ کے کشف و کرامات کی یہ ایک معمولی سی مثال ہے۔ مگر بعض اوقات سُنانے کے اس مرض نے علامہ کو کافی ذلیل و خوار بھی کرایا۔ مثلاً ایک بار علامہ نے اپنی غزل سُنانے کے لئے ایک راہ چلتے شخص کا اغوا کیا اور اسے ایک ہوٹل میں لے گئے اور چائے کے ساتھ لگاتار دو گھنٹوں تک اُسے اپنا کلام پلاتے رہے اور وہ بھی لگاتار دو گھنٹوں تک مختلف اشیائے خورد و نوش کھاتا رہا۔ جب علامہ کی طبیعت سنبھلی تو شخصِ مذکور سے

اپنے کلام کے بارے میں رائے پوچھی۔ اس پر وہ شخص اپنے کان پر ہاتھ رکھتے ہوئے چلّا کر بولا:

"قبلہ! اگر آپ مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتے ہوں تو براہِ کرم اس کاغذ پر لکھ دیجئے کیوں کہ میں پیدائشی بہرہ ہوں اور کوئی بات سننے کی اہلیت نہیں رکھتا۔"

لوگوں کا بیان ہے کہ یہ واحد شخص تھا جسے علاّمہ کی ذات سے فائدہ پہنچا تھا، کیوں کہ اور لوگوں کو وہ اپنی غزل سُنائے بغیر کچھ کھلاتے پلاتے نہیں تھے۔ حد تو یہ کہ کسی فقیر کو ایک پیسہ بھی خیرات میں دیتے تو اسے اپنا ایک شعر ضرور سُنا دیتے۔ اس عادت کا نتیجہ یہ نکلا کہ علاّمہ کے گھر پر آج تک کسی فقیر کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا گیا۔

علاّمہ کو شاعری کے میدان میں قدم جمانے کے لئے کئی دُشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ابتدا میں جب اُن کے ہر شعر پر ہوٹنگ کرنے کو لوگ اپنا فرضِ اوّلین سمجھتے تھے تو اُنہوں نے اپنے کلام کو مقبول بنانے کے لئے بعض فقیروں کی خدمات حاصل کیں۔ اُنہیں اپنا کلام رٹایا اور سڑکوں پر بھیک مانگنے کے لئے چھوڑ دیا۔ جہاں وہ علاّمہ کی غزلیں گا گا کر بھیک مانگتے مگر اُنہیں دن بھر میں ایک پیسے کی خیرات بھی نہیں ملتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علاّمہ کا کلام تو عوام میں مقبول ہو گیا مگر بے چارے فقیروں کا بزنس تباہ و تاراج ہو گیا۔ جب فقیروں نے بھی علاّمہ کا کلام گانے سے انکار کر دیا تو اُنہیں ایک نئی ترکیب سوجھی۔ یعنی اب کی بار انہوں نے ایک کاتب کی خدمات حاصل کیں اور اپنی ساری پسندیدہ غزلیں شہر کی دیواروں پر لکھوا دیں جب اُن کا سارا کلام شہر کی دیواروں پر "زیورِ طبع" سے آراستہ ہو گیا اور لوگ سفیدی کراتے کراتے عاجز آ گئے تو شہریوں کے ایک وفد نے علاّمہ سے ملاقات کی اور اُن سے "صلح" کر لی کہ وہ اُنہیں مشاعروں میں مدعو کیا کریں گے (تاریخ میں اس صلح کو "صلح نامہ شاعر و سامعین" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) اس کے بعد سے علامہ ہر مشاعرہ میں جانے لگے اور مشاعروں کو لُوٹ کر اپنے گھر لے جانے لگے۔ یہاں تک کہ اُن کے گھر میں مشاعروں کا انبار لگ گیا۔ علاّمہ کے کلام کی واحد خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ترنّم کے سوائے کچھ بھی نہیں ہوتا تھا۔ اگر اُن کے کلام میں سے

ترنم کو نکال دیا جائے تو کلام میں تخلص کے سوائے کچھ بھی باقی نہیں بچ جاتا تھا۔

علاّمہ نے زندگی بھر میں ایک شعر بھی ایسا نہیں کہا جو بحر سے خارج نہ ہو۔ ہر مصرعہ دُوسرے مصرعہ سے یا تو چھوٹا ہوتا تھا یا بڑا۔ اور جب لوگ اُن سے شکایت کرتے کہ غزل کے سارے مصرعے بحر سے خارج ہیں تو وہ اس کے جواب میں یہ دلیل پیش کرتے کہ:

> ''میاں! جب انسان کے ایک ہاتھ کی پانچوں اُنگلیاں برابر نہیں ہوتیں تو ایک غزل کے دس مصرعے کس طرح برابر ہو سکتے ہیں۔ قدرت کی تخلیق خود بحر سے خارج ہے، خُدا نے سب کو یکساں پیدا نہیں کیا ہے۔''

علاّمہ کے کلام سُنانے کا انداز بھی بڑا انوکھا اور اچھوتا تھا۔ وہ کلام کیا سناتے تھے، اچھا خاصا ڈرامہ پیش کرتے تھے۔ شعر میں اگر معشوق کی انگڑائی کا تذکرہ ہوتا تو اسٹیج پر ایسی بھرپور انگڑائی لیتے کہ مائیکروفون سمیت چار پانچ شعراء کو اپنی انگڑائی کی زد میں لے لیتے۔

ایک مشاعرہ کا ذکر ہے کہ علامہ نے ایک شعر میں گریباں کے چاک ہونے کا سماں باندھا تھا۔ اس شعر کو پڑھتے ہوئے اُنہوں نے اداکاری کے وہ جوہر دکھائے کہ آن کی آن میں قمیض کا گریبان چاک کرلیا۔ پھر جب مشاعرہ ختم ہوا تو منتظمین کے پیچھے پڑ گئے کہ اُنہیں مشاعرہ کے مقررہ معاوضہ کے علاوہ قمیض کی قیمت بھی ادا کی جائے۔ منتظمین نے لاکھ سمجھایا کہ علامہ آپ کا قمیض تو پُرانا تھا، ہم آپ کو نئے قمیض کی قیمت کس طرح ادا کر سکتے ہیں؟ مگر علاّمہ نہ مانے اور بالآخر منتظمین کو نئے قمیض کی قیمت ادا کرنی پڑی۔

اس کے بعد علاّمہ نے ایک معمول سا بنالیا کہ جس کسی مشاعرہ میں جاتے وہاں گریباں چاک والی غزل سُناتے اور پُرانے کے بدلے نیا قمیض لے کر آتے۔ مگر رفتہ رفتہ منتظمین بھی ہوشیار ہو گئے۔ چنانچہ ایک مشاعرہ میں جب کلام سنانے کے لئے پہنچے تو اُنہوں نے زبردستی علاّمہ کا قمیض اُتار لیا اور احتیاطاً اُنہیں پاجامے سے بھی محروم کردیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علاّمہ کو صرف لنگوٹ پہن کر مائیکروفون پر کلام سُنانا پڑا۔

مگر افسوس کہ علاّمہ کے کلام سنانے کا یہی انداز بالآخر اُن کی موت کا سبب بنا اور وہ شاعری کی راہ میں شہید ہو گئے۔ ہوا یوں کہ ایک شعر میں ''قتل'' کا تذکرہ تھا۔ چنانچہ علاّمہ نے قتل کا سماں باندھنے کے لئے اپنی جیب سے اُسترا نکالا اور آن کی آن میں اُسے اپنے گلے پر پھیر لیا۔ علاّمہ کی نعش اسٹیج پر تڑپنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے علاّمہ کی رُوح ''قفسِ عنصری'' کا تالا توڑ کر پرواز کر گئی۔

اب علامہ ہم میں نہیں رہے جس پر جتنی مسرت کا اظہار کیا جائے کم ہے۔ زندگی بھر علاّمہ کو بہتیرا سمجھایا گیا کہ علاّمہ ایسے مہلک اشعار نہ کہیے جن سے آپ کی جان کے لالے پڑ جائیں مگر وہ نہ مانے اور گذشتہ پیر کو شاعری کے میدان میں شعر پڑھتے پڑھتے شہید ہو گئے۔

علاّمہ کی کس کس بات کا ذکر کیا جائے اور اُن کی موت پر کتنے قہقہے لگائے جائیں۔ غرض علاّمہ کے انتقال سے ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا ہے جسے پُر کرنا کسی کے بس کی بات نہیں۔ کیوں کہ علاّمہ بہت موٹے تھے اور اتنا بڑا خلاء تین چار شعراء سے بھی پُر نہیں کیا جا سکتا۔ خدا مرحوم کی رُوح کے ساتھ قرار واقعی سلوک کرے اور اُن کے پس ماندگان کو بے صبری عطا کرے۔ ع

خدا بخشے بہت سی خامیاں تھیں مرنے والے میں

(تکلّف برطرف۔ ۱۹۶۸)

"مجتبیٰ حسین اس دور کے ممتاز مزاح نگاروں میں سے ہیں۔ وہ طنز نگار نہیں مزاح نگار ہیں۔ طنز نگار کا، بقول رشید احمد صدیقی، عام طور پر کوئی "کوبڑ" ہوتا ہے مگر مزاح نگار کسی ایک کوبڑ کے بجائے کئی سے کام لیتا ہے۔ وہ طنز نگار کی طرح ایک "مجاہد" نہیں ہوتا جو کسی میلان، روش یا شخصیت کے خلاف جہاد کرتا ہے بلکہ وہ زندگی کی ناہمواریوں، اس کے عجائبات اور شخصیتوں کے تضاد کا مذاق اُڑا کر زندگی کے لطف و انبساط میں اضافہ کرتا ہے۔ یوں تو مزاح نگار بھی کبھی کبھار طنز سے کام لیتا ہے مگر طنز اس کا مقصد نہیں ہوتا۔ طنز نگار کے ہاں بھی مزاح ہوتا ہے مگر اُس کی برہمی اور بیزاری کا کوئی مخصوص ہدف ہوتا ہے۔ غالب کے خطوط میں مزاح نگار کی ساری عظمت نظر آتی ہے۔ اکبر کے ہاں طنز نگار اپنے سارے جاہ و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

مشتاق احمد یوسفی نے مجتبیٰ حسین کی تین خوبیاں بیان کی ہیں۔ ایک یہ کہ قلم برداشتہ لکھتے ہیں۔ دوسرے اُن کے یہاں تکرار کا عمل نہیں ہے اور تیسرے اُن کی تحریروں میں تروتازگی برقرار ہے۔ ہمارے دور کے سب سے بڑے مزاح نگار اور طنز نگار کا مجتبیٰ حسین کو یہ خراجِ تحسین قابلِ ذکر ہے۔

مجتبیٰ دراصل WIT کے مردِ میداں یعنی بذلہ سنجی اور ذکاوت کا پیکر ہیں۔ WIT صرف لفظی ظرافت نہیں۔ لفظ سے ظرافت تو اس میں پیدا کی جاتی ہے مگر ذہن کی کارفرمائی بھی ضروری ہے۔ جدید تنقید میں WIT کو اس کی ہمہ گیری کی وجہ سے پہلے سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ میرے نزدیک WIT مزاح کا ایک موثر آلہ ہے اور اس کی مثالیں مجتبیٰ حسین کے ہاں جابجا ملتی ہیں۔

(پروفیسر آل احمد سرور)

مجتبیٰ حسین خاصے "جہاں دیدہ" ہیں۔ انہوں نے محاورۃً دُنیا کو خوب اچھی طرح برتا ہے اور عملاً دُنیا کے کئی ملکوں کو دیکھا ہے۔ اس لئے اُن کے تجربات و مشاہدات میں تنوع بھی ہے اور وسعت بھی۔ انہوں نے طنز کی گہرائی اپنے بڑے بھائی ابراہیم جلیس سے اور اسلوب کی چاشنی اپنے بڑے بھائی کے جگری دوست ابنِ انشا سے لی ہے۔ مزاح میں وہ کسی کے مقلد نہیں۔ اس سلسلے میں اُن کی طباعی اپنی مثال آپ ہے۔ وہ بنیادی طور پر افسانہ گو ہیں۔ اُن کے بیشتر بلکہ تمام مضامین افسانوی نوعیت کے ہیں جن میں وہ دلچسپ واقعات اپنے دلچسپ ترین اسلوب میں بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔ درمیان میں اس قسم کے معنی خیز اور فکر انگیز جملے کثرت سے آتے رہتے ہیں: "اب ادیب کا قلم کان پر نہیں رکھا جاتا۔ اسے ادیب یا تو اپنی جیب میں رکھتا ہے یا قلم سمیت ادیب کو حکومت اپنی جیب میں رکھ لیتی ہے۔ پہلی صورت میں قلم محفوظ رہتا ہے اور دوسری صورت میں ادیب۔"

مضامین ہوں یا خاکے یا سفرنامے، اُن کا بنیادی وصف مجتبیٰ حسین کا اندازِ بیان ہے۔ وہ ایک ایسی بے تکلفانہ فضا تخلیق کرتے ہیں کہ قاری مسحور ہو جاتا ہے اور اس کیفیت سے اسی وقت آزادی حاصل کرتا ہے جب مضمون ختم ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو جی چاہتا ہے کہ کاش مجتبیٰ حسین مضمون کو ختم نہ کرتے اور اپنی بات جاری رکھتے۔

(مشفق خواجہ۔ کراچی)

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (India)
Phones: 3216162, 3214465 Fax: 91-011-3211540
E-mail: eph@onebox.com

ISBN 81-87667-23-0